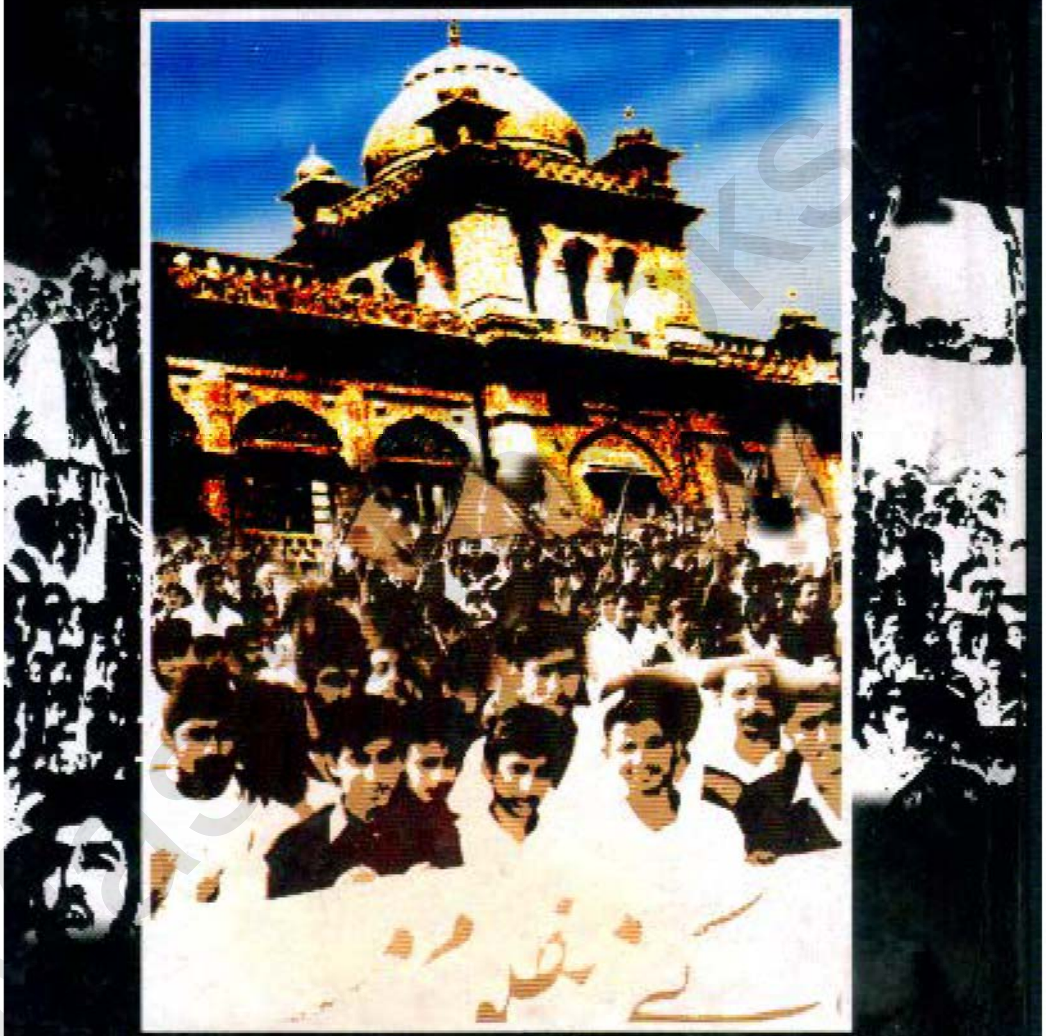
پاکستان میں طلباء تحریک

پروفیسر عزیز الدین احمد



مشعل

پاکستان میں طلباء تحریک

پروفیسر عزیز الدین احمد

مشعل
آر۔ بی 5 ، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

پاکستان میں طلباء تحریک

پروفیسر عزیز الدین احمد

ناشر: مشعل
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk

فہرست

پیش لفظ

ہوا میں دیئے جلانے والے

طالب علم تحریک کی بات چلتی ہے تو ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کتنے ہی نام یاد آ جاتے ہیں۔ جنہوں نے اس صدی میں ظلم کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں اپنی جان ہار دی یا کال کوٹھڑیوں میں پابند سلاسل کر دیئے گئے۔ وہ جس کا نام بھگت سنگھ تھا اور جو پنجاب میں بدیسی حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑتا پھانسی کے پھندے پر جھول گیا:۔ برازیل کا طالب علم رہنما ایڈسن لوئیس سوتو(Edson luis soto) جس کی شہادت پر مہینوں مظاہرے ہوتے رہے اور مظاہرین گلی گلی پولیس سے دست بدست جنگ لڑتے رہتے۔ یوروگوائے کی آمریت مخالف طلبہ تحریک کا لیبر آرسے(Liber Arce) جس کے جنازے میں لاکھوں افراد شریک ہوئے۔ شاعروں کی نظموں سے کتنے ہی گم نام چہرے ابھرتے ہیں: ''ہوا میں کس نے لہو کی پھوار چھوڑی تھی۔ یہ کون تھا جو ہوا میں دیئے جلاتا تھا۔'' ''یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھم چھم، اے ارضِ عجم، ؟''وہ جو اصحاب طبل و علم کے دروں پر کتاب اور قلم کا تقاضا لئے ہاتھ پھیلائے پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے۔'' ''بچوں پہ چلی گولی، ماں دیکھ کے یہ بولی، یہ دل کے مرے ٹکڑے، یوں روئیں مرے ہوتے، میں دور کھڑی دیکھوں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' اور''رات کی اس تاریکی میں، علم کی مشعل ہاتھ میں لے کر کون آیا؟ کون ہے جس نے اندھیاروں سے یہ اجلی گستاخی کی؟''

کتنے نعرے ہیں جو دیر ہوئی فضا میں تحلیل ہو گئے مگر طالب علم تحریک کا تذکرہ ہو تو فوراً ذہن میں ان کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے گزرے لمحے

واپس آ گئے ہوں، امریکیو ایشیا سے نکل جاؤ''، ''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو۔'' ''چو لیے چو لیے، شنگرام چو لیے''۔ ''جالو جالو آ گن جالو''۔'' سامراج کا قبرستان، پاکستان پاکستان''۔''مانگ رہا ہے ہر انسان، روٹی کپڑا اور مکان''۔

کتنے فرعون صفت آمر تھے جن کی مطلق العنان حکمرانی کو نہ صرف طلبہ نے چیلنج کیا بلکہ بسا اوقات ان کا تختہ الٹانے میں طلبہ ہی آگے آگے تھے۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان، آریہ مہر شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی، پریذیڈنٹ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر فرڈیننڈ مارکوس اور جنرل سوہارتو یہ سب وہ اصحاب طبل وعلم تھے جنہوں نے اپنی دانست میں تاحیات حکمرانی کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

اگر 1960ء کی دہائی سے تھوڑی دیر کے لئے صرف نظر کر لیں تو یہ حقیقت آشکار ہو گی کہ طالب علم تحریک فی الحقیقت تیسری دنیا کی تحریک ہے۔ اس کی وجہ تلاش کرنا کوئی اتنا دشوار بھی نہیں۔ بیسویں صدی میں ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے محکوم ملکوں نے یورپی ممالک کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لئے بے مثال جدوجہد کی۔ ان میں سے بعض ایسے ملک بھی تھے جو پرانی طرز کی غلامی سے نجات پاتے ہی نئی طرز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لئے گئے۔ یہ جدید طرز کا نو آبادیاتی نظام تھا جس میں عوام پر ایسے فوجی حکمران، بادشاہ اور آمر ٹھونس دیئے گئے جو غیر ملکی آقاؤں کے مفادات کے نگران تھے، ان کی مدد سے اپنے لوگوں کی جمہوری آزادیوں کو سلب کرتے تھے اور اپنے ملک کے تمام تر وسائل کو اپنی ذات اور سامراجی آقاؤں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں برپا ہونے والی کوئی بھی ایسی قوم پرست، انقلابی یا جمہوری جدوجہد نہیں ہے جس میں طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت نہیں کی۔ انڈونیشیا میں ایک قومیت کے تصور اور اس کے لئے ایک قومی زبان کی بات شعور طالب علموں ہی کے ایک گروپ سے شروع ہوئی تھی۔ اسی نے آخر کار قومی آزادی کی جنگ کی شکل اختیار کی جس کے نتیجہ میں انڈونیشیا آزادی سے ہمکنار ہوا جدید چین کو تخلیق کرنے والوں میں ان طلبہ کا بھی حصہ تھا جنہوں نے مغربی ممالک میں ہونے والی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان ہی میں چواین لائی اور ڈینگ شیاؤ پنگ شامل تھے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں برصغیر کی

طلبہ تحریک بھی ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس تحریک نے کانگریس، مسلم لیگ اور کیمونسٹ پارٹی سبھی کو کارکنوں کی کھیپ مہیا کی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی برصغیر کے تینوں ملکوں کے طلبہ مختلف حوالوں سے متحرک رہے۔

مختصر غلامی پرانی طرز کی تھی یا نئی قسم کی اس کے خلاف لڑنے والوں میں پیش پیش تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اس لشکر حریت کا سب سے پرجوش اور جنگجو دستہ طلبہ پر مشتمل تھا جن کے خون میں حرارت تھی اور دماغ میں آئیڈیل ازم کی برقی رو۔ عمر رسیدہ داناؤں کے برعکس جو فوائد اور نقصانات کا تقابل کرتے کرتے بے عملی کی دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں تیسری دنیا کے نوجوان طلبہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے آرزومند تھے۔ عشق میں مبتلا شخص کی طرح وہ بے صبر تھے۔ نتائج سے بے پروا تھے اور کسی ناصح مشفق کی بات پر دھیان دینے کے لئے تیار بھی نہ تھے۔

طلبہ میں موجود آئیڈیل ازم کو دو طرح کی قوتوں نے استعمال کیا۔ ایک وہ جو انسانی سماج کو آگے کی طرف لے جانا چاہتی تھیں اور اسے ارتقا کی اگلی منزل سے آشنا کرنے کی خواہاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو سماج کا تعلق ماضی کی پسماندگی سے برقرار رکھنے کی خواہشمند تھے۔ اور اس لئے گردش ایام کو پیچھے کی طرف موڑنے کی آرزو رکھتے تھے۔ باالفاظ دیگر طالب علم تحریک پر صرف ان قوتوں ہی کی اجارہ داری نہ تھی جو سماجی ارتقا کی خواہاں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طلبہ کیمونیسٹی ہمیشہ بائیں بازو اور دائیں بازو میں بٹی رہی ہے۔ یہاں بادصبا کے فرحت بخش جھونکے بھی چلے ہیں اور بادسموم کے ایسے جھکڑ بھی جو صحرا میں قافلوں کے لئے بیماری اور موت کا پیغام لاتے ہیں۔ طالب علم تحریک پر بسا اوقات ایسی قوتیں بھی حاوی ہو جاتی رہی ہیں جنہوں نے آمروں کے ہاتھ مضبوط کئے، طلبہ میں مذہبی اور لسانی تنگ نظری کو فروغ دیا، عورتوں اور اقلیتوں کے بارے میں تعصّبات پھیلائے اور طلبہ کو تشدد کی راہ پر ڈالا۔ اس کی بہت واضح مثالیں پاکستان میں ملیں گی جہاں طلبہ تحریک میں دونوں رجحانات نمایاں طور پر موجود رہے ہیں۔ کبھی ایک حاوی ہو جاتا رہا ہے کبھی دوسرا۔

پاکستان میں ان طلبہ نے جو بائیں بازو کے نظریات رکھتے تھے ہر دور میں اپنی

توانائیاں آمریت کے بت کو پاش پاش کرنے میں صرف کیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خان ہو، جنرل یحییٰ خان ہو یا جنرل ضیاء الحق ساتھ ساتھ آنا چاہیے۔ ان سب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں بائیں بازو کی طلبہ تنظیمیں آگے آگے تھیں۔ جبکہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے گروپ یا تو آمروں کے ساتھ مکمل تعاون کرتے تھے (جیسا کہ یحییٰ اور ضیا ادوار میں ہوا) یا اس جنگ میں دلچسپی نہ رکھتے تھے یا نیم دلی سے حصہ لیتے تھے (جیسا کہ ایوب دور میں ہوا)۔ بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے پاکستان کی مظلوم قومیتوں کے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا جب کہ دائیں بازو والے مضبوط مرکز اور واحد مسلم قومیت کے تصورات کے ذریعے مظلوم قومیتوں کے حقوق غصب کرنے والوں کی حمایت کرتے تھے۔ بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے سوسائٹی کے محروم طبقات کا ساتھ دیا، عورتوں کی آزادی کی بات کی اور مذہبی اقلیتوں کو برابر کے شہری حقوق دینے کا مطالبہ کیا۔ سیکولرازم کا پرچار کیا۔ عالمی امن کی حمایت کی فوجی معاہدوں سے پاکستان کی علیحدگی کی مانگ کی۔ وہ سامراجی لوٹ کھسوٹ اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لئے لڑے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اس پروگرام کے لئے زور دار پراپیگنڈہ کیا، مظاہرے کئے، جیلیں بھریں اور جان کی قربانی دی۔

بائیں بازو کے پروگرام کے بہت سے نکات کو اب قبول عام حاصل ہو چکا ہے۔ آج آمریت، مضبوط مرکز، جاگیرداری نظام اور سامراج کی کھلے عام حمایت کرنے کے لئے بہت کم لوگ تیار ہوں گے۔ عورتوں اور مذہبی اقلیتوں کے لئے برابری کے حقوق نیز سیکولر نظام حکومت کی تائید کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فوج پر اخراجات کم کرنے کا مطالبہ بھی اب کسی سخت ردعمل کو جنم نہیں دیتا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد کئی دہائیوں تک ان مطالبات کی پرزور حمایت صرف ایک ہی قوت کرتی تھی یعنی بایاں بازو۔ اور صورت حال جوں توں رکھنے کے حامی لوگ بائیں بازو کے حامیوں کو اسلام دشمن، علیحدگی پسند اور غیرملکی ایجنٹ کہہ کر مطعون کرتے تھے۔ اس طرح کے خیالات کے پرچار پر مقدمے درج کئے جاتے تھے اور ایسے لٹریچر پر پابندی عائد کی جاتی تھی۔

بائیں بازو کے ایجنڈے کے بیشتر نکات نے تو قبول عام حاصل کر لیا لیکن بائیں

بازو کی طلبہ تنظیمیں ایک خاص نقطہ عروج تک پہنچنے کے بعد انحطاط کا شکار ہوئیں۔ طلبہ میں بائیں بازو کی کمزوری ایک ایسی حقیقت ہے جس کی نوعیت ہر چند کہ عارضی ہے لیکن اس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ یہ صورتحال عارضی اس لئے ہے کہ تاریخ کا آگے کے سفر کو وقتی طور پر روکا جا سکتا ہے مگر مستقلاً نہیں۔ اس میں رکاوٹ ڈالنے کی جو قیمت سوسائٹی کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہ اتنی زیادہ ہے کہ کوئی سوسائٹی بھی اس کی دیر تک متحمل نہیں ہوسکتی۔ پاکستان کو اگر افغانستان کی شکل اختیار نہیں کرنا تو یہاں عورتوں نیز مذہبی اور قومیتی اقلیتوں کو مکمل برابری کے حقوق دینا پڑیں گے۔ صوبوں کے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے مطالبے کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسلام کے نام پر ان مطالبات کی مخالفت کرنے اور اس میں کامیاب بھی ہو جانا کا زمانہ گزر چکا ہے۔ دائیں بازو کی انتہائی پسند طلبہ تنظیموں کے پروگرام کی مقبولیت ماضی کی بات بن چکی ہے۔

وہ خارجی قوتیں بھی جو سرد جنگ کے دوران انتہا پسند مذہبی تنظیموں کے لگائے ہوئے پودوں کی سیاسی، اخلاقی اور مالی امداد کے ذریعے آبیاری کرتی تھیں اب خود ان سے نالاں ہیں۔ سوشلسٹ نظام کے حامیوں سے نپٹنے کے لئے بڑے سرمایہ دار ممالک بالخصوص امریکہ نے جن متعصب، تنگ نظر اور جنگجو عناصر کی بھرپور پشت پناہی کی تھی اب وہ خود ہی انہیں بنیاد پرست قرار دے کر ان کی سرکوبی کے خواہاں ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ اور اس کی قبیل کی دیگر دائیں بازو کی طلبہ تنظیمیں تعلیمی اداروں میں معصوم قسم کی موسیقی کی محفلوں پر کلاشنکوف کے زور سے پابندیاں عائد کرتی تھیں۔ لیکن میڈیا ٹیکنالوجی میں وقوع پذیر ہونے والی نت نئی ترقی کے بعد یہ کسی کے لئے ممکن نہیں رہا کہ وہ ٹی وی کے دسیوں چینلز سے ہونے والی ثقافتی یلغار کے آگے دیوار چین کھڑی کر سکے۔ دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کی نام نہاد فحاشی اور عریانی کے خلاف مہم اب بے بسی کے ساتھ دانت کچکچانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

تاہم بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کے از سر نو مقبول ہونے کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ وہ ماضی کی کمزوریوں پر قابو پانے کی کس قدر اہلیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کمزوریوں کا تعلق ان کے داخلی امور سے بھی تھا اور بعض ایسے حالات سے بھی جو ان کے قابو سے باہر

تھے۔ داخلی امور میں جو چیزیں شامل تھیں ان میں گروہ بندی اور ٹوٹ پھوٹ کا متواتر عمل کمزوری کا باعث بنا۔ یہ گروہ بندی نظریاتی اختلافات کی بنا پر بھی پیدا ہوئی۔ قیادتی جھگڑوں اور ذاتی تنازعات نے بھی اسے وادی۔ بعض اوقات یہ سارے عوامل ایسے گڈ مڈ بھی ہو گئے کہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اصل مسئلہ کون سا ہے۔ اس کی ایک مثال این ایس ایف میں تقسیم ہے جس نے اس کی قوت کو منتشر کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ پہلے یہ روس اور چین نواز دھڑوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر اس کا زیادہ فعال حصہ جو چین نواز کہلاتا تھا مزید گروہ بندی کا شکار ہوا۔ یہ مسئلہ این ایس ایف تک محدود نہ تھا۔ بائیں بازو کی دوسری طلبہ تنظیموں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ دراصل یہ صورتحال خود بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور گروپوں میں موجود گروہ بندی کا عکس تھی۔ ان میں سے کوئی بھی سیاسی پارٹی یا گروہ اس طرح کی عوامی قبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا جس سے طلبہ کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت میں میں اتنا اضافہ ہوتا کہ وہ اسے منصف قرار دے کر اپنے مناقشات حل کرنے میں اس کی مدد لیتے۔ وہ لوگ بھی جو پوری دیانتداری کے ساتھ نظریاتی جھگڑوں میں شریک ہو کر دوسروں سے علیحدہ ہوئے اپنے آپ کو مضبوط کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ناکامی کی مکمل ذمہ داری ان کی کوتاہ اندیشی پر ڈالنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ بہت سے ایسے امور بھی اس کا موجب بنے جن پر ان کا قابو نہ تھا۔ ان میں وسائل کی کمی بھی تھی، حکومتی ایجنسیوں کی دخل اندازی بھی اور ریاستی تشدد بھی۔

بائیں بازو کو اگر پھر سے طلبہ تحریک میں ایک قوت کے طور پر ابھرنا ہے تو اسے اور بھی کئی غلطیوں کا ازالہ کرنا پڑے گا۔ ہر اس سماج میں جہاں مذہبی رجحانات مضبوط ہوں عقیدہ پرستی کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ یہ عقیدہ پرستی ان لوگوں کی تحریک میں بھی در آئی تھی جو سائنٹیفک نظریات کے حامل ہونے کے دعویدار تھے۔ اپنی صورتحال کو سمجھ کر اس میں سے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی بجائے باہر سے پرچہ حل کروانے کی رسم نہ پہلے کامیابی سے ہمکنار کر سکی تھی نہ اب کر سکے گی۔ حافظ شیرازی نے کہا تھا جب باد فتنہ ساری دنیا کو تہ و بالا کر دے گی تو میں رہ انتظار دوست میں چراغ چشم جلا کر انتظار کروں گا۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کی آنکھیں نہ صرف کھلی ہوں بلکہ ہر دم رہ دوست پر جمی ہوئی ہوں۔

لیکن جب لوگ سورج کی روشنی میں بھی اپنی آنکھوں کا استعمال کرنا بند کر دیں تو بادفتنہ کے پھیلائے ہوئے اندھیرے میں ان سے کیسے کام لے سکیں گے۔

طلبہ تنظیموں اور سیاسی جماعتوں میں گہرا تعلق رہا ہے۔ سیاسی جماعتیں خواہ وہ دائیں بازو کی ہوں یا بائیں بازو کی طلبہ میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ بہت سی پارٹیوں نے طلبہ میں اپنے فرنٹ قائم کئے یا پہلے سے موجود تنظیموں کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کی۔ کمیونسٹ پارٹی نے ڈی ایس ایف کے قیام میں حصہ لیا۔ جماعت اسلامی نے اسلامی جمعیت طلبہ تخلیق کی۔ این ایس ایف کو نیپ نے تخلیق تو نہیں کیا تاہم نیپ کے مختلف دھڑوں نے اس کے اندر اپنے اثرات پیدا کئے اور پھر نیپ اور کمیونسٹ گروپوں کی دھڑے بندی این ایس ایف میں بھی منعکس ہونے لگی۔ سیاسی پارٹیوں کی طلبہ میں دلچسپی کا مقصد اس مضبوط پریشر گروپ کی مدد حاصل کرنا اور اپنے لئے تعلیم یافتہ سیاسی لیڈر پیدا کرتا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے 1968ء میں ایوب آمریت کے خلاف یکدم جس شدید ردعمل کا اظہار کیا اس کے لئے سیاسی پارٹی تیار نہ تھی۔ یہاں عوام کو قیادت فراہم کرنے کا فریضہ سیاسی جماعتوں کی بجائے طالب علموں نے سنبھالا۔ تھکی ہاری سیاسی جماعتوں نے طلبہ سے نیا خون بھی حاصل کیا جس کی انہیں بہت ضرورت تھی اور ان کے ذریعے اپنے پروگرام کو بھی پھیلایا۔ سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی نے جو گیارہ نکاتی پروگرام جاری کیا اس میں عوامی لیگ کے چھ نکات اور بھاشانی نیپ کے کئی مطالبات شامل تھے۔ خود مغربی پاکستان میں حالات کچھ مختلف نہ تھے۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو نے نہ صرف 7 نومبر کو راولپنڈی میں ہونے والی طلبہ پر فائرنگ کو خاص طور پر موضوع تنقید بنایا بلکہ اپنے پروگرام میں بھی طلبہ کے مسائل کے حل کا وعدہ کیا اور پارٹی میں بھی طلبہ کو خاص اہمیت دی۔ جماعت اسلامی نے بھی مختلف موقعوں پر اسلامی جمعیت طلبہ کو اپنا پروگرام آگے بڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اگر مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والی سیاسی شخصیتوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کئی ایک کا تعلق طالب علم تحریک سے رہا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ جس طلبہ تنظیم نے ان کی ساخت پرداخت میں حصہ لیا تھا وہ اسی کی سرپرست سیاسی جماعت میں گئے ہوں۔ ایسے بھی ہوا کہ یعقوب کی آنکھوں کے نور نے چشم زلیخا کو روشن کیا اور ماہ کنعان

اپنے مادر وطن فلسطین کو چھوڑ کر مصر پہنچ گیا۔

کسی بھی طالب علم تحریک کے کارکنوں کا فعالیت کا دور مختصر عرصے پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے بعد تحریک یا تو اپنے مقاصد حاصل کر لیتی ہے یا ناکام ہو کر پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں پھر سے روز مرہ کی سرگرمی شروع ہو جاتی ہے۔ طالب علم کارکن ہو یا لیڈر اس کی تحریکی زندگی بھی زمانہ طالب علمی تک محدود ہوتی ہے جو بالعموم چار پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس دور کے خاتمے کے بعد انہیں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اب کیا کریں گے۔ طلبہ تحریک کے فعال کارکنوں میں سے صرف گنے چنے لوگ ہی مستقل طور پر میدان سیاست کا انتخاب کرتے ہیں۔ باقی اپنی زندگی کا بیشتر وقت معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے میں صرف کرتے ہیں۔ یہ صورت حال دائیں بازو اور بائیں بازو دونوں میں یکساں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ بہر حال اپنے زمانہ طالب علمی کے آئیڈیلز پر آخر تک شدومد سے قائم رہتے ہیں، کچھ عملی زندگی میں مگن ہونے کے باوجود ان مقاصد کے بارے میں آخر تک نرم گوشہ رکھتے ہیں اور کئی زندگی کی دوڑ میں ان سے بالکل مختلف مقاصد کی تکمیل میں مگن ہو جاتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ طلبہ کی تحریکی زندگی کا حصہ بہت مختصر ہوتا ہے اور یہ کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان میں سے کئی ایک ان خوابوں کے پیچھے دوڑنا بند کر دیتے ہیں جو کبھی انہیں ہر وقت بے چین رکھتے تھے، طالب علمی کا دور آئیڈیل ازم کا دور ہی رہے گا۔ جیسے بچوں کو تتلیوں کے پیچھے بھاگنے سے کوئی نہیں روک سکتا ویسے ہی طالب علموں میں موجود حساس نوجوان اعلیٰ آدرشوں کی جستجو کرتے ہی رہیں گے۔ اس راستے میں شہید ہونے والوں کا صلہ نوجوانی کی تگ و تاب جاودانہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

باب 1

برصغیر ہندوستان میں طلبہ تحریک

1930ء کی دہائی برصغیر کی طالب علم تحریک میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس دہائی میں پہلی دفعہ ہندوستان میں ملکی سطح پر دو طالب علم تنظیمیں وجود میں آئیں۔ پہلے آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی اور پھر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ اول الذکر کا قیام1936ء میں عمل میں آیا جب کہ دوسری کی بنیاد ایک سال بعد رکھی گئی۔لیکن اس سے پہلے کہ ان دونوں کے بارے میں بات ہو، مناسب ہو گا کہ کچھ تذکرہ اس طلبہ جدوجہد کا بھی کر دیا جائے جو ان تنظیموں کے قیام سے پہلے ہو چکی تھی۔

برصغیر میں برطانوی حکومت کے خلاف برپا ہونے والی عوامی جدوجہد نے طالب علم تحریکوں کی نشوونما میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جس قدر جنگ تیز ہوتی گئی طالب علم تحریک بھی پھیلتی گئی۔ اس جنگ کے اتار چڑھاؤ اور اس کی پیچیدگیوں کے اثرات طالب علموں پر پڑتے رہے۔ 1857ء کے بعد طویل عرصے تک ہندوستانی عوام کسی بھی ملک گیر جدوجہد کے لئے کمر بستہ نہ ہو پائے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نو آبادکاروں کے خلاف جنگ کے لئے جن نئی سماجی بنیادوں کی ضرورت تھی وہ ابھی فراہم نہ ہوئی تھیں درمیانہ طبقہ جو جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کرتا ہے انیسویں صدی کے اواخر میں جا کر کسی قدر پھیلا اور اس نے ہندوستانی عوام کے سیاسی حقوق کے لئے آواز بلند کرنا شروع کی۔

برصغیر میں مذہبی مدرسے پہلے سے موجود تھے۔ جن میں طالب علموں کی ایک

محدود تعداد مذہبی علوم کے ساتھ ابتدائی ریاضیات کی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ تاہم جدید تعلیم کا آغاز انگریزی دور میں ہوا۔ اس ضمن میں تین پہلو قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ نو آبادیاتی حکمرانوں کی نظر میں جدید تعلیم متعارف کرنے کا مقصد ہندوستانی سوسائٹی کو ترقی کی منازل سے آشنا کرنا نہیں تھا بلکہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے مقامی ملازمین کی کھیپ پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ تعلیم کے فروغ کے لئے سرکاری سطح پر جو رقم مخصوص کی گئی وہ آبادی کی تعلیمی ضروریات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے نو آبادی بن جانے کے بعد تعلیمی اداروں اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ بہت سست رفتار سے ہوا۔ دوم یہ کہ چونکہ زیادہ تر تعلیمی ادارے انہی علاقوں میں قائم ہوئے جہاں یا تو انگریز سب سے پہلے قابض ہوئے تھے یا جنہیں وہ اپنے مفادات کی تکمیل کے سلسلے میں زیادہ اہمیت دیتے تھے، اس لئے مختلف صوبوں میں تعلیمی پھیلاؤ ناہموار انداز میں ہوا۔ کچھ صوبے تعلیمی اعتبار سے آگے بڑھ گئے، کچھ پیچھے رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف صوبوں میں سیاسی شعور کی سطح مختلف رہی اور طالب علم تحریک بھی یکساں انداز میں نہیں پھیل سکی۔ سوم یہ کہ چونکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ہندو آبادی اکثریت میں تھی اس لئے تعلیم کے میدان میں وہ مسلمانوں سے زیادہ ترقی کر گئے۔ مسلمان زیادہ تر دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں تعلیمی سہولتوں کا فقدان تھا اور جدید تعلیم کو ویسے بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ بعض علاقوں میں علما جدید تعلیم کی شدومد سے مخالفت بھی کرتے تھے۔ جب مسلمان بالآخر تعلیم کے میدان میں داخل ہوئے تو اس وقت ان میں سرسید کی سوچ کے اثرات غالب تھے۔ اس سوچ کی بنیاد انگریزوں کے ساتھ مکمل تعاون اور سیاست سے کنارہ کشی پر رکھی گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز حکومت سے وفا داری میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے برعکس مسلمان طلبہ دیر تک تحریکی سیاست سے علیحدہ رہے۔

انیسویں صدی کے خاتمے تک ہندوستان میں پانچ یونیورسٹیاں وجود میں آچکی تھیں۔ کلکتہ یونیورسٹی (1857)، ممبئی یونیورسٹی (1857)، مدراس یونیورسٹی (1857)، پنجاب یونیورسٹی (1882) اور الہ آباد یونیورسٹی (1887)۔ اس وقت تک ہندوستانی طلبہ تعداد میں کم تھے اور ان میں مسائل کا شعور اور خود اعتمادی ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوئے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انیسویں صدی کے آخر تک بطور ایک سماجی گروپ کے آزادانہ رد عمل کا کوئی بھی موثر اظہار نہ کر پائے۔ طالب علم تو ایک طرف رہے، خود ہندوستان کی سیاسی جماعتیں ابھی پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ رہی تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں سے کسی کے ایجنڈے پر آزادائی ہند کا مطالبہ نہ آیا تھا اور نہ ہی ان دونوں میں سے کوئی پارٹی بدیسی حکمرانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اپنانے کے لئے تیار تھی۔ دونوں پارٹیوں کے مطالبات چند اصلاحات تک محدود تھے۔ اور وہ انہیں جدوجہد کے ذریعے منوانے کی بجائے مودبانہ درخواستوں کی شکل میں پیش کرتی تھیں۔ دونوں پارٹیاں انگریز حکومت کی وفا داری کا برملا اعلان کرتی تھیں۔

آل انڈیا کانگریس ہر چند کہ زیادہ پرانی اور تجربہ کار پارٹی تھی لیکن اس کا بھی زیادہ سے زیادہ مطالبہ یہ تھا کہ ملک میں موجود وائسرائے کی کاؤنسل نیز اینگزیکیٹو کاؤنسلوں کی اصلاح کی جائے، ان میں منتخب ارکان شامل کئے جائیں یا ان کا تناسب بڑھایا جائے اور بجٹ ان کاؤنسلوں کے سامنے منظوری کے لئے پیش کئے جائیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کہیں جا کر کانگریس میں عدم تعاون کی تحریک چلانے کا تصور پیدا ہوا۔ تاہم اس ملک گیر تحریک سے پہلے ہی بعض صوبوں میں جہاں عوام حکمرانوں کی مخصوص پالیسیوں کی بناء پر شدید مشکلات کا شکار تھے، سیاسی ہلچل کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان صوبوں میں بنگال سب سے آگے تھا۔ یہاں طلبہ کی بڑی تعداد عوام کے پہلو بہ پہلو حکومت کے خلاف رزم آرا ہو رہی تھی۔ اس دور میں طلبہ بالعموم اپنا علیحدہ تنظیمی تشخص نہ رکھتے تھے اور سیاسی جماعتوں کی جانب سے شروع کی جانے والی تحریکوں میں شامل ہوتے تھے۔

بنگال میں سیاسی ہلچل کی بنیاد 1905ء کی تقسیم بنگال نے فراہم کی تھی۔ یہاں صوبے کی آبادی کا وہ حصہ جس میں زیادہ تر ہندو شامل تھے۔ صوبے کی دو حصوں میں تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ حکومت کے اس اقدام کا مقصد بنگالی قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا ہے۔ صوبے کی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار شروع کیا گیا۔ اعلان کو ابھی دو ہفتے ہوئے تھے کہ قوم پرست بنگالی رہنماؤں نے 7 اگست 1905ء کو اس کی مذمت کے لئے کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ

عام منعقد کیا جس میں حکومتی اقدام کے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔ نیز یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ان کاروباری مراکز پر جہاں پر یہ مصنوعات فروخت ہوتی ہے پکٹنگ کی جائے۔ شہروں میں رہنے والے بہت سے بنگالی مسلمان بھی انگریز حکومت کے ان اقدامات کی وجہ سے جن کی رو سے مقامی کپڑے کی صنعت تباہ ہوگئی تھی۔ معاشی بدحالی کا شکار ہو رہے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ایک حصے کی ہمدردیاں بھی تحریک کے ساتھ تھیں۔

تقسیم بنگال کے خلاف چلنے والی اس تحریک کے کارکنوں میں مولوی تمیز الدین خان کا نام بھی شامل ہے۔ جو بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے سپیکر بنے۔ مولانا اس وقت ہائی سکول میں طالب علم تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''تحریک جنگل کی آگ کی طرح صوبے کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ بنگال کے کونے کونے میں عوامی اجتماعات کا انعقاد اور بدیشی کپڑوں کی دوکانوں کا گھیراؤ روز مرہ کا معمول بن گیا۔ قومی ترانوں کی گونج اور بندے ماترم کے خارا شگاف نعروں کے ساتھ جلوس نکالے جاتے تھے۔'' (1)اس دور میں بنگال کے طالب علموں کو متحرک کرنے میں دو رہنماؤں نے اہم کردار ادا کیا جن کے نام گور داس بینر جی اور آرو بندو گھوش ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں 1905ء کی تحریک میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان دونوں کے علاوہ اور بھی کئی کانگریسی رہنما تقسیم بنگال کے خلاف چلنے والی تحریک میں آگے آگے تھے۔ مسلم لیگی رہنما اور ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ کی تمامتر مخالفت کے ابوجود تحریک میں مسلمان طلبہ نے بھی بھرپور شرکت کی۔ بقول مولوی تمیز الدین خان ''ہمارے سکول کے تمام طلبہ بلاتفریق مذہب کانگریسی رہنما امیکا چرن مجمدار کی دھواں دھار خطابت کے بھرے میں آگئے اور دل و جان سے بائیکاٹ تحریک میں شامل ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمان طلبہ کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ بعد ازاں جب نواب سلیم اللہ کا نقطہ نظر ان تک پہنچا تو انہوں نے ہندو طلبہ کی آواز میں آواز ملا کر مسلمانوں کی مخالفت کا مذاق اڑایا۔'' بطور طالب علم مولوی تمیز الدین خان نے بھی ایک جلسے میں تقریر کی۔

تحریک کے ابتدائی ایام میں طلبہ کی شرکت کی کچھ تفاصیل مولوی تمیز الدین خان نے اس طرح بیان کی ہیں۔ ''ہمارے سکول کے طلبا کی اکثریت رضا کاروں کی حیثیت سے

تحریک میں شامل ہو گئے۔ کبھی کبھار ہمیں جلسوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے کے علاوہ کوئی سنجیدہ ذمہ داری بھی سونپ دی جاتی تھی۔ ہم نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا اور بدیشی کپڑے کی دکانوں اور نمک کے سٹالوں کا گھیراؤ کرنے لگے (بنگال میں نمک برطانیہ کے شہر لیور پول سے درآمد کیا جاتا تھا) اگر محض گھیراؤ سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوتے تو ہم تشدد پر اتر آتے۔ غافل گاہکوں سے لیور پول نمک کے تھیلے چھین کر زمین پر بکھیر دیئے جاتے تھے اور سارا نمک قدموں سے روندا جاتا تھا۔ ایک روز ایک قلی ہمارے ہتھے چڑھ گیا جو نمک کا دو من وزنی تھیلا سر پر اٹھائے لے جا رہا تھا۔ اس منظر نے گویا وہی اثر کیا جو بیل کو سرخ کپڑا دکھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم لوگ مشتعل ہو گئے۔ ہم نے قلی سے نمک کا تھیلا چھین کر زمین پر پھینکا اور اسے کھول کر سارا نمک خاک میں ملا دیا اور اس پر کودتے رہے۔ ان مواقع پر ہمیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم خود کو مادر پدر آزاد سمجھنے لگے۔ وقتی طور پر انتظامی ڈھانچہ معطل ہو کر رہ گیا'' (2) تاہم جلد ہی حکومت نے تحریک کے ساتھ سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے طلبہ گرفتار کئے گئے اور انہیں دنگے فساد کے جرم کا مرتکب قرار دے کر سزائیں دی گئیں۔ اس سے طلبہ کی تحریک میں شمولیت ختم تو نہ ہوئی تاہم ان کے جوش اور ولولے میں فرق ضرور پڑا۔ ''حکومت نے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کو بھی طلبہ کے خلاف استعمال کیا۔ حکومت کے جوابی اقدامات کی نوعیت خاصی جامع تھی۔ تحریک میں تعلیمی اداروں اور طلبہ برادری کی شمولیت کے مدنظر طلبا کو مختلف طریقوں سے اچھا خاصہ سبق سکھایا گیا۔ جب 1906ء میں میٹرک کے نتیجہ کا اعلان ہوا (جسے اس زمانے میں انٹرنس امتحان کہا جاتا تھا) تو صرف 25فیصد طلبہ کامیاب ہو سکے۔ یہ کلکتہ یونیورسٹی میں کامیابی کی سب سے کم شرح تھی۔ طلبا نے 1906ء کو قتل عام کا سال قرار دیا۔''

جب حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لئے آمرانہ اقدامات کا سہارا لیا تو یہ ختم ہونے کی بجائے زیرِ زمین چلی گئی۔ اس دور میں مشرقی بنگال میں کئی خفیہ سوسائٹیاں قائم ہو گئیں جن میں سے پانچ نے بہت شہرت حاصل کی۔ ان خفیہ سوسائٹیوں میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انوشیلان سمیتی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے کارکنوں کو حلف

اٹھاتے ہوئے دو عہد کرنا پڑتے تھے:

1- تنظیم کی مکمل اطاعت اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تکمیل

2- اپنے خاندان کے ساتھ تعلقات کا انقطاع

گو خفیہ سوسائٹیوں کے ارکان آل انڈیا کانگریس کی چلائی ہوئی بائیکاٹ کی تحریک میں شریک تھے، تاہم ان کا پروگرام کانگریس سے آگے کا تھا۔ کانگریس مطالبہ کرتی تھی کہ برطانوی حکمران اپنی ہندوستانی رعایا کو نظام حکومت چلانے میں زیادہ حصہ دیں۔ جبکہ خفیہ سوسائٹیاں انگریز راج کا مکمل خاتمہ چاہتی تھیں۔ اسی طرح سے کانگریس پر امن تحریک کے حق میں تھی۔ جبکہ بنگال کی خفیہ سوسائٹیوں کا خیال تھا کہ بدیسی حکومت کا تختہ صرف انقلابی اقدامات سے الٹایا جا سکتا ہے۔

3- بنگال کے ان انقلابیوں کے سٹڈی سرکلوں میں ایک مخصوص طرز کے ہندو لٹریچر کا استعمال عام تھا۔ بھگوت گیتا کا مطالعہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ یہ ان کے خیال میں جدوجہد کا پیغام دیتی تھی، کالی دیوی کی پوجا پر اس لئے زور تھا کہ یہ دیوی بد روحوں کو تباہ کرنے والی دیوی کے طور پر جانی جاتی تھی اور انقلابیوں کی نظر میں غیر ملکی حکمران بد روحوں کا ہی ایک روپ تھے۔ اسی طرح سیوا جی کے حالات زندگی بھی انقلابی نصاب تعلیم کا حصہ تھے۔ کیونکہ اس مرہٹہ لیڈر نے اورنگ زیب کے خلاف (جو باہر سے آ کر حکمرانی کرنے والے مغل خاندان کا فرد تھا) علم بغاوت بلند کیا تھا۔

4- تاہم اس طرح کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالی مسلمان ان خفیہ سوسائٹیوں سے ہی نہیں بلکہ خود کانگریس کی تحریک سے بھی کٹتے گئے۔ جلد ہی بنگالی خفیہ سوسائٹیوں کے نوجوان کارکنوں نے حکومتی اہلکاروں اور مخبروں پر قاتلانہ حملے کرنا شروع کر دیئے۔ لیفٹننٹ گورنر کی گاڑی کو بھی بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ اس پر حکومت کے رویئے میں اور سختی آ گئی۔ نوبت پھانسیوں تک پہنچی۔ تقسیم بنگال کے فیصلہ کے واپس لئے جانے کے بعد ہیں جا کر یہ تحریک ختم ہوئی۔

ہندو مسلم سوال اور طالب علم تحریک

تقسیم بنگال کی تنسیخ نے ہندو آبادی کو تو مطمئن کر دیا لیکن اس کے نتیجے میں

بنگالی مسلمانوں اور ہندوؤں میں موجود اختلافات اور گہرے ہو گئے۔ یہ اختلافات دراصل ان تبدیلیوں کا نتیجہ تھے جو صوبے میں انگریزی راج نے پیدا کی تھیں۔ بنگال پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جو لوگ سب سے پہلے تختہ مشق بنے وہ مسلمان تھے۔ انگریزوں کے بنگال پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد بنگالی مسلمانوں کے ہر طبقے کو جو تکالیف برداشت کرنا پڑیں انہوں نے ان کی سوچ پر دیرپا اثرات مرتب کئے۔ پلاسی کی جنگ ہارنے کے بعد خواہ مسلمان اشرافیہ ہو یا عام کسان اور دستکار، سبھی کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چونکہ اقتدار مسلمان حکمرانوں سے چھینا تھا اس لئے اس کے اہلکار مسلمانوں کی وفاداری پر شک کرتے تھے۔ اسی طرح سے مسلمانوں میں بھی فرنگی حکمرانوں کی جانب مخاصمت کا رویہ عام تھا۔ تاہم انگریزوں کے اقتدار پر قابض ہو جانے سے مقامی ہندوؤں کو کوئی فوری نقصان نہ ہوا۔ وہ پہلے مسلمان نوابوں کی رعایا متصور ہوتے تھے اب سمندر پار سے آنے والے حاکموں کے اطاعت گزار قرار پائے۔ مسلمانوں کی وفاداری کو مشکوک سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے ملازمتوں کے سلسلے میں ان سے تعصب برتا اور مسلمان آبادی کو ان کاروباری مواقع سے بھی محروم کر دیا جو کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں سے وابستہ ہونے کی بنا پر کمپنی کے اہلکاروں کے اختیار میں تھے۔ مقامی آبادی کے لئے ترقی کے جو تھوڑے بہت راستے پیدا ہوئے تھے وہ اسی وجوہات کی بنا پر ہندوؤں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد وہی کاروبار پر قابض ہوئے اور سرکاری ملازمتوں پر بھی انہی کی اجارہ داری قائم ہوئی۔ مسلمان اشرافیہ جو نوجوان ڈھاکہ کے دور میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے نئے حکمرانوں کے رویہ کے نتیجے میں اپنا سماجی اثر و رسوخ کھو بیٹھی کچھ عرصے کے بعد یہ لوگ شہروں سے نکل کر دور دراز دیہات میں منتقل ہو گئے جس سے بنگالی سوسائٹی میں ان کی قیادتی پوزیشن قریباً ختم ہو گئی۔

بنگالی ہندوؤں کا وہ حصہ جس نے نئے حکمرانوں کے ساتھ تعاون کا راستہ اختیار کیا تھا ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے انہی لوگوں میں سے کمپنی کے گماشتے یا ایجنٹ مقرر کرنے شروع کئے تو انہوں نے بنگالی کی معیشت میں مضبوط پوزیشن حاصل کر لی۔ تجارت سے حاصل ہونے والی دولت کو یہ لوگ صنعتکاری کے لئے استعمال

نہیں کر سکتے تھے کیونکہ غیر ملکی حکمران اس سلسلے میں مقامی آبادی کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ چنانچہ مالدار ہندوؤں نے اپنی دولت سے زرعی اراضی خریدنا شروع کر دی۔ بنگال میں مستقل بندوبست اراضی(1793) کے بعد بہت سے ہندو جواب تک صرف بیوپار یا سودی کاروبار کرتے تھے بڑے بڑے زمیندار بن گئے۔ یہ عمل خاص طور پر صوبے کے مشرقی حصے میں ہوا جہاں طاقتور جواڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے نئے زمینداروں کے لئے پاؤں جمانا آسان تھا۔ اس لئے ایک نئی سماجی پیچیدگی نے جنم لیا۔ بنگال کے مشرقی علاقے میں چونکہ مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس لئے وہی ہندو زمینداروں کے مزارع بنے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب کچھ عرصے کے بعد برطانیہ کی کپڑے کی صنعت کوفروغ دینے کی خاطر بنگال کی ململ کی گھریلو دستکاری کوختم کرنا شروع کیا تو اس سے بھی مسلمان ہی متاثر ہوئے کیونکہ اس کاٹج انڈسٹری میں کاریگروں کی اکثریت انہیں پر مشتمل تھی۔ بیروزگاری کا نشانہ بننے والے کاریگروں نے جب دیہات کا رخ کیا تو ان کے پاس بھی سوائے ہندو زمینداروں کا مزارع بن جانے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

1901ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق بنگال کی کاشتکار آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ مزارع تھے نہ کہ زمیندار ہر 10,000 زمینداروں میں مسلمانوں کی تعداد 170 اور ہندوؤں کی تعداد 217 تھی۔ مسلم اکثریتی اضلاع میں بھی مزارعین زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ مثلاً ضلع بوگرا میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے 80% سے زیادہ تھے مگر زمینداروں کی اکثریت ہندو تھی۔ سارے ضلع میں صرف پانچ بڑے گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ ضلع راجشاہی میں ایسے گھرانوں کی تعداد صرف دو تھی۔ (6) کچھ عرصے بعد بنگال میں جو مزارع اور بڑے زمیندار کی لڑائی شروع ہوئی وہ تھی تو اصل میں طبقاتی جنگ مگر زمینداروں کے ہندو اور مزارعوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ زمینداروں کی زیادتیوں کے خلاف پیدا ہونے والے ردعمل نے اسلام کے نام پر چلنے والی کسان بغاوتوں کا روپ دھار لیا۔

ہندو قائدین آزادی نے جن اصطلاحات اور علامات کو رواج دیا ان کا تعلق بھی ہندو مذہب سے تھا۔ اسی طرح سے بنگال کے معروف ہندو ناول نویس مسلمان حکمرانوں کو

حملہ آور کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اور چونکہ ان حکمرانوں کی زبان فارسی تھی اس لئے بنگالی زبان کو ان عربی یا فارسی الفاظ سے جو رواج عام پا چکے تھے پاک کرنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے کی تحریک بھی شروع ہوگئی۔

ان تمام عوامل نے مل کر بنگال میں ہندو مسلم تنازع پیدا کیا جس نے بعد میں صوبے کے اندر دو قومی نظریہ کی بنیاد فراہم کی۔ انگریز حکمرانوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی سیاست پر عمل کرتے ہوئے ایسے اقدامات کئے جن سے یہ جھگڑا مزید پھیلا۔ 1905ء میں پہلے تقسیم بنگال اور پھر اس تقسیم کے خاتمے کے نتیجے میں صوبے کی مسلمان اور ہندو آبادی کے درمیان تنازعے کی ایک اور بنیاد پڑ گئی۔ اس کے بعد بنگالی مسلمانوں میں اپنی علیحدہ سیاسی شناخت قائم کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ اس عمل میں تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلمان طالب علم اور ہندو طالب علم علیحدہ علیحدہ سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد 1905ء میں بنگال میں ڈالی گئی بلکہ 1937ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا تاسیسی اجلاس بھی اسی صوبے میں منعقد ہوا۔

دیگر صوبوں کی طالب علم تحریکیں

پنجاب میں طلبہ کی پہلی ہڑتال جس کا ریکارڈ موجود ہے، 1905ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہندوستانی طلبہ نے کی (7) اس ہڑتال کا مقصد اس امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کرنا تھا جو کالج انتظامیہ انگریز طلبہ کے مقابلے میں مقامی طلبہ کے ساتھ روا رکھتی تھی۔ ہڑتال کی قیادت ڈاکٹر ستیہ پال نے کی جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے اور جنہوں نے بعد میں پنجاب میں کانگریس کے لیڈر کے طور پر شہرت حاصل کی۔ تاہم یہ ہڑتال صرف ایک تعلیم ادارے تک محدود رہی اور اس کا اثر باقی صوبے پر نہ پڑا۔

پنجاب میں پہلا عوامی ابھار 1907ء میں پیدا ہوا۔ عوام کے اندر حکومت کے خلاف شدید ردعمل کی فوری وجہ ایک غیر مقبول قانون بنا جسے حکومت اسمبلی سے پاس کرانا چاہتی تھی۔ مجوزہ قانون کو ''لینڈ ریکویزیشن بل'' کا نام دیا گیا تھا۔ اس بل کے ذریعے حکومت پنجاب میں واقع بار کے علاقے کے کسانوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کرنا چاہتی تھی

جو ان کے لئے قطعاً ناقابل قبول تھیں۔ ان کسانوں نے یہ بے آباد زمینیں کئی سالوں کی محنت سے قابل کاشت بنائی تھیں۔ اس سال صوبے کے زمیندار فصلوں کے خراب ہونے کی وجہ سے پہلے سے ہی خستہ حالی کا شکار تھے۔ بل کے آتے ہی چاروں طرف نکتہ چینی کا آغاز ہو گیا۔ کسانوں نے احتجاجی مظاہرے کرنا شروع کر دیئے۔ بڑے بڑے جلسے منعقد ہونے لگے۔ یکم مارچ سے یکم مئی تک راولپنڈی، لاہور، لائلپور، فیروز پور امرتسر بٹالہ اور کئی دوسرے شہروں میں بل کی مخالفت میں کل 28 اجتماعات ہوئے۔ ان جلسوں میں خاص طور پر دو آدمیوں نے جو خالصتاً سیاسی ذہن رکھتے تھے برطانوی راج کے خلاف سخت تقریریں کیں۔ ان میں سے ایک لالہ لاجپت رائے تھے اور دوسرے سردار اجیت سنگھ۔ لالہ لاجپت رائے آل انڈیا کانگریس کے رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے شعلہ بیان مقرر بھی تھے اور طلبہ میں خاص طور پر مقبول تھے۔ سردار اجیت سنگھ جو مستقبل کے معروف انقلابی بھگت سنگھ کے چچا تھے اس وقت ایک سکول میں استاد تھے۔ ان دونوں کی تقریروں میں عوام کے ساتھ ساتھ طلبہ بھی زیادہ سے زیادہ شرک ہوتے تھے۔

اس طرح کے مقررین کی خطابت نے پنجاب میں Land Requisition Bill کے خلاف اٹھنے والی تحریک کو جلد ہی انگریز مخالف جدوجہد میں تبدیل کر دیا۔ سی آئی ڈی کی جانب سے حکومت کو ارسال کی گئی ایک رپورٹ کے مطابق متنازعہ بل کے خلاف تو صرف آٹھ دس جلسوں میں بات ہوئی، باقی جلسوں اور جلوسوں میں حکومت دشمن تقریریں ہی ہوتی رہیں۔ دو ایک مہینوں ہی میں تحریک کا دائرہ کار کسانوں سے پھیل کر وکیلوں، کلرکوں، محنت کشوں اور طلبہ تک وسیع ہو گیا۔ جب مارچ 1907ء میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ریواز ریٹائر ہونے سے چند دن پہلے امرتسر الوداعی دورے پر آئے تو خالصہ کالج کے طلبہ نے ان کا استقبال حکومت مخالف نعروں سے کیا۔ پنجاب کے نئے گورنر سر ڈینزل ابٹسن نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو کو لکھا ''پنجاب میں ہر طرف لوگوں کو ایک تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک نئی ہوا چلنے لگی۔ اور لوگوں کے ذہن متاثر ہو رہے ہیں...... پنجاب کی صورت حال بہت گھمبیر ہو گئی ہے۔ یہاں باغیانہ سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر وجود میں آ گیا ہے۔'' ابٹسن نے تجویز کیا کہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا

جائے۔ وائسرائے نے لیفٹیننٹ گورنر کی رائے سے اتفاق کیا۔ کالونائیزیشن بل واپس لے لیا گیا مگر تحریک کے دونوں قائدین کو ملک بدر کر کے برما کے شہر مانڈلے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد چھوٹے لیڈروں اور ہزاروں سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں ٹھوس دیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں کئی طالب علم بھی شامل تھے۔ (8)

جنگ عظیم اول کے شروع ہونے کے ساتھ ہی کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج وقتی طور پر ختم ہو گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جذباتی وابستگیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ جنگ عظیم کے دوران بلقان کے ملکوں میں جو ترک ایمپائر کا حصہ تھے بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت کو مغربی اقوام کی حمایت حاصل تھی۔ جنگ عظیم کے اختتام پر جب یورپی اقوام نے ترکی کے حصے بخرے کرنے کا فیصلہ کیا تو ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ اس مقصد کے لئے ایک خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ اس جذباتی تحریک میں شریک ہونے والوں کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ تاہم چونکہ اس تحریک کا فطری رخ حکومت برطانیہ کے خلاف تھا اس لئے کانگریس نے بھی خلافت کمیٹی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو گئے اور مہاتما گاندھی خلافت تحریک کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔

مسلم لیگ اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں مسلمان اشرافیہ کے اس حصے کے زیر اثر رہی جو سرکار برطانیہ سے مکمل تعاون کا حامی اور انڈین نیشنل کانگریس سے عدم تعلق کا علمبردار تھا۔ لیکن ملکی حالات نے چند سال بعد ہی پارٹی کی قیادت کی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی۔ 1910ء کے ناگپور سیشن میں لیگ نے ملک کے عوام کو درپیش مسائل کے حل کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی تجویز پیش کی۔ لیگ کے نئے صدر سید نبی اللہ نے برطانیہ افسر شاہی پر تنقید کرتے ہوئے اسے عوام میں تفریق پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ صوبہ سرحد میں موجود برطانوی فوج میں کمی کی جائے اور دفاعی اخراجات کم کئے جائیں۔ 1911ء میں تقسیم بنگال کے خاتمے نے مسلمانوں میں احساس پیدا کیا کہ برطانوی حکومت ان کی ہمدرد نہیں ہے۔ بلقان میں ترکوں کے اقتدار کے خاتمے اور اس میں

یورپی اقوام کے کردار نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت سے مزید بدظن کیا۔1913ء کے مسلم لیگ کے سیشن میں قومی ترقی کے لئے ہندومسلمان اتحاد کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ 1915ء کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کے سیشن ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت پر ہونے لگے۔ اس اتحاد کے سب سے بڑے حامی محمد علی جناح تھے۔ جو اس وقت کانگریس کے رکن تھے۔

تحریک ہجرت اور مسلمان طلبہ

1914ء میں ترکی کے سلطان نے جسے ہندوستانی مسلمان خلیفہ اسلام کا مقام دیتے تھے حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا اثر اور تو کہیں نہیں ہوا البتہ ہندوستان کے جذباتی مسلمان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کچھ دنوں بعد چند علماء نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ مسلمانان ہند پر بھی اپنے انگریز حکمرانوں کے خلاف جہاد فرض ہے اور اگر ان کے لئے کسی وجہ سے یہ مذہبی فریضہ سرانجام دینا ممکن نہ ہو تو ان پر لازم ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی مسلمان ملک میں جا کر آباد ہو جائیں۔ ہندوستان کے دارالحرب قرار دیئے جانے کے بعد بھی اگر وہ یہ ملک نہیں چھوڑتے تو ان کی نماز، روزہ یا دیگر عبادات قبول نہیں ہوں گے۔

پنجاب کے چند طالب علم اس پراپیگنڈے سے متاثر ہوئے۔ ان میں سے آٹھ کا تعلق گورنمنٹ کالج لاہور سے، ایک کا ایف سی کالج سے، ایک کا اسلامیہ کالج سے اور چار کا کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے تھا۔ ان میں سے ایک کسی کا بھائی تھا۔ یہ کالج اس وقت اعلیٰ تعلیمی ادارے تصور کئے جاتے تھے۔ خاص طور پر گورنمنٹ کالج، ایف سی کالج اور میڈیکل کالج میں بہت کم مسلمان داخلہ لے پاتے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم ظفر حسن ایبک تھا جس کی کتاب ''آپ بیتی'' میں یہ داستان پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ان تمام طالب علموں کے ناموں کی فہرست ملتی ہے۔ ان میں گورنمنٹ کالج میں ایم اے کا طالب علم میاں عبد الباری شامل تھا جو بعد میں مسلم لیگ کا لیڈر بنا۔ غلام حسین بھی تھا جو بالآخر اسلامیہ کالج لاہور میں اکنامکس کا پروفیسر ہوا اور ظفر حسن ایبک بھی جو تمام مشکلات میں سے گزرنے کے بعد آخر کار ترک فوج کے اعلیٰ افسر کے طور پر ریٹائر ہوا۔ یہ لوگ

پولیس کی نظروں سے بچتے بچاتے کابل پہنچے جہاں معروف انقلابی عالم دین مولانا عبید اللہ سندھی پہلے سے مقیم تھے۔ مولانا سندھی کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے کابل بھیجا تھا تا کہ وہ حکومت افغانستان کی مدد سے انگریزوں کے خلاف سرحد میں محاذ جنگ قائم کریں اور اس کے بعد سارے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت برپا کر دی جائے۔ یہ منصوبہ بغیر سوچے سمجھے بنایا گیا تھا۔ اس کی بنیاد اس خوش فہمی پر تھی کہ کابل حکومت انگریزوں کے خلاف بغاوت میں مدد کرے گی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ والئی افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے مشیر انگریزوں کے اثر میں تھے جبکہ ان کا اپنا وقت جہاد کی منصوبہ بندی کرنے کی بجائے داد عیش دینے میں گزرتا تھا۔

1915ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جنگ کا اصل میدان تو یورپ تھا لیکن جرمن حکمران انگریزوں کی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کرانا چاہتے تھے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک جرمن مشن کابل میں قائم کیا اور اس کی نگرانی میں ہندوستان کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ بنارس کے راجہ مہندر پرتاپ کو اس کاغذی حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وزراء میں سے ایک مولوی برکت اللہ بھوپالی تھا جو امریکہ میں قائم ہندوستانی انقلابیوں کی غدر پارٹی کا سرکردہ لیڈر تھا اور دوسرا مولانا عبید اللہ سندھی۔ اس عبورت حکومت میں ہندوستان سے آئے ہوئے طلبہ کو بھی عہدے دیئے گئے۔ کچھ کو مختلف ملکوں میں عبوری حکومت کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ ان میں سے ایک گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم شیخ عبد القادر بھی تھا۔ وہ جب اپنے سفارتی فرائض سرانجام دے کر کابل آ رہا تھا تو راستے میں برطانیہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے واپس ہندوستان لے جا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کا انتقال جیل ہی میں ہوا۔

کابل میں ہندوستان بھر سے اور بھی کئی نوجوان ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پاس افغانستان میں کرنے کے لئے کوئی کام بھی نہ تھا۔ جلد ہی ان کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ ختم ہو گئی۔ کچھ مایوس ہو کر واپس ہندوستان پلٹ گئے اور گھر پہنچتے ہی دھر لئے گئے۔ ان کے خلاف بغاوت کے مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ کچھ کابل میں ہی مر کھپ گئے۔ دو طلبہ نے اکتاہٹ سے تنگ آ کر واپس اسمس آنے کا فیصلہ کیا۔ اسمس کا مقام

ہندوستان اور افغانستان کے درمیان واقع آزاد قبائلی علاقے میں تھا۔ یہاں سید احمد شہید کی تحریک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آباد تھے۔ ان میں سے اکثر کو ہندوستان سے ہجرت کیے تین چار دہائیاں گزر چکی تھیں۔ وہ اسمس میں جو دنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا ہر قسم کی تبدیلیوں سے بے خبر زندگی گزار رہے تھے۔ یہ لوگ ہنوز بندوق کے استعمال سے ناواقف تھے اور جہاد لڑنے کی امید میں تلوار کی لڑائی کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ کابل سے آنے والے طالب علموں میں سے ایک کے ہاتھوں کسی وجہ سے ایک مقامی شخص قتل ہو گیا۔ مجاہدوں نے پہلے تو اس طالب علم کو جس کا نام عبدالرشید تھا حملہ کر کے شدید زخمی کر دیا۔ ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ اسے اٹھا کر دہکتے ہوئے تنور میں پھینک کر ہلاک کر دیا۔ مہاجر طلبہ میں کچھ ایسے پختہ عزم بھی تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کی خاطر وسطی ایشیا کے راستے ترکی پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب روس میں نیا نیا بالشویک انقلاب آیا ہوا تھا اور سامراجی ملکوں کے اشارے پر ترکستانی ملاؤں نے ماسکو کی نئی حکومت کے خلاف ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ترکی جانے والے قافلے پر انقلاب دشمن ترکمانوں نے حملہ کر کے درجن بھر آدمی قتل کر دیئے۔ باقی ماندہ کو غلام بنا لیا اور بیڑیاں پہنا کر مشقت پر لگا دیا۔ ان بیچاروں کو بالآخر سوویت فوج نے نجات دلائی۔ ان میں سے بعض پھر بھی ترکی جانے کے شوق میں آگے چلے گئے۔ پچیس تیس کے قریب نوجوان تاشقند ٹھہر گئے۔ یہاں ان کی تعلیم اور فوجی ٹریننگ کے لئے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی نے تاشقند ملٹری سکول قائم کیا ہوا تھا۔ چھ ماہ بعد انہیں ماسکو کی ''یونیورسٹی آف دی پیپلز آف ایسٹ'' میں داخلہ دے دیا گیا۔ انہیں نوجوانوں نے 1920ء میں تاشقند میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ ان میں سے جو لوگ بعد میں مشہور ہوئے ان میں فیروز الدین منصور، فضل الٰہی قربان اور پروفیسر غلام حسین شامل ہیں۔ ہندوستان سے آنے والے کئی ایک نوجوان کمیونسٹ تحریک کا حصہ تو نہ بنے لیکن انہوں نے وجوہات کی بنا پر شہرت پائی۔ ان میں معروف دانشور اقبال شیدائی، مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جسٹس چنگیز، پنجاب اسمبلی کے مسلم لیگی رکن میاں عبدالباری، کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور پنجاب کے معروف سیاسی رہنما میاں محمود علی قصوری کے بھائی محمد علی قصوری نیز سیاسی کارکن عزیز ہندی شامل ہیں۔ (9)

طلبہ اور رولٹ ایکٹ

پنجاب میں طلبہ ایک مرتبہ پھر1919ء میں اٹھے۔ اس سال جنوری میں حکومت نے جب بد نام زمانہ رولٹ بل مرکزی اسمبلی کے سامنے پیش کیا تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے بیک آواز اس کی مخالفت کی۔ بل کا مقصد حکومت کو یہ اختیار دینا تھا کہ وہ کوئی بھی وجہ بتائے بغیر افراد کو نظر بند اور اخبارات کو زباں بند کر سکے۔ رولٹ ایکٹ کا مقصد ہندوستان کی اس تحریک آزادی کا قلع قمع کرنا تھا جو ملک بھر میں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ رولٹ بل کے مسودہ پر ہندوستانیوں نے پر زور احتجاج کیا۔ ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں محمد علی جناح، وی جے پٹیل، تیج بہادر سپرو، اور مدن موہن مالویہ سبھی نے ایڑ چوٹی کا زور لگایا کہ یہ بل پاس نہ ہو پائے۔ محمد علی جناح نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''یہ بل پاس کر کے آپ سوگ (یعنی حکومت برطانیہ) ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ایسی صورت پیدا کر دیں گے جس کا سامنا آپ لوگوں نے اب تک نہیں کیا'' اس ساری مخالفت کے باوجود مارچ میں رولٹ بل کو قانون کا درجہ دے دیا گیا۔ جنگ عظیم اول نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ ملک کی بیشتر سیاسی جماعتوں نے جنگ میں برطانوی حکومت کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ مہاتما گاندھی تمامتر امن پسندی کے باوجود بنفس نفیس وائے سرائے کی ''ریکروٹمنٹ کانفرنس'' میں شامل تھے۔ سب کو توقع تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد انگریز اس تعاون کا بدلہ چکائیں گے۔ ملک کے سیاسی ڈھانچے میں اصلاحات کر کے عوام کو ملکی امور میں پہلے سے زیادہ شرکت کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ پہلے سے موجود ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو بھی نرم کر دیا جائے گا۔ رولٹ بل پاس ہو جانے سے ان سب کی امیدوں رپ پانی پھر گیا۔ محمد علی جناح نے ایک زور دار خط کے ساتھ اسمبلی کی رکنیت سے اپنا استعفے گورنر جنرل کو بھیج دیا۔ ساتھ ہی گاندھی نے 6اپریل کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

پنجاب نے چونکہ جنگی سرگرمیوں میں باقی صوبوں سے بڑھ کر شرکت کی تھی اس لئے یہاں سرکار سے امیدیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ جب ان امیدوں پر پانی پھرا تو سب

سے زیادہ ردعمل بھی یہیں ہوا۔ مسلمانوں کو اس بات کا بھی قلق تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد برطانیہ نے ترکی کے مفادات کے تحفظ کا وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ چنانچہ پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کے دوران ہندو مسلم سکھ اتحاد کے بے مثال مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی یہ مظاہرے امن و امان سے گزر جاتے۔ لیکن پنجاب میں ایک سر پھرے اور جابر گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت تھی جس کے اندر بقول راجہ غضنفر علی خان ''سامراجیت کا جذبہ تقریباً جنون کی حد تک موجود تھا۔'' چنانچہ اس نے لاہور میں طاقت کے استعمال کے ذریعے احتجاج کرنے والوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ مہاتما گاندھی کو جو پنجاب آرہے تھے صوبے کی سرحد پر روک کر واپس بھیج دیا گیا۔ امرتسر میں دو معروف سیاسی لیڈروں یعنی ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو صوبہ بدر کر دیا گیا۔ اس پر شہر میں احتجاجی جلوس نکالا۔ جب مظاہرین پر فوج نے گولی چلا دی تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے دو انگریزی بنکوں اور چار سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا، پانچ انگریز موت کے گھاٹ اتار دیئے اور ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر مس شروڈ پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ حکومت نے ان واقعات کا شدید نوٹس لیا۔ اسی شام لاہور میں نکلنے والے ایک جلوس پر جو ہائی کورٹ کے سامنے مظاہرہ کر رہا تھا اور اس میں بہت سے طلبہ بھی شامل تھے پولیس نے گولی چلا دی۔ یہی جلوس جب دوبارہ لوہاری دروازے کے سامنے جمع ہونے لگا تو پھر فائر کھول دیا گیا۔ دو دن بعد امرتسر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جس کی کمان ایک اور سر پھرے کے ہاتھ میں تھی یعنی بریگیڈیر (بعد میں جنرل) ڈائر 13 اپریل کو جلیانوالہ باغ میں پر امن اور نہتے لوگوں کے مجمع پر فوج نے بغیر کسی تنبیہہ کے گولی چلا دی۔ دس منٹ تک گولیوں کی بوچھاڑ جاری رہی اور فائرنگ اس وقت بند ہوئی جب گولیاں ختم ہو گئیں۔ پانچ سو سے ایک ہزار تک لوگ مارے گئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں انگریزوں نے کسی جگہ بھی اتنی تعداد میں نہتے لوگوں کو گولی کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا اور پنجاب میں تین ماہ تک وہ ہنگامہ ہوا کہ پنجاب کے گورنر کے بقول پنجاب میں عام بغاوت شروع ہو گئی۔

لاہور میں 10 اور 11 اپریل کو جن جلوسوں پر فائرنگ کی گئی ان میں شہر کے طلبہ

بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ 12اپریل کو ایک جلسہ شاہی مسجد میں منعقد ہوا۔ خلافت تحریک نے مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں جو دوستی پیدا کر دی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان دنوں مسلمان ہندو، سکھ سبھی مساجد میں جمع ہوتے تھے۔ اور ہندو مسلم لیڈر اکٹھے خطاب کرتے تھے۔ واپسی پر فائرنگ کے نتیجے میں مرنے والوں میں ایک طالب علم نوشی رام بھی شامل تھا۔ اسے چھ گولیاں لگی تھیں۔ اس کی موت پر شہر کے تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی اور جلوس نکلے۔ (10)اپریل کی 15 تاریخ کو لاہور، امرتسر اور پنجاب کے کئی دوسرے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ لاہور اور دیگر شہروں کو فوج کے حوالے کیے جانے کے بعد پہلا حملہ تعلیمی اداروں پر ہوا۔ پر وبودھ چندر کے بقول سیکڑوں سلبہ یونیورسٹی سے خارج کر دیئے گئے۔ (اس وقت میٹرک اور ایف اے کا امتحان بھی یونیورسٹی ہی لیتی تھی) ہزاروں کو جرمانے ہوئے اور بے شمار طلبہ کو کوڑے لگائے گئے۔ لاہور کا مارشل لا اینڈمنسٹریٹر کرنل جانسن مقرر ہوا جو انتہائی سخت گیر افسر تھا۔ اس نے اہل لاہور کے لئے ایک منفرد سزا ایجاد کی۔ حکومت مخالف افراد اور اداروں کے دروازوں پر مارشل لاء کے حکم نامے چسپاں کر دیئے جاتے تھے اور مالکان کو ان کی حفاظت کا پابند بنا دیا جاتا تھا۔ ایک ایسا ہی نوٹس لاہور کے سناتم دھرم کالج کے باہر آویزاں کیا گیا۔ (یہ کالج اس عمارت میں واقع تھا جہاں اب ایم اے او کالج قائم ہے) وجہ یہ تھی کہ اس کالج کے اساتذہ اور طلبہ قوم پرست سیاسی جماعتوں سے وابستگی کی بنا پر حکومت مخالف تصور کیے جاتے تھے۔ یہ نوٹس کسی نے پھاڑ دیا۔ اس کی سزا کالج کے پانچ سو طلبہ اور ان کے اساتذہ کو دی گئی۔ ان سب کو حراست میں لے لیا گیا۔ پھر انہیں مئی کی تیز دھوپ میں اپنے بستر سروں پر اٹھا کر لاہور کے شاہی قلعے تک جو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے پیدل مارچ کرنے کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد دو دن تک قلعے میں قید رکھا گیا۔ ڈی اے وی کالج (جس کی عمارت میں اب اسلامیہ کالج سول لائنز قائم ہے) دیال سنگھ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلبہ کو جن کی ہمدردیاں بھی قوم پرست تحریک کے ساتھ تھیں حکم دیا گیا کہ وہ دن میں چار مرتبہ کالج میں حاضر ہوں۔ صبح سات بجے، دن کے گیارہ بجے، دوپہر تین بجے اور پھر شام سات بجے۔ میڈیکل کالج کا ہاسٹل ان دنوں چھ کلومیٹر دور تھا۔ چنانچہ طلبہ کو روزانہ چوبیس کلومیٹر مسافت طے کرنا پڑتی

تھی۔

کرنل جانسن نے اس شکایت کی بنا پر کہ کسی کالج کے نامعلوم طلبہ نے انگریز عورتوں پر فقرے کسے ہیں، لاہور کے تمام کالجوں کے پرنسپلوں کو حکم جاری کیا کہ وہ اپنے اپنے اداروں کے تمام شریر طلبہ کو سزا دیں۔ ورنہ وہ خود گرفتار کر لئے جائیں گے۔ کالجوں کے سربراہوں نے اپنی جان بچانے کے لئے لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں بہت سے طلبہ تعلیمی اداروں سے خارج کر دیئے گئے، کئی ایک کے داخلے روک دیئے گئے اور وظیفے بند کر دیئے گئے۔ ان کے علاوہ اور مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ دیال سنگھ کالج، ڈی اے وی کالج اور گورنمنٹ کالج کے لڑکوں پر خاص طور پر سختی کی گئی۔ قصور شہر میں جو ضلع لاہور کا حصہ تھا دو فوجی قتل کر دیئے گئے تھے۔ یہاں عام شہریوں کے ساتھ طلبہ بھی باغیانہ سرگرمیوں کے ملزم قرار دیئے گئے۔ شہر میں کالج تو بنا نہیں تھا، البتہ ہائی سکول تھا۔ حکم جاری ہوا کہ سکول کے تمام شرارتی بچوں کو کوڑے لگائے جائیں۔ ہیڈ ماسٹر نے جو بچے پیش کئے وہ کمزور اور لاغر اندام تھے۔ حکم دیا گیا کہ صحت مند طلبہ لائے جائیں۔ یہاں چھ بچوں کو کوڑے لگائے گئے۔ (11)

طالب علم تحریک اور انقلابی دہشت پسندی:

شہیدان وطن کے خون ناحق کا جو تت نکلے تو اس کے ذرے ذرے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ عدم تعاون نے ہندوستان بھر کے عوام کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو انگریز حکومت کے خلاف متحرک کر دیا۔ 1919ء سے لے کر 1922ء تک سارے ملک میں جدوجہد کی لہر چلی۔ 1919ء میں پنجاب کی کئی شہروں میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ عوامی جدوجہد کا ریلا چار سال تک برطانوی سامراج کی چٹان سے ٹکراتا رہا۔ مہاتما گاندھی نے اس جدوجہد کو پر امن ترک موالات کی تحریک کا نام دیا اور اعلان کیا کہ یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہندوستان کو سوراج یعنی حکومت خود اختیاری دینے کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ طالب علموں کو کہا گیا کہ وہ سرکاری تعلیمی ادارے چھوڑ دیں۔ ملک کے کئی مقامات پر نیشنل کالج اور نیشنل یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کی کال پر اٹھارہ سال سے اوپر کے سینکڑوں نوجوان نیشنل والنٹیئر کور میں شامل

ہوئے جسے حکومت نے غیر قانونی تنظیم قرار دیا ہوا تھا۔ اس تنظیم کا مقصد سول نافرمانی میں حصہ لینا تھا۔ اس تحریک کے دوران ہزاروں سیاسی کارکن پابند سلاسل ہوئے اور سینکڑوں نے سیاسی قیادت کے حکم پر سرکاری ملازمتوں کو خیر باد کہا یا قانونی پریکٹس چھوڑی۔1922ء میں چوراچوری کے مقام پر مظاہرین نے جب ایک پولیس تھانے کو آگ لگائی اور اس کے نتیجے میں کئی سپاہی جل مرے تو گاندھی نے تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس دوران خلافت تحریک بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ یہ تحریک اپنی تمام تر انگریز دشمنی کے باوجود ایک جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ تحریک تھی۔ ترکی کی نئی قیادت جس کی سربراہی مصطفیٰ کمال پاشا کے پاس تھی خلیفہ کو تمام خرابیوں کا منبع قرار دیتی تھی۔ اس لئے اس نے اقتدار سنبھالتے ہی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ترک قیادت اس اسلامی بین الاقوامیت (Pan-Islamism) سے بھی کوئی ہمدردی نہیں رکھتی تھی جو خلافت کمیٹی کا بنیادی نعرہ تھا۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ خلافت کے حوالے سے لوگوں کو اکٹھا کرنا ایک دشوار عمل بن گیا۔ سول نافرمانی کی تحریک نے نہ صرف عوام کے خون کو گرمایا بلکہ اس نے طالب علموں میں بھی جاگرتا پیدا کی۔ تحریک کے دوران مہاراشٹر اور بنگال کے کئی شہروں میں طلبہ یونینیں قائم ہوئیں۔ تاہم جب مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کا اعلان کیا تو ملک میں چاروں طرف مایوسی پھیل گئی۔ اس کے تین نتیجے برآمد ہوئے۔ ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی اور موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس نے سوراجیہ پارٹی بنا لی۔ دوسری طرف ملک میں موجود اتحاد کی فضا کو دھچکا لگا اور فرقہ وارانہ فسادات از سرنو شروع ہو گئے۔ اور تیسری طرف نوجوانوں میں دہشت گردی کے رجحان نے فروغ پایا۔ اس مرتبہ فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں وہ صوبے بھی آ گئے جہاں اب تک ہندو مسلم مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان مثالی اتفاق قائم تھا۔

1924ء میں کوہاٹ میں ڈیڑھ سو ہندو قتل ہوئے اور باقی ماندہ جن کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ تھی راولپنڈی منتقل کرنا پڑے۔ سندھ صوفیاء کے اثرات کی وجہ سے مذہبی تعصّبات سے بالا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہاں پر بھی 1927ء میں لاڑکانہ اور چند سال بعد سکھر فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آ گئے۔ تحریک ختم ہو گئی تھی مگر ہزاروں سیاسی کارکن ابھی

جیلوں میں بند تھے اور حکومت عوام کو دبانے کے لئے نت نئے قوانین بنا رہی تھی۔ عوام میں ایک طرف غم و غصہ تھا تو دوسری جانب بے بسی کا بھی شدید احساس بھی۔ نوجوانوں کے ایک حصے میں کانگریس کی اعتدال پسندی کو سخت ناپسند کیا گیا۔ کئی نوجوان 1917ء کے انقلاب روس سے متاثر تھے۔ جس کے دوران مسلح عوام نے طاقت کے بل پر ایک مستبد شہنشاہ کا تختہ الٹ دیا تھا۔ انہیں نوجوانوں میں سے کچھ نے ''ہندوستان سوشلسٹ ریپبلیکن ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد بدیسی حکمرانوں کے خلاف مسلح کاروائیاں کرنا تھا۔ تاکہ برطانوی حکومت کے دبدبے اور سرکاری مشینری کی دہشت ختم کی جائے۔ عوام کا حوصلہ پھر سے بلند ہو، قوم پرست قوتوں کی بے عملی سے پیدا ہونے والی مایوسی کی لہر ختم ہو اور وہ از سر نو حکومت کے خلاف صف آرائی کریں۔ ایسوسی ایشن کے ملٹری ونگ کو ''ہندوستان سوشلسٹ ریپبلیکن آرمی'' کا نام دیا گیا۔ اس کے رہنماؤں میں چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ اور سکھدیو شامل تھے۔ 1926ء میں بھگت سنگھ نے لاہور میں ''نوجوان بھارت سبھا'' قائم کی جس کے مقاصد بھی یہی تھے۔ ان تنظیموں میں سکولوں اور کالجوں کے طلبہ بھی تھے اور عام نوجوان سیاسی کارکن بھی۔ نوجوان بھارت سبھا کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

1- ہندوستان کے کسانوں اور محنت کشوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا قیام۔
2- ملک کے نوجوانوں میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کر کے متحدہ ہندوستانی قوم کی تخلیق کرنا۔
3- معاشی، صنعتی اور سماجی تحریکوں کی حمایت کرنا۔
4- کسانوں اور محنت کشوں کو منظم کرنا۔

نوجوان بھارت سبھا کا خیال تھا کہ ان مقاصد کو صرف عوامی انقلاب کے ذریعے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (12) اس نئی تنظیم کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی رسمی تعلق نہ تھا لیکن اس کے ارکان کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھے۔ سبھا نے نوجوانوں میں انقلابی نظریات پھیلانے کے لئے ایک Tract society قائم کی اور کچھ پمفلٹ شائع کئے۔ ان کے علاوہ ایک اخبار ''نوجوان'' بھی نکالا۔ نوجوان بھارت سبھا کی سرگرمیوں کا محور لاہور کا ڈی۔

اے ۔ وی کالج تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کالج کے طلبہ میں قوم پرست نظریات بہت مقبول تھے اور کالج کی یونین سبھا کا حصہ بن چکی تھی۔ 1928ء میں نوجوان بھارت سبھا نے پنجاب کی کسان تنظیم ''کیرتی کسان پارٹی'' سے الحاق کا فیصلہ کیا اور دونوں نے مل کر صوبے کی مختلف ٹریڈ یونینوں کو منظّم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ حکومت نے محنت کش طبقے میں انقلابیوں کے اثرات ختم کرنے کے لئے مرکزی اسمبلی سے Public safety Bill اور Industrial Disputes Bill منظور کرائے۔ انہی بلوں کے خلاف بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کا فیصلہ کیا۔

1923ء سے 1930ء تک طالب علموں میں ایک طرف یونین سازی اور دوسری جانب دہشت پسندانہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ بھگت سنگھ انفرادی دہشت گردی کے حامی نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زیر زمین سرگرمیاں اور پر تشدد کاروائیاں صرف حکومتی دبدبہ ختم کرنے تک محدود رہنی چاہئیں تا کہ عوام کا حوصلہ بلند رہے۔ اس کے ساتھ آئینی جدوجہد بھی جاری رکھنی چاہیے۔ اس لئے انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے قانونی حدود کے اندر کام کرنے والی طالب علم تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1927ء میں انہوں نے صوبے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی طالب علم تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد طلبہ میں سیاسی شعور پیدا کرنا تھا۔ ''لاہور سٹوڈنٹس کانفرنس'' کے تاسیسی سیشن کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اس تنظیم کی بنیاد رکھنے والوں میں بھگت سنگھ کے ہمراہ بھگوتی چرن، سکھدیو اور احسان الٰہی بھی شامل تھے۔(13)

اس دوران مہاراشٹر اور بنگال میں بھی طالب علم یونینیں قائم ہو رہی تھیں۔ ''ہندوستان سوشلسٹ رپبلیکن ایسوسی ایشن'' کے کارکنوں نے اگست 1925ء میں ہردوئی سے لکھنو جانے والی ٹرین کو کاکوری ریلوے سٹیشن کے قریب روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ بعد میں ان میں سے کچھ پولیس کے ہاتھ آ گئے۔ ان پر جو مقدمہ چلا وہ کاکوری سازش کیس کے نام سے مشہور ہے۔ مقدمہ کے نتیجے میں چار ملزموں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

1928ء میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے کے دوران پنجاب کے مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے کو پولیس نے تشدد کا نشانہ بنایا اور وہ چند دن کے بعد انتقال کر گئے۔

لالہ لاجپت رائے کی موت کا انتقام لینے کے لئے ''سوشلسٹ ریپبلکن آرمی'' کے کارکنوں نے ایک انگریز پولیس افسر مسٹر سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 18 اپریل 1929ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے مرکزی اسمبلی کے ایک اجلاس میں پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹس بل پیش کئے جانے تھے۔ یہ دونوں بل حکومت برطانیہ کے ان جابرانہ اقدامات کا حصہ تھے۔ جن کا نشانہ ہندوستانیوں کو بنایا جا رہا تھا۔ بھگت سنگھ کے گروپ نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر اسمبلی کے اندر بم پھینکے جائیں تا کہ ملک میں موجود سناٹا ٹوٹے۔ جب صنعتی تنازعات کے بل پر بحث مکمل ہو چکی اور ان کی منظوری کے اعلان کا موقعہ آیا تو بھگت سنگھ نے مہمانوں کی گیلری سے اسمبلی کے ہال کے اندر ایک بم پھینکا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی زخمی نہ ہو۔ ابھی لوگ پہلے دھماکے سے سنبھل ہی رہے تھے کہ بھگت سنگھ نے ایک اور بم پھینکا۔ پھر وہ اور ان کے دوسرے ساتھی بی۔ کے۔ دت ''انقلاب زندہ باد'' اور ''برطانوی سامراج مردہ باد'' کے نعرے لگاتے اور ایسوسی ایشن کے اعلان نامے کی کاپیاں پھینکتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اس دوران انہوں نے فرار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جو اعلان نامہ انہوں نے تقسیم کیا اس کی سرخی تھی۔ ''بہرے آدمی کو بات سنانے کے لئے اونچی آواز کی ضرورت ہے۔''

بھگت سنگھ اور دت کی گرفتاری کے بعد پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مار کر بہت سے انقلابیوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں پنجاب سٹوڈنٹس یونین کے کئی ارکان بھی شامل تھے۔ لاہور کی بم فیکٹری کا پولیس کو پتہ چل گیا۔ یہاں سے کئی انقلابی پکڑے گئے۔ لاہور سازش کیس بتیس ملزموں کے خلاف قائم کیا گیا۔ ان میں سے نو مفرور قرار دیئے گئے اور بالآخر سولہ ملزموں کو مقدمے کا سامنے کرنا پڑا۔ استغاثہ نے پانچ مہینہ تک مقدمہ کا ڈرامہ رچایا۔ اس کے بعد عدالت نے اکتوبر 1930ء کو اپنا فیصلہ سنایا۔ بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سات کو عمر قید اور باقیوں کو لمبی سزائیں سنائی گئیں۔ پانچ مہینے کے دوران بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے جس جرات کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ان انقلابی نوجوانوں کو تمام ہندوستان کے عوام کی آنکھ کا تارہ بنا دیا تھا۔ جیل میں ہونے کے باوجود ان انقلابیوں نے کوئی بھی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جس سے ثابت کیا جا

سکے کہ سیاسی کارکنوں کی قوت ارادی کے آگے دنیا کی سب سے طاقتور سامراجی طاقت بھی بے بس ہے۔ انہوں نے سیاسی قیدیوں کے حقوق کے لئے بھوک ہڑتال شروع کی جو 63دن تک جاری رہی۔ ان قیدیوں میں سب سے کم عمر جیتن داس تھا۔ اس نحیف و نزار بنگالی نوجوان نے جیل کے حکام کی ان تمام کوششوں کو ناکام بنایا جو اس زبردستی غذا دینے کے لئے کی گئی تھیں۔

احرار کے معروف سیاسی رہنما چودھری افضل حق جیل کی تحقیقاتی کمیٹی کے غیر سرکاری رکن کے طور پر بھوک ہڑتالیوں سے انٹرویو کرنے گئے اور انہوں نے بھگت سنگھ وغیرہ کو بھوک ہڑتال ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے جیتن داس کی زندگی کے آخری لمحات کے دوران اس کی مستقل مزاجی کا تذکرہ ایسے کیا ہے'' نوجوان داس آنکھیں بند کئے سٹریچر پر پڑا تھا۔ اگرچہ زندگی کے دن گن رہا تھا مگر اجتماع کے مقصد سے بے خبر نہ تھا۔ جب وہ آنکھیں کھولتا تھا ہاتھ سے ساتھیوں کو نفی کا اشارہ کرتا تھا۔ کہ بات نہ مانو۔ موت قبول کرلو۔ مجھے محسوس ہوا داس امید کی سرحد سے پار ہو چکا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ آیا یہ جانبر ہوسکتا ہے اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ ممکن ہے مگر یقینی نہیں۔ وہ جبری خوراک کے وقت بھی سخت مزاج کرتا رہا ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور تھا۔ اب تو فاقہ نے موت کے منہ میں لا ڈالا ہے۔ پہلی ملاقات جو آج سے ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اسے مہیا بقضا پایا تھا۔ اس وقت میرا دل تڑپتا تھا کہ وہ کسی طرح بچ جائے۔ تین گھنٹے کی طویل گفتگو کے بعد بھگت سنگھ کا سٹریچر داس کے سٹریچر کے قریب لایا گیا۔ چونکہ بھگت سنگھ خود بھی نحیف و کمزور تھا اس نے اپنا منہ داس کے کان کے قریب لے جا کر کچھ کہا۔ لیکن داس نے تیوری چڑھا کر ہاتھ نفی میں ہلا دیا۔

'' ہم سمجھ گئے کہ سب ترک فاقہ پر آمادہ ہو گئے ہیں لیکن داس اسی منزل پر بڑھے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب ہم قریب آگئے۔ داس کو خود سمجھانے لگے۔ جب میں اس پر جھکا تو دیرینہ آشنا کو دیکھ کر ہلکا سا تبسم اس کے لبوں پر کھیلنے لگا۔ زبان سے بولنے کی طاقت نہ رکھتا تھا تاہم ہاتھ کے معروف اشارے سے مجھے ناامید کر دیا۔''(14)

داس کا انتقال بھوک ہڑتال ہی کی حالت میں ہوا۔ بقول چودھری افضل حق

''عاشق کے جنازے کی طرح کی ارتھی بڑی دھوم سے اٹھی۔ لاہور سے کلکتہ تک ماتم کی لہر دوڑ گئی۔'' ان نوجوانوں کی حمایت میں جیل میں موجود کئی دوسرے قیدیوں نے بھی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ پنجاب سے باہر میرٹھ سازش کے قیدیوں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ پھانسی پر جھولنے سے پہلے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی ملک بھر میں حکومت کے خلاف تحریک کی بنیا پیدا کر چکے تھے۔ ان کو دی جانے والی سزاؤں کے خلاف تمام ملک میں شدید ردعمل ہوا۔

1930ء میں کانگریس نے دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سارے ملک میں جب سڑائیکوں، مظاہروں اور سیاسی جلسوں کا آغاز ہوا تو فرقہ واریت کی لہر پھر سے دب گئی۔ سول نافرمانی کی تحریک کے دوران قوم پرست لیڈروں کے اشارے پر ہزاروں طالب علموں نے سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خیر باد کہا۔ ملک کی جیلوں کو آباد کرنے والے ایک لاکھ بارہ ہزار سیاسی قیدیوں میں طالب علموں کی بھی وافر تعداد تھی۔ صرف پنجاب ہی میں اڑہائی سو کے قریب طلبہ گرفتار ہوئے (15) مختلف صوبوں میں جو طالب علم تنظیمیں زیادہ متحرک تھیں ان پر پابندی لگا دی گئی۔ پنجاب سٹوڈنٹس یونین کو بھی غیر قانونی تنظیم قرار دیا گیا۔ کئی طلبہ نے سرکاری سکول کالج چھوڑے اور ملک کے مختلف شہروں میں قائم ہونے والے ان تعلیمی اداروں میں داخلہ لے لیا جنہیں کانگریسی لیڈروں نے کھلوایا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک تواروِن گاندھی معاہدے کے تحت مارچ 1931ء میں ختم کر دی گئی لیکن اس کے بعد تعلیمی اداروں میں یونین سازی کا عمل پھیلتا گیا۔ 1934ء تک ملک کے کئی بڑے شہروں میں تعلیمی اداروں کے اندر سٹوڈنٹس یونینیں وجود میں آ گئیں۔ تاہم تیس کی دہائی میں برصغیر میں تعلیمی اداروں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور شرح خواندگی بھی کم تھی۔ نیز مختلف صوبوں میں شرح خواندگی میں بہت فرق تھا۔ اس دہائی کے تین سالوں کے اعداد وشمار سے اس حقیقت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے صوبوں میں شرح خواندگی (1934-1932)

صوبہ	1934	1933	1932
مدراس	6.5	6.2	6.2

ممبئی	6.3	6.11	6.11
بنگال	5.92	5.71	5.55
یوپی	3.2	3.17	3.13
پنجاب	5.43	5.50	5.61
سی پی	3.11	3.02	2.96
آسام	4.4	4.3	4.32
دیگر علاقے	9.4	9.2	-

(Source: Prabodh Chander, Student Movement in India)

یہ شرح خواندگی واضح کرتی ہے کہ 1934ء تک برصغیر میں آبادی کے اندر طالب علموں کا تناسب بہت کم تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا ملکی سیاست میں حصہ کسی لحاظ سے بھی کم نہ تھا۔

آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام

پہلی کل ہندوستان سٹوڈنٹس کانفرنس اگست 1936ء میں لکھنو میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک ملک گیر طالب علم تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس میں ملک کے مختلف صوبوں سے 986 مندوبین نے شرکت کی۔ ان کا تعلق 210 مقامی اور 11 صوبائی تنظیموں سے تھا۔ جن صوبوں سے نمائندے آئے تھے ان میں پنجاب، یوپی، سی پی، بنگال، آسام، بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔ کانفرنس کے مندوبین نے چار دن کے غور وخوض کے بعد مختلف فیصلے کئے یہاں دو نقطہ نظر سامنے آئے۔ کچھ مندوبین کا اصرار تھا کہ فیڈریشن ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لے، جب کہ بعض دوسرے مندوبین اسے عملی سیاست سے علیحدہ رکھنے کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی اختلافات فیڈریشن کو کمزور کرنے کا باعث بنیں گے۔ بالآخر ایک چار نکاتی پروگرام پر مندوبین کا اتفاق ہوگیا۔ یہ نکات مندرجہ ذیل تھے:

1-فیڈریشن ایک طرف ملک کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کے طلبہ اور دوسری طرف ہندوستانی طلبہ اور دیگر ممالک کے طلبہ کے درمیان ثقافتی اور فکری تعاون کو فروغ دے

گی۔

2-فیڈریشن تعلیمی نظام میں اصلاحات بارے سفارشات مرتب کرے گی۔

3 طلبہ برادری کے مفادات کا تحفظ بھی اس کی ذمہ داری ہو گی۔

4-فیڈریشن طلبہ کو ملک کے مفید شہری بننے میں مدد کرے گی۔ سیاسی سماجی اور معاشی امور کے بارے میں ان کا شعور بلند کرے گی تا کہ وہ مکمل قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل بنیں۔(15)

کانفرنس کے منتظمین نے کوشش کی کہ ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کی اشیر باد حاصل کی جائے۔ چنانچہ سٹوڈنٹس کانفرنس کی صدارت کے لئے مسٹر محمد علی جناح کو اور مہمان خصوصی کے طور پر پنڈت جواہر لال نہرو کو مدعو کیا گیا۔ تاہم ملکی سیاست میں جو تفریق پیدا ہو چکی تھی اس کے اثرات سے یہ کانفرنس محفوظ نہ رہی۔ مسٹر محمد علی جناح نے پنڈت نہرو کو خطاب کی دعوت دیتے ہوئے ان کی ملکی سیاست میں خدمات کو سراہا تھا، تاہم پنڈت نہرو ملک میں موجود کمیونل مسئلے کے بارے میں منفی ریمارکس دینے سے باز نہ آئے۔ اس کے جواب میں صدارتی خطبے میں مسٹر جناح نے کانگریس کو ہندوؤں کی تنظیم کا نام دیتے ہوئے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کمیونٹی قرار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کانفرنس کے منتظمین کے نہ چاہتے ہوئے بھی اجلاس کے دوران ہی طلبہ میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ کانفرنس ختم ہوتے ہی مسلمان طلبہ کے ایک وفد نے مسٹر جناح سے ملاقات کی اور علیحدہ تنظیم قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی قیادت ذہنی اعتبار سے کانگریس کے قریب تر تھی۔ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والوں کا کہنا تھا کہ یہ فی الحقیقت ہندو طلبہ کی تنظیم ہے۔ اگر اس سے مراد یہ لی جائے کہ اس کے دروازے مسلمانوں کے لئے بند تھے تو یہ بات درست نہیں تھی۔ کئی مسلمان طالب علم فیڈریشن سے منسلک تھے۔ فیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کرنے والوں میں یو پی سٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنما بدیع الدین پیش پیش تھے۔ پربودھ چندر نے اپنی کتاب Student Movement in India میں کئی ایک مسلمان طلبہ کی تصاویر دی ہیں جو فیڈریشن کے قیام کے پہلے سال ملک کے مختلف شہروں میں اس کے عہدے دار تھے۔ ان میں جی ایم ڈی ہمدانی صدر آل کشمیر

سٹوڈنٹس فیڈریشن، کے این بامزئی صدر سرینگر سٹوڈنٹس، فیڈریشن ، ایم این ایم بدیع الدین پریذیڈنٹ یوپی سٹوڈنٹس فیڈریشن، انصار ہروانی علی گڑھ، ظفر اللہ کپورتھلہ سٹوڈنٹس یونین، عبدالحئی صدر خیبر یونین صوبہ سرحد اور ظفرعلی طالب علم رہنما راولپنڈی کے نام شامل ہیں۔ فیڈریشن کے قیام میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں بھی کچھ معروف مسلمان سیاسی کارکنوں کے نام آتے ہیں گو ان سب کا تعلق کانگریس سے تھا۔ ڈاکٹر محمد اشرف فیڈریشن کے امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اس دور میں کانگریس کی جانب سے مسلم رابطہ عوام کی تحریک کے انچارج تھے۔ سندھ یونٹ کے قیام میں محمد امین کھوسو نے دوڑ دھوپ کی۔ کھوسو 1938ء میں جیکب آباد سے کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ فیڈریشن کا پروگرام بھی سیکولر تھا۔ اس کی تاسیسی قرارداد میں واضح طور پر تصریح کر دی گئی تھی کہ ''آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کو غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر ایک ایسی فیڈرل تنظیم بنایا جائے گا جو ہندوستان کی تمام طالب علم یونینوں کو اپنے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش کرے گی۔'' ان تمام حقائق کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ فیڈریشن کے متحرک کارکنوں کی بڑی تعداد نیز اس کی مرکزی قیادت ہندو طالب علموں پر مشتمل تھی۔ جو کانگریس کی طرف واضح جھکاؤ رکھتے تھے۔ یوپی کے پریم ناتھ بھارگو کو اس کا پہلا جنرل سیکرٹری چنا گیا جبکہ فیڈریشن کے آرگن Students Tribune کے ایڈیٹر لاہور کے طالب علم رہنما پر بودھ چندر مقرر ہوئے۔ اسی سال نومبر میں جب دوسری آل انڈیا سٹوڈنٹس کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی۔ تو اس کی صدارت کانگریسی رہنما سرت چندر بوس نے کی۔ مدراس میں بلائی جانے والی تیسری آل انڈیا کانفرنس کی صدارت کے لئے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رہنما ایم آر مسانی کا انتخاب کیا گیا۔ اور جب یہاں پر نیشنلسٹ اور سوشلسٹ دھڑوں کی آویزش نے فیڈریشن کے دو ٹکڑے کر دیئے تو اسے ازسرنو متحد کرنے کے لئے بھی ڈاکٹر محمد اشرف اور سبھاش چندر بوس بلائے گئے (16)

کانگریس کے بہت سے لیڈر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرپرست تھے۔ پھر فیڈریشن قائم بھی اس وقت ہوئی جو مسلم لیگ کے پھیلاؤ کا زمانہ تھا۔ محمد علی جناح کانگریس کی قیادت کے رویہ سے مایوس ہو کر متحدہ قومیت کے تصور کو ترک کر کے مسلم نیشنلزم کا پرچار کرنے لگے

تھے۔ مسلمانوں میں بوجوہ یہ تاثر ابھرنا شروع ہو گیا تھا کہ کانگریس ہندو مفادات کی ترجمانی کرتی ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کے مفادات کی ترجمانی کرتی ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کے مفادات کی۔ کانگریس کی حمایت حاصل ہونے کی وجہ سے آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن یک شاخیں جلد ہی ملک میں جا بجا قائم ہو گئیں۔ فیڈریشن کی سندھ برانچ قائم کرنے کے لئے اپریل 1938ء میں کراچی میں ایک سندھ سٹوڈنٹس کانفرنس بلائی گئی۔ اس کے کھلے سیشن کی صدارت معروف کانگریسی رہنما اور ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھولا بھائی ڈیسائی نے کی۔ سندھ فیڈریشن کے قیام میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں مسلمان صرف ایک تھا یعنی محمد امین کھوسو باقی تمام لوگ صوبے کے جانے پہچانے ہندو کانگریسی لیڈر تھے۔ ان میں جے رام داس دولت رام، چوتھ رام گدوانی، جے سنگھانی اور جیٹھی سپاہی ملانی شامل تھے۔ سندھ میں جے رام داس دولت رام کی شناخت بطور متعصب ہندو کے کی جاتی تھی (17) ڈاکٹر گدوانی کانگریس کے صوبائی صدر تھے۔ اسی طرح جیٹھی سپاہی ملانی سندھ کے ممبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھیں اور کچھ عرصے بعد ڈپٹی سپیکر بن گئی تھیں (918۔ چونکہ سندھ میں مسلمان طالب علموں کی تعداد بھی کم تھی اس لئے مسلم اکثریتی صوبہ ہونے کے باوجود فیڈریشن کے بیشتر ارکان بھی ہندو ہی تھے۔ سندھ میں فیڈریشن کی شاخیں کراچی اور حیدر آباد تک محدود رہیں۔

آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نے طلبہ میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے تین طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ایک طرف اس نے مختلف تعلیمی اداروں میں طالب علموں کے مسائل حل کرانے کے لئے جدوجہد کی۔ اس طرح اسے تعلیمی اداروں میں ہونے والی سٹرائیکوں کی حمایت بھی کرنا پڑی جسے کانگریس پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کی قیادت سے بھی بعض اوقات فیڈریشن کے اختلافات پیدا ہوئے۔ جن صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم تھیں ان میں کانگریس کی قیادت خاص طور پر سٹرائیکوں کی مخالفت کرتی تھی۔ (19) دوسری طرح کی سرگرمی اہم بین الاقوامی مسائل کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے فیڈریشن نے نوآبادیاتی ظلم وستم کا شکار

ہونے والے دوسرے ملکوں کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کو خاص طور پر اہمیت دی۔ اس ضمن میں ہندوستان کے کئی شہروں میں جنوبی افریقہ ڈے اور چائینہ ڈے منائے گئے۔ تیسری قسم کی سرگرمی کانگریس کی سیاسی جدوجہد کا ساتھ دینا تھا۔ فیڈریشن نے تعلیمی اداروں کے اندر خواتین کو منظّم کرنے میں بھی حصہ لیا۔ 1938ء میں جب سیاسی اسیروں کی رہائی کی مہم چلی تو بہت سی خواتین نے اس میں نمایاں ہوکر سامنے آئیں۔ ان کی سرگرمی کو بنیاد بناتے ہوئے فیڈریشن نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو منظّم کرنا شروع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ کام اتنا بڑھ گیا کہ لڑکیوں کا علیحدہ شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 1940ء میں فیڈریشن کی متحرک خواتین نے ایک ''ویمن سٹوڈنٹ کمیٹی'' بنانے کا اعلان کیا۔ جس نے اسی سال طالبات کی آل انڈیا کنونشن منعقد کی۔ (20) تاہم فیڈریشن کے قیام کے چار سالوں کے اندر ہی چند ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بناء پر آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن پہلے شدید اختلافات کا شکار ہوئی اور پھر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ان اختلافات کی بنیاد خود کانگریس کی سیاست نے میا کی۔

آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کانگریس کے زیر اثر ہونے کے باعث ان تمام سیاسی گروپوں کی باہمی کشمکش سے متاثر ہوتی تھی جو خود کانگریس کے اندر دست و گریبان تھے۔ کانگریس میں ایک طرف مہاتما گاندھی کی سوچ رکھنے والے لوگ تھے تو دوسری جانب کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کے حامی بھی تھے۔ یہ گروپ کانگریس اکٹھے ہونے کے باوجود کئی معاملات پر ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ 1940ء تک فیڈریشن کے اندر موجود فکر یاد و گروہی جھگڑے پر امن انداز سے حل ہوتے رہے۔ جیسا کہ مدراس کانفرنس کے موقعے پر ہوا جس کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ فیڈریشن اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بھی باہمی مشاورت سے طے کئے گئے وقت پر اور ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔ تاہم دوسری عالمی جنگ چھڑنے کے بعد کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی میں موجود اختلافات میں مزید شدت آ گئی۔ اس کی وجہ دونوں اپرٹیوں کے جنگ کے بارے متضاد رویے تھے۔ کانگریس جنگی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی مخالف تھی۔ اس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی جرمنی اور جاپان کو فاشٹ قوتیں قرار دیتی تھی۔ اس کی نظر میں ان قوتوں کو شکست

دینے کے لئے ہر ایک سے، حتیٰ کہ ملک پر قابض برطانوی حکمرانوں سے بھی، اتحاد کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ 1941ء میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کی فرنٹ آرگنائزیشن بن چکی تھی پٹنہ میں سالانہ اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں کمیونسٹوں نے ''عوامی جنگ'' کے تصور کو مقبول بنانے کی مہم کا آغاز کیا۔ (21) کچھ عرصے کے بعد صورت حال یہ ہوگئی کہ جہاں کانگریس نیز اس کے سوشلسٹ ونگ نے تمام جنگی سرگرمیوں کا بائیکاٹ کیا وہاں کمیونسٹوں نے فوج میں بھرتی ہونے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس اور اس کے سوشلسٹ حامی فیڈریشن سے نکل گئے اور انہوں نے ''آل انڈیا سٹوڈنٹس کانگریس'' کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کر لی۔ ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں فیڈریشن کمزور پڑ گئی۔ اس نے ایک ایسے مختصر گروپ کی شکل اختیار کر لی جس کا طالب علم سیاست میں عمل دخل پہلے سے بہت کم تھا۔ نئی قائم ہونے والی سٹوڈنٹس کانگریس کی سرگرمیاں 1942ء میں نقطہ عروج کو پہنچیں۔ اس سال آل انڈیا کانگریس نے Quit India Movement یا ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ اس تحریک کے دوران پنڈت نہرو، جے پرکاش نارائن اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ برطانوی سامراج پر آخری ضرب لگانے کے لئے کانگریس کا ساتھ دیں۔ چنانچہ سٹوڈنٹس کانگریس کے زیر اثر طلبہ نے تعلیمی اداروں میں وسیع پیمانے پر ہڑتالیں منظم کیں اور جب سینئر لیڈر گرفتار یا روپوش ہوئے تو تحریک کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ انہوں نے زیر زمین کام کرنے والے رہنماؤں اور کانگریسی کارکنوں کے درمیان رابطے کا کام بھی سرانجام دیا۔ غیر قانونی لٹریچر کی تقسیم سے لے کر زیر زمین ریڈیو سٹیشن قائم کرنے تک سبھی کارروائیوں میں سٹوڈنٹس کانگریس کے کارکن آگے آگے تھے۔ (22)

جنگ کے خاتمے کے بعد بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے سٹوڈنٹس کانگریس کے کارکنوں میں مہاتما گاندھی کی پالیسیوں کے بارے میں بددلی پیدا کر دی۔ ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ آل انڈیا کانگریس کے قائدین اقتدار کے حصول کی خاطر موقعہ پرستی کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ یہ بددلی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچی جب 1946ء میں کانگریس کی قیادت نے طلبہ کی توقعات کے برعکس انڈین نیوی میں ہونے والی بغاوت کا

ساتھ دینے سے انکار کر دیا بلکہ باغیوں کو ہتھیار ڈالنے کی ہدایت کی۔ چونکہ سٹوڈنٹس کانگریس کے کارکنوں کی ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ تھیں۔ اس لئے بہت سے طلبہ تنظیم سے علیحدہ ہو گئے۔ آزادی کے حصول کے بعد بھارت میں جب کانگریس حکمران پارٹی بن گئی تو اس نے طالب علموں کو سیاست سے کنارہ کشی کرنے کی ہدایت کی۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پارٹی نے بالآخر 1948ء میں سٹوڈنٹس کانگریس توڑ دینے کا اعلان کر دیا۔(23)

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام دسمبر 1937ء میں کلکتہ میں عمل میں آیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے مسلمان طلبہ کے ایک وفد نے آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے تاسیسی سیشن کے موقع پر محمد علی جناح کے سامنے مسلمان طلبہ کی ایک علیحدہ تنظیم کے قیام کی تجویز رکھی تھی۔ جناح صاحب کے اتفاق کے بعد تجویز کے محرکین نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ علیحدہ تنظیم کے حامیوں میں طرح طرح کے لوگ شامل تھے۔ ان میں قدر مشترک صرف یہ تھی کہ وہ کانگریس کے مخالف تھے اور محمد علی جناح کی قیادت پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔

1934ء میں برطانیہ سے لوٹنے کے وقت جناح صاحب حسب سابق ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسے حالات پیدا ہونے لگے تھے جن کی وجہ سے وہ اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کانگریس مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ کمیونل اوارڈ نے ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے ایک بنیاد فراہم کر دی تھی۔ شرط یہ تھی کہ کانگریس سمجھداری سے کام لے اور اسی بنیاد پر مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

مسٹر جناح 1935ء کے آئین کے خلاف کانگریس کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنا چاہتے تھے لیکن جلد ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ کانگریس مسلمانوں کے کم سے کم مطالبے کو بھی تسلیم کرنے سے گریزاں ہے۔ اسی دوران 1936ء کے انتخابات کا دور آ گیا۔ اب مسلم لیگ کے سامنے اہم ترین کام انتخابی مہم کی تیاری کرنا تھا۔ مسٹر جناح نے فیصلہ کیا کہ

پہلے مسلمانوں کو ایک علیحدہ پلیٹ فارم پر منظم کیا جائے اور جب یہ ایک سیاسی طاقت کی شکل اختیار کر لیں تو پھر کانگریس سے تعاون کی بات آگے بڑھائی جائے۔ یہ مہم جاری تھی کہ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا جہاں پہلے پنڈت نہرو نے اور پھر مسٹر جناح نے ہندو مسلم سوال کے بارے میں اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالب علم دو حصوں میں بٹ گئے۔

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا تاسیسی اجلاس پہلے علی گڑھ اور پھر لکھنو یونیورسٹی میں منعقد کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان دونوں مقامات پر بااثر مسلمان سیاستدانوں اور طالب علم رہنماؤں نے تعاون کرنے سے انکار کیا۔ ابھی کانگریس کی صوبائی حکومتیں نہیں بنی تھیں اور یو پی کے بہت سے مسلمان سیاستدانوں کا خیال تھا کہ متحدہ ہندوستان میں یو پی کی مسلمان اشرافیہ کو حسب سابق مراعات یافتہ حیثیت حاصل رہے گی۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کا مطالبہ ان میں سے اکثر کے لئے ابھی کسی بھی کشش کا باعث نہ تھا۔ 1936ء میں گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی علی گڑھ یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے یونین کی میٹنگ طلب کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ بالآخر نومبر کے مہینے میں یونین کا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کے سامنے مسٹر محمد نعمان نے جو آرگنائزنگ سیکرٹری تھے اپنی تجویز ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کی۔ اس بات کے مدنظر کہ مسلمان طلبہ کے ایک حصہ میں اس وقت ہندوستانی قوم پرستی کا جذبہ غالب تھا یہ ریزولیوشن خاصے محتاط الفاظ میں تحریر کیا گیا تھا۔ اور یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ نئی تنظیم کا مقصد کسی طرح سے بھی آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔ اس ریزولیوشن کی عبارت مندرجہ ذیل تھی۔ (24)

”علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ کل ہندوستان سطح پر مسلمان طلبہ کی ایک مرکزی تنظیم قائم کی جائے۔ جس کا نام آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہو تاکہ مسلمان طلبہ کو تمام یونیورسٹیوں، کالجوں اور صوبوں میں ایک ایسا پلیٹ فارم میسر آسکے جو ان کے سماجی تعلقات میں قربت پیدا کرے، ان کے درمیان بہتر ثقافتی، سیاسی اور معاشی اور مذہبی مفاہمت پیدا کرنے کا موجب بنے، ان میں باہمی رشتہ کا گہرا احساس پیدا کرے اور انہیں اس قابل بنائے کہ وہ مل جل کر آل انڈیا سٹوڈنٹس

فیڈریشن کی سرگرمیوں میں زیادہ موثر اور فائدہ مند انداز سے حصہ لے سکیں۔''

ریزولیوشن کے مجوز نے مزید کہا کہ '' ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مجوزہ تنظیم کی بنیاد کوئی ایسا اصول یا مقصد نہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ملک میں موجود اسی طرح کی کسی دوسری تنظیم کی بلا اشتعال مخاصمت پر مبنی ہو۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ مجوزہ تنظیم کی تخلیق کی خاطر کوئی بھی قدم اٹھانے سے پیشتر مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں اور صوبوں کے مسلمان طلبہ کی رائے لینا ضروری ہے۔''

ریزولیوشن کے آخر میں کہا گیا تھا کہ:

'' اگر مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں اور صوبوں کے مسلمان طلبہ اس تجویز کی حمایت کا فیصلہ کریں تو ایسے اقدامات جلد از جلد عمل میں لائے جائیں جن کا مقصد مجوزہ تنظیم کی بنیاد رکھنے کے مقصد کے لئے علی گڑھ میں میٹنگ بلانا ہو۔''

ریزولیوشن پیش کرتے ہی یونین کے اجلاس میں اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ طلبہ کے ایک حصے نے اسے رجعت پسندانہ اور فرقہ واریت پر مبنی تجویز قرار دے دیا۔ چونکہ ایوان میں اجلاس شروع ہوتے ہی شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا، اس لئے جونہی تجویز پیش ہوئی ہال میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ کسی نے حمایت میں شور مچایا تو کسی نے مخالفت میں۔ بالآخر مسٹر نعمان نے اس تاثر کے مد نظر کہ اس قسم کا ماحول مقصد کے حصول کے لئے مناسب نہیں، ریزولیوشن واپس لے لیا۔ اس زمانہ میں ملک بھر میں انتخابات کی گہما گہمی کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے ایک حصے نے کانگریس سے امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ ان میں مسلمان اشرافیہ کے علاوہ کئی ایک جید علماء بالخصوص جمعیت علمائے ہند سے وابستہ نیشنلسٹ علماء بھی شامل تھے۔ علی گڑھ سے مایوس ہو کر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حامیوں نے لکھنو میں طلبہ کانفرنس طلبہ کرنے کی سوچی۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل علامہ عبد اللہ یوسف علی کو کانفرنس کی صدارت کی دعوت دی گئی۔ علامہ صاحب کا تعلق جنوبی ہند سے تھا اور وہ ان مٹھی بھر مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے آئی سی ایس تک رسائی حاصل کی تھی۔ ان کی ملک میں وجہ شہرت ان کا انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ تھا۔ اس وقت علامہ صاحب اسلامیہ کالج لاہور کی پرنسپل کے عہدہ پر فائز تھے۔ دعوت کا اعلان ہوتے ہی مخالفین

نے خطوط اور اخباری بیانات کے ذریعے عبداللہ یوسف علی کی حوصلہ شکنی شروع کر دی۔ انہیں باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ متنازعہ کانفرنس کو مسلمان طلبہ کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ انگریزی روزنامہ Tribune میں چھپنے والے ایک خط میں کہا گیا:

''ہم ہندوستان کے طلبہ ایک متحد کمیونٹی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ایک سے دو اور دو سے تین گروہوں میں تقسیم کرنے کے حامی نہیں۔ بطور طلبہ ہمارا ایک مقصد، ایک آدرش، ایک منزل اور ایک پروگرام ہے۔''(25)

علامہ کے نام ایک اور خط میں وہی دلائل دہرائے گئے جو اس دور میں کانگریسی مسلمان بالعموم پیش کیا کرتے تھے۔ کہا گیا تھا کہ:

''مسلمان آخر احساس کمتری کا شکار کیوں ہوں؟ ہم کیوں نہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو کر اس پر قبضہ کر لیں تاکہ ہماری آواز زیادہ بہتر انداز سے سنی جائے؟ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ ہم کسی بھی پلیٹ فارم پر اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم وہاں زیادہ تعداد میں جانے کی زحمت گوارا کریں۔ ہندو طلبہ کا تعداد میں زیادہ ہونا ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ عام ہندو طالب علم نہ ہم سے بہتر ہے اور نہ زیادہ لبرل۔ اس لئے ہمیں اس سے یا اس کی نیت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

18 جولائی 1936ء کو صدر لکھنو یونیورسٹی یونین انور جمال قدوائی کا بیان اخبارات میں چھپا جس میں کہا گیا تھا:

''مجھے بعض اخبارات کے ذریعے اطلاع ملی ہے کہ لکھنو یونیورسٹی کے طلبہ ایک آل انڈیا سٹوڈنٹس کنونشن بلا رہے ہیں۔ میں یہ خط اس رپورٹ کی تردید کرنے کی غرض سے تحریر کر رہا ہوں۔ لکھنو یونیورسٹی کے طلبہ کا اس کاروائی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ ان خطوط پر سوچنا ہی بند کر چکے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا اس طرح کی کانفرنس سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ مسلمان طلبہ کی کسی علیحدہ تنظیم کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ بات باعث شرم ہے کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے منتظمین بعض ایسے خود غرض عناصر اور افسر شاہی کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے ہیں جن

کا مفاد فرقہ واریت کی شرارت کو فروغ دینے میں ہے۔''

ابھی کانفرنس منعقد کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نے لکھنو میں مسلمان طلبہ کا ایک کنوینشن طلب کر لیا جس کا مقصد MSF کے قیام کے لئے کی جانے والی سرگرمیوں کی مخالفت کرنا تھا۔ اس کنوینشن میں جو اگلے سال یکم جنوری کو منعقد ہوا دینی مدارس کے طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ان میں ندوہ، فرنگی محل مدرسہ اور دیو بند کے طلبہ پیش پیش تھے۔ کنوینشن میں مسلمان طلبہ کی علیحدہ تنظیم کی مخالفت میں تقریر کرنے والوں میں ممتاز عالم دین مرحوم مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے فرزند مولانا جمال میاں فرنگی محلی سرفہرست تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ فرقہ وارانہ تنازعات عہدے داریوں کے جھگڑوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے مسلمان طلبہ سے اپیل کی کہ وہ خودغرض عناصر کی وجہ سے گمراہ نہ ہوں اور فرقہ واریت کی مخالفت کریں خواہ وہ کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش کیا اس کے یہ الفاظ تھے:

''مسلمان طلبہ کو علیحدہ پلیٹ فارم پر منظّم نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے۔''

ایک اور ریزولیوشن میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ ریزولیوشن علی سردار جعفری نے پیش کیا تھا اور اس میں مسلمان طلبہ پر زور دیا گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کریں۔ کانفرنس کے آخری ریزولیوشن میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کے حالیہ فیصلہ کو سراہا گیا تھا۔ ان طلبہ کو اس بات پر مبارکباد پیش کی گئی تھی کہ انہوں نے فرقہ واریت کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ آخر میں مولانا جمال میاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے منتظمین کی مذمت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ انہیں دراصل خبر نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔'' انہوں نے طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ غلط اور صحیح میں نیز دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا سیکھیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر فرقہ واریت کو طلبہ میں بھی پھیلنے کی اجازت دی گئی تو ملک کا

مستقبل تاریک ہو گا۔ انہوں نے مسلمان طلبہ سے اپیل کی وہAISF میں شمولیت اختیار کریں۔

بالآخر 17 جنوری 1937ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تشکیل کے لئے لکھنو میں کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی جنہیں صدارت کے لئے دعوت دی گئی تھی تشریف نہ لائے۔ چنانچہ بیرسٹر مشیر حسین قدوائی رکن آل انڈیا مسلم لیگ کو کرسی صدارت پیش کی گئی۔ مخالفین نے اس کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی تیاریاں پہلے ہی کر رکھی تھیں۔ دینی مدارس کے طلبہ حملہ میں سب سے آگے تھے۔ سیشن جاری تھا کہ ندوہ اور فرنگی محل مدرسہ کے طلبہ بڑی تعداد میں منتظمین کو دھکے دیتے ہوئے ہال میں داخل ہو گئے۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے مشیر حسین قدوائی نے علالت کا بہانہ کیا اور جلسہ گاہ سے رخصت ہو گئے۔ ان کا خطبہ صدارت کسی اور شخص نے پڑھ کر سنایا۔ روزنامہ ٹریبیون کی رپورٹ کے مطابق خطبہ میں کہا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتے جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تنظیم سازی کے حامی ہیں۔ جب منتظمین نے سیشن کو شام تک ملتوی کرنے کا اعلان کیا۔ تو مدارس کے طلبہ نے احتجاج کیا اور اعلان کیا کہ وہ نیا صدر منتخب کر کے اجلاس کی کاروائی جاری رکھیں گے۔ انہوں نے علی گڑھ کے ایک طالب علم کا نام صدارت کے لئے تجویز بھی کر دیا۔ اس پر کنوینز نے ہال میں پولیس طلب کر لی۔ اسی ہنگامے کے دوران لکھنو یونیورسٹی کے انور جمال قدوائی نے سٹیج پر چڑھ کے تقریر کر ڈالی جس میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تخلیق کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔

کنوینشن کے منتظمین نے شام کے وقت اپنا سیشن منعقد کیا جس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے آل انڈیا مسلم لیگ سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ طے کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے ایک آل انڈیا کانفرنس بلائی جائے۔ درمیانی عرصے میں کام چلانے کے لئے بنگال کے محمد وثیق کو جنرل سیکرٹری اور محمد نعمان کو آرگنائزنگ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس دوران مخالفین کا پراپیگنڈہ جاری رہا۔ جمعیت علمائے ہند کے ترجمان ''الجمعیت'' نے 24 جنوری کو ایک اداریہ میں لکھا:

'ہمیں تعجب ہے کہ مسلمان طلبہ جو ملک کی سیاسی فضا، سیاسی رجحانات اور وقت

کی اہم ضروریات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن سے ٹوٹ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رہے ہیں اور کس طرح ایسے رجعت پسند عناصر کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں جنہوں نے شخصی مفادات اور دنیاوی تشکیلات کے سلسلے میں جو توقعات ان کے سامنے پیش کی ہیں وہ محض دھوکہ ہیں، فریب ہیں، سراب ہیں اور ایسی آرزوئیں ہیں جو انہیں ساحل مراد تک نہیں پہنچائیں گی بلکہ نکبت و ذلت اور نزول و پستی کی چٹان سے ٹکرا دیں گی۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ جو مسلم طلبہ مسلم فیڈریشن کی تشکیل چاہتے ہیں یہ ان کے ضمیر کا فیصلہ اور ان کی فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ پرستاران حکومت کے چشم و ابرو کا اشارہ ہے۔ اور وہ ملک و ملت اور قوم وطن کے اعلیٰ مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنی ذاتی اغراض کے لئے قوم فروشی وضمیر فروشی کے لئے آمادہ ہیں۔'' (26)

بالآخر اجلاس کے لئے کلکتہ کا انتخاب کیا گیا۔ بنگال میں مسلمان طلبہ کی ایک تنظیم پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس لئے اس شہر میں فیڈریشن کو بہت سے کارکن دستیاب تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنے والے بہت سے بنگالی طلبہ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن سے علیحدگی اختیار کر کے آئے تھے۔ بنگال میں موجود ایک بااثر سیاسی دھڑے نے حال ہی میں مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ اس دھڑے نے جس کی قیادت حسین شہید سہروردی کے پاس تھی۔ کنونشن 28-27 دسمبر 1937ء کو بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں منعقد ہوا۔ تاسیسی اجلاس کی صدارت کے لئے علامہ اقبال کو دعوت دی گئی تھی لیکن انہوں نے بیماری کی وجہ سے معذرت کی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اجلاس کی صدارت کے لئے محمد علی جناح سے درخواست کی جائے۔

28 دسمبر کو آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کی صدارت مسٹر جناح نے کی۔ انہوں نے خطبہ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے انہیں تحفظات مہیا کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس نے گزشتہ پانچ چھ سال کے عرصے میں اپنے پروگرام سے اقلیتوں کے لئے تحفظات کا بنیادی نکتہ خارج کر دیا ہے۔ جیسے کہ اس مسئلہ کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ انہوں نے ان رپورٹوں پر بھی تشویش کا اظہار کیا جن میں بتایا گیا تھا کہ بعض طالب علم تنظیمیں محض مذہبی بنیاد پر مسلمان طلبہ کو اپنی

ورکنگ کمیٹیوں سے خارج کر رہی ہیں۔

فیڈریشن کے اجلاس میں بہت سی قرار دادیں پاس کی گئیں جن میں سے دو خاص طور پر اہم ہیں۔

1- مسلمانوں نیز دیگر اقلیتوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مناسب گارنٹیاں فراہم کرتے ہوئے ہندوستان کو ایک جمہوری اور وفاقی نظام کے تحت مکمل آزادی دی جائے۔

2- اجلاس نے ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی حکومتیں قائم تھیں مسلمانوں کو اسلام کے اثر سے نکالنے کی کوششوں کی مذمت کی۔

اجلاس میں فیڈریشن کے آئین کی منظوری بھی دی گئی۔ آئین کی شق 2 کے مطابق فیڈریشن کے مندرجہ ذیل مقاصد متعین کئے گئے۔

1- ہندوستان کے مسلمان طلبہ کو خود مختار صوبائی اکائیوں کی شکل میں ایک تنظیم میں منسلک کرنا اور مسلمان طالب علم برادری کے مفادات کا تحفظ کرنا۔

2- مسلمان طلبہ میں سیاسی شعور بیدار کرنا۔ انہیں ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مناسب حصہ لینے کے لئے تیار کرنا۔

3- مسلمانوں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لئے کام کرنا۔

4- مسلمان طلبہ میں اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینا، اسلام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دین اسلام کی مضبوطی کے لئے کام کرنا۔

5- ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنا۔

6- ہندوستان کے مسلمان طلبہ اور دیگر مسلم ممالک کے طلبہ کے درمیان تعاون کو فروغ دینا۔

صدر کے طور پر کسی طالب علم کا انتخاب کرنے کی بجائے یہ ذمہ داری مسلم لیگ کے رہنما راجہ صاحب محمود آباد کو سونپی گئی۔ اس کی وجہ غالب یہ تھی کہ اس وقت کوئی بھی ایسا مسلمان طالب علم رہنما موجود نہ تھا جو ملکی سطح پر متعارف ہو۔ راجہ صاحب محمود آباد آئندہ کئی سال تک مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔ محمد نعمان کا جنرل

سیکرٹری کے طور پر چناؤ ہوا۔ ''بیداری'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اگلے چند سالوں میں ہندوستان کے ان تمام صوبوں میں جہاں مسلم لیگ موجود تھی فیڈریشن کی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ ان میں تمام مسلمان اکثریتی صوبے اور بیشتر اقلیتی صوبے شامل تھے۔ (27)

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مسلمان عوام تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لئے اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح سے اس نے مسلمان طلبہ میں کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف مہم چلائی۔ فیڈریشن نے وہ ایشو خاص طور پر اٹھائے جو علیحدہ مسلم تشخص مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوتے تھے۔ اس وقت مسلم لیگ کے ایجنڈے پر سب سے اہم بات بھی یہی تھی۔ کانگریس بالعموم مسلم لیگ پر فرقہ وارانہ رجحانات کو تقویت دینے کا الزام لگاتی تھی۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا کہ جب کانگریس ہندوستانی تشخص کے نام پر ہندو ثقافت کو فروغ دیتی ہے تو اس وقت اس پر یہی تنقید کیوں نہیں کی جاتی۔ ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں ہندو آبادی اکثریت میں تھی تعلیمی اداروں میں ہندو مذہبی اور ثقافتی علامات کا استعمال عام تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کریسٹ پر سری اور پدما بنے ہوئے تھے، صوبہ سی پی میں ودیا مندر سکیم کا اجرا کیا گیا تھا، ناگپور یونیورسٹی کی کریسٹ بھی کئی مسلمانوں کی نظر میں غیر اسلامی تھی، ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں سکولوں کی انتظامیہ کو ہدایت تھی کہ بچے صبح سویرے پڑھائی کا آغاز کانگریس کے ترانہ ''بندے ماترم'' سے کریں۔ بعض اداروں میں کانگریس کے جھنڈے کو یا مہاتما گاندھی کی تصویر کو سلامی پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ مدراس پریذیڈنسی کی کانگریسی وزارت ہندی زبان کو لازمی مضمون قرار دینے کے درپے تھی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا مطالبہ تھا کہ یہ تمام اقدامات مسلمان طلبہ کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں اس لئے ان کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ (28)

1940ء میں قرار داد پاکستان پاس ہو جانے کے بعد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔ مئی 1943ء میں اس کی ایک شاخ بلوچستان میں بھی قائم ہو گئی۔ یہاں اس وقت صرف ایک ہائر سیکنڈری سکول تھا جس میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دی جاتی تھی۔ خیر محمد ترین بلوچستان شاخ کے پہلا صدر اور نذر محمد زاہد پہلے سیکرٹری مقرر

ہوئے۔ جون میں مسٹر جناح نے بلوچستان کا دورہ کیا تو فیڈریشن کے ارکان جلوس کی شکل میں انہیں ریلوے سٹیشن سے شہر لائے۔ مسٹر جناح نے فیڈریشن کے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ لوگ طالب علم ہیں آپ کا اولین فرض اپنی اور دوسرے بھائیوں کی تعلیم ہے۔'' تاہم انہوں نے یہ بھی کہا ''تعلیم کا مقصد صرف کورس کی دو چار کتابیں پڑھ لینا نہیں بلکہ تعلیم حاصل کرنے والے شخص کو کم از کم اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔''(29)

صوبہ سرحد میں بھی 1943ء تک فیڈریشن کی شاخ قائم ہو چکی تھی۔ یہاں مسلم لیگ کا مقابلہ عبد الغفار خان کے خدائی خدمت گاروں سے تھا جو کانگریس سے تعاون کر رہے تھے۔ خدائی خدمت گار تحریک نوجوانوں میں بھی اثر رکھتی تھی۔ اس لئے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا کام اتنا آسان نہیں تھا۔ تاہم مسلم لیگ کے اثرات رفتہ رفتہ صوبہ میں پھیل رہے تھے۔1945ء میں مسٹر جناح پشاور گئے تو ان کا طلبہ نے پر جوش استقبال کیا۔ یہاں انہیں تین دنوں میں تین مختلف مقامات پر طلبہ سے خطاب کا موقعہ ملا۔ اسلامیہ کالج میں تقریر کے دوران انہوں نے پاکستان کے قیام کی فوائد پر روشنی ڈالی، صوبہ میں لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر اطمینان کا اظہار کیا اور طلبہ سے اپیل کی کہ وہ پارٹی کے امیدواروں کو آنے والے انتخابات میں کامیاب کرائیں۔ شام کو انہوں نے سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں سے خطاب کیا اور اس سے اگلے دن ایڈورڈز کالج کے طلبہ کی تقریب میں تقریر کی۔

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن مرکزی تنظیم کے قیام سے چند ماہ پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی۔ بعض مخصوص وجوہات کی بنا پر پنجاب ہی میں اسے مستقبل میں سب سے زیادہ سرگرم عمل ہونا تھا۔ خود مسلم لیگ کو بھی سب سے زیادہ اسی صوبے میں ایک ایسی طالب علم تنظیم کی ضرورت تھی جو اس کے کام کو پھیلانے میں مددگار ثابت ہو۔ تقسیم ہند سے قبل مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں میں درمیانہ طبقہ بہت ہی مختصر تھا۔ تاہم پنجاب میں یہ باقی صوبوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تھا۔ پنجاب کے کئی شہروں میں درمیانہ طبقے کے مسلمانوں نے پچھلی صدی کے آخر میں اپنی کمیونٹی کی تعلیمی ضروریات پورا کرنے کے لئے تنظیمیں قائم

کرنا شروع کر دی تھیں۔ ان میں مجلس اسلامیہ امرتسر (قیام1873،نو سال بعد نام انجمن اسلامیہ امرتسر) اور انجمن حمایت اسلام لاہور (قیام 1884) نے خاص طور پر نادار اور درمیانہ طبقہ کے مسلمان طلبہ کے لئے سکول اور کالج کھولنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انجمن اسلامیہ امرتسر نے مسلمان طلبہ کے لئے ایک سکول1879ء میں قائم کیا جو1885ء تک انٹر کالج اور1933میں ڈگری کالج بن گیا۔ اسی طرح انجمن حمایت اسلام لاہور نے کئی ایک سکول اور کالج قائم کئے۔ انجمن حمایت اسلام نے1892ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی بنیاد رکھی۔ قیام پاکستان سے پہلے پنجاب کے کئی دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے جہاں ایسے مسلمان طلبہ جو بالائی طبقات کے لئے مخصوص کالجوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔

پنجاب میں ابھرنے والی یہ مسلمان مڈل کلاس سیاسی نمائندگی حاصل کرنے کی خواہشمند تھی۔ اس میں سے تھوڑے سے افراد آل انڈیا کانگریس میں گئے لیکن بہت سے پنجاب میں بڑھتے ہوئے ہندو مسلم تضاد اور صوبے میں کانگریس کی کمزور پوزیشن کی بنا پر کسی اور پلیٹ فارم کی تلاش میں رہے۔ مسلم لیگ کا حال کانگریس سے بھی خراب تھا۔ اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں پنجاب کی سیاست جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے کنٹرول میں تھی۔ سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی شکل میں ایک ایسی تنظیم قائم کر دی تھی۔ جس میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے زمیندار شامل تھے۔ شہری آبادی سے تعلق رکھنے والوں کے لئے اس پارٹی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلم لیگ ابھی اس قابل نہیں تھی کہ یونینسٹ پارٹی کا زور توڑ سکے۔1937ء کے آغاز میں جب صوبائی انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو صرف دو حلقوں میں کامیابی نصیب ہوئی۔ ایک ملک برکت علی کا حلقہ اور دوسرا راجہ غضنفر علی کا۔ ان میں سے بھی راجہ صاحب (بقول خود جناح صاحب کی اجازت سے) منتخب ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس صورت حال سے پنجاب کے کئی مسلمان طلبہ ناخوش تھے اور تیس کی دہائی کی ابتدا ہی سے ان مخصوص اہداف کے حصول کے لئے طلبہ کی علیحدہ تنظیمیں بنا رہے تھے جو اس وقت مسلمان مڈل کلاس کا مطمع نظر تھے۔ اس طرح کی ایک تنظیم "Muslim IInter-collgeiate Brotherhood" کے نام

سے 1930 میں قائم ہوئی تھی۔ یہی سوچ آگے چل کے ایم ایس ایف کے قیام کا سبب بنی۔ کچھ طلبہ نے یکم ستمبر 1937ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے سٹاف روم میں نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا۔ عارضی طور پر مندرجہ ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

صدر حمید نظامی

نائب صدر میاں محمد شفیع (م۔ش)

سیکرٹری عبدالسلام خورشید

ورکنگ کمیٹی کے لئے جن لوگوں کا انتخاب ہو اور یہ تھے: ملک محمد اختر، عبداللہ بٹ، میاں بشیر احمد۔ (30) ایم ایس ایف کے پر جوش کارکنوں نے اگلے تین ماہ میں پنجاب کے مختلف شہروں میں 16 شاخیں قائم کر ڈالیں۔ یکم دسمبر کو عارضی بندوبست کی جگہ نئے انتخابات منعقد ہوئے تو صرف ایک تبدیلی آئی۔ ناعب صدر کے عہدے پر م۔ش۔ کی جگہ ذکی الدین پال اور سید مخدوم عباس منتخب ہوئے۔ ایم ایس ایف کے ابتدائی دور کے کئی کارکن بعد میں مختلف حوالوں سے محروف ہوئے مثلاً عبداللہ ملک اور ظہور عالم شہید بطور صحافی کے، شیخ انوارالحق بطور چیف جسٹس کے، سید قاسم رضوی بطور سول سرونٹ کے اور آفتاب قرشی بطور صنعتکار کے۔

پنجاب میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اصل کام 1940 کے بعد شروع ہوا۔ لاہور ریزولیوشن تو پاس ہوگیا تھا مگر صوبائی لیگ اس قابل نہ تھی کہ اسے عوام میں مقبول کرانے کے لئے کوئی مہم چلا سکے۔ برطانوی راج ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس لئے صوبے کے تمام جاگیردار ابھی یونینسٹ حکومت میں ہی شامل تھے۔ علامہ محمد اقبال نے چند سال پہلے مسٹر جناح سے ملاقات میں کہا تھا" اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔" (31) پنجاب میں مسلم لیگ کمزور تھی اور اسے آبادی کے کسی مضبوط سیکشن کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ لیگ میں درمیانہ طبقے کے گنے چنے افراد شامل تھے اور ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے لئے یہ طلبہ سب سے بڑا سرمایہ تھے۔

پاکستان کے تصور کو عام کرنے کے لئے ایم ایس ایف نے مختلف شہروں میں

کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں جن میں ہر ایک کو شرکت کی دعوت تھی۔ 2مارچ1941 کو ایم ایس ایف نے لاہور میں ایک خصوصی پاکستان کانفرنس کا اہتمام کیا جس کی صدارت مسٹر جناح نے کی۔ کانفرنس کا بندوبست اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ طالبات کی ایک معقول تعداد نے بھی شرکت کی۔ فیڈریشن کا طالبات کا سیکشن چار خواتین کے سپرد کیا گیا: لیڈی عبد القادر، سلمیٰ تصدق حسین، فاطمہ بی بی اور مس ایم قریشی۔ کانفرنس نے لیگ کا پیغام دیہات تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی۔

5جولائی کو فیڈریشن نے لائلپور میں ایک کانفرنس منعقد کی تاہم یہاں منتظمین کو خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کانفرنس میں انہوں نے پنجاب حکومت کے سربراہ سرسکندر حیات کو جو اس وقت یونینسٹ پارٹی کے بھی رہنما تھے صدارت کی دعوت دی تھی۔ بجائے اس کے کے صدر مجلس پاکستان کے تصور کی حمایت کرتے جس کے لئے کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں پاکستان کے مطالبہ کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیئے۔ ''کون سا پاکستان چاہتے ہیں آپ؟ اس وقت پاکستان کے چار تصور بازار میں موجود ہیں۔ ایک وہ ہے جس کا خاکہ جمال الدین افغانی نے پیش کیا تھا۔ دوسرا وہ ہے جسے علامہ اقبال نے پیش کیا۔ تیسرا وہ ہے جو چودھری رحمت علی کی صنعتکاری کا نمونہ ہے اور چوتھا ہے وہ جو ایک انگریز کی اختراع ہے۔ آخر ان چاروں میں سے کون سا پاکستان آپ مانگتے ہیں؟'' (32) نتیجہ یہ ہوا کہ جو جلسہ پاکستان ریزولیوشن کی حمایت کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا وہ کنفیوژن میں ختم ہوا۔ اس ناکامی کا مداوا کرنے کے لئے فیڈریشن نے 20جولائی کو پنجاب مسلم لیگ کے صدر ملک برکت علی کی صدارت میں اسی جگہ پھر ایک جلسہ کا اہتمام کیا جہاں انہوں نے سرسکندر کے اعتراضات کا ایک ماہر وکیل کی طرح جواب دیا۔

اجلاس کے آخر میں کانفرنس نے مندرجہ ذیل قرار دادیں پاس کیں:

1-لائیل پور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی پاکستان کانفرنس قائداعظم کی قیادت پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ ہندوستان میں اگر کوئی گروپ یا پارٹی مسلمانان ہند کی دوستی کی متمنی ہے تو اسے پہلے قائداعظم سے معاملہ طے کرنا ہوگا۔ قائداعظم ہی اتھارٹی کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں

اور مسلمان ہند کی جانب سے کوئی وعدہ کر سکتے ہیں۔

2-پاکستان کانفرنس کا یہ اجلاس سر سکندر کے ان ناروا جملوں سے برائت کا اظہار کرتا ہے جو انہوں نے 5 جولائی کی تقریر میں کہے تھے اور ان کے اس بیان کی جو قطعاً خلاف حقیقت ہے سختی سے تردید کرتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے مطالبے کے پس پشت علاقے میں بسنے والی غیر مسلم اقلیتوں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان پر جبر کرنے کی خواہش کار فرما ہے۔ یہ کانفرنس تمام غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ پاکستان کے اندر مکمل برادری اور بھائی چارے کے ساتھ اکٹھا رہنے کے خواہشمند ہیں۔ کانفرنس یہ بھی اعلان کرنا چاہتی ہے کہ قیام پاکستان کے پیچھے جو واحد تصور ہے وہ خود ارادیت کا تصور ہے۔ جس سے نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ ہندو قوم بھی بہرہ یاب ہو گی۔ اس کے پیچھے یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ ملک حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو اور آزاد اور خود مختار ممالک میں حقیقی طور پر قابل عزت مقام حاصل کرے۔

3-یہ اجلاس واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر حکومت برطانیہ ہٹلر کی تاریک قوت کے خلاف جنگ میں (جو اس کے لئے زندگی اور موت کی جنگ میں تبدیل ہو چکی ہے) صرف چند افراد کا ہی نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی تمام مسلمان قوم کا تعاون حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قائداعظم کا اعتماد حاصل کرے اور انہیں مسلم قوم کے مستقبل کے بارے میں ضروری یقین دہانیاں فراہم کرے تاکہ تمام شکوک وشبہات رفع ہوں اور مسلمان بطور فرزندانہ اسلام اپنا فریضہ ادا کر سکیں۔ نیز مسلمان اور ہندو اقوام اپنی حکومتیں اپنی اپنی اور تاریخی روایات اور ثقافتی ورثہ کی روشنی میں چلا سکیں۔(33)

اگلے پانچ سال کے دوران مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے مرکزی قائدین نے پنجاب ایم ایس ایف کی کانفرنسوں میں باقاعدگی کے ساتھ شمولیت کی۔ کسی دوسرے صوبے کی طالب علم تنظیم کو اس قدر وقت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو پنجاب کے یونینسٹوں کے قلعے میں شگاف ڈالنے کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے کسی صوبے میں طالب علموں سے یہ کام لینا ممکن نہ تھا۔ فیڈریشن کا دوسرا سالانہ اجلاس اگلے سال 8-7 مارچ کو راولپنڈی میں

ہوا۔ صدارت چوہدری خلیق الزمان نے کی جو یوپی میں مسلم لیگ کے رہنما تھے۔ مقررین میں حمید نظامی اور نفیس خلیلی کے علاوہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی تھے جو اب مسلم لیگ میں آ چکے تھے۔ دوسرے سیشن کے مقررین میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، سردار اورنگ زیب خان اور فاطمہ بیگم تھیں۔ اسی سال جب آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ سیشن جالندھر میں ہوا تو مسٹر جناح پھر اس کی صدارت کے لئے تشریف لائے۔ ان کے علاوہ ایم ایچ اصفہانی اور قاضی محمد عیسیٰ بھی جلسہ میں موجود تھے۔

مسلم ویمن سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام

مسلم ویمن سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام شائستہ اکرام اللہ کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ شائستہ جو حسین شہید سہروردی کی رشتہ میں کزن بھی تھیں۔ دہلی میں قیام کے دوران مسلم لیگی خواتین کی سیاست میں سرگرم ہوئیں۔ اس وقت ان کی شادی مسٹر اکرام اللہ سے ہو چکی تھی جو برٹش سول سروس کے رکن تھے اور اس وقت ملازمت کے سلسلہ میں دہلی میں مقیم تھے۔ بعد میں یہی اکرام اللہ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ مقرر ہوئے۔

شائستہ اکرام اللہ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اس تنظیم کے وجود میں آنے کا قصہ بیان کیا ہے۔ (34) ان کا کہنا ہے کہ اس دور میں ہندو مسلم سوال نے سیاسی ماحول میں اس قدر تناؤ پیدا کر دیا تھا کہ مسلمان اور ہندو کمیونٹی کے اندر پیدا ہونے والی معمولی شکایتیں اور رنجشیں بھی اہمیت اختیار کر جاتی تھیں۔ دہلی کے ایک کالج کی تین لڑکیاں ان کے پاس مسلمان طالبات کی علیحدہ تنظیم کی تجویز لے کر آئیں۔ ان لڑکیوں کو شکایت تھی کہ ان کے کالج میں ایک ڈراما پیش کیا گیا جس میں مسلمان بادشاہوں کو ظالم اور متعصب دکھایا گیا تھا۔ ان لڑکیوں نے جب جوابی کاروائی کے طور پر اپنی طرف سے ایک ڈرامہ پیش کرنے کی تجویز دی تو پرنسپل نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ یہ فرقہ وارایت پھیلانے کی بات ہے۔ اس طرح سے ان لڑکیوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ کانگریس کے قرار داد آزادی پاس کرنے کے دن کی تقریبات میں شرکت کریں جو 26 جون کو منایا جاتا تھا۔ لیکن جب انہوں نے 23 مارچ کو یوم قرار داد پاکستان منانا چاہا تو انہیں اس سے روک دیا گیا۔ اب اس قسم کی باتیں غیر اہم دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن بیگم اکرام اللہ کے بقول نومبر 1941ء میں ان لڑکیوں

کے اعتراضات معمولی نہیں لگتے تھے۔'' مجھ میں بھی انہیں کی طرح کی ناراضگی نے جنم لیا۔ اور میں نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے مسلمان لڑکیوں کی علیحدہ تنظیم قائم کرنے میں ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔'' آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری مسٹر نعمان سے مشورہ کے بعد طے کیا گیا کہ نئی تنظیم لڑکوں کی تنظیم کا ہی ایک حصہ ہوگی اور اس کے صدر بھی راجہ صاحب محمود آباد ہی ہونگے۔ شائستہ اکرام اللہ اس کی سیکرٹری ہوں گی۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ تنظیم کی تاسیسی کانفرنس اگلے سال فروری کے مہینے میں دہلی میں منعقد ہوگی۔ اس کے لئے لاہور، علی گڑھ، لکھنو، میرٹھ اور ناگپور دعوت نامے ارسال کئے گئے۔ دہلی کی بے شمار مسلمان خواتین کو خاص طور پر کنونیشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کے باوجود جب کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں شرکاء کی تعداد اتنی کم تھی۔ کہ وہ تمام کے تمام ہال کی پہلی تین قطاروں میں بآسانی سما گئے۔ لاہور سے آنے والی ڈیلی گیشن کی قیادت فاطمہ بیگم کر رہی تھیں۔ جو خواتین کے حقوق کی جدوجہد میں بڑا مقام رکھتی تھیں۔ توقع کی جا رہی تھی کہ مس جناح تاسیسی اجلاس کی صدارت کریں گی لیکن ان کی طبیعت عین موقع پر ناساز ہوگئی۔ ان کی جگہ بیگم اعزاز رسول نے جلسہ کی صدارت کی۔ بیگم اکرام اللہ کا کہنا ہے کہ ابھی مسلمان خواتین میں سیاسی شعور پیدا نہ ہوا تھا۔ تاہم جلد ہی یہ بہت تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ جب مارچ 1947ء میں قائداعظم کی صدارت میں اسی جگہ مسلم لیگ ویمن سب کمیٹی کا اجلاس ہوا تو ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور باہر لان میں بھی سیکڑوں خواتین کا ہجوم تھا۔

1944ء میں بھی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت قائداعظم نے کی۔ جلسہ میں پنجاب حکومت کے سربراہ ملک خضر حیات ٹوانہ، وزیر تعلیم میاں عبدالحئی، سید امجد علی، راجہ غضنفر علی خان، سر مراتب علی اور قاضی عیسی بھی موجود تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین میاں ممتاز محمد خان دولتانہ تھے۔ اسی سال یکم مئی کو جب فیڈریشن کی سیالکوٹ شاخ نے شہر میں جلسہ کیا تو قائداعظم نے اس کی صدارت کرنا بھی منظور کر لیا۔ بالفاظ دیگر ان شہروں میں جہاں مسلم لیگ کمزور تھی قائداعظم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو پارٹی کا نعم البدل قرار دیتے ہوئے تصور پاکستان کو متعارف کرانے کی کوشش

کی۔ اسی سال جون کے مہینے میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے راولپنڈی میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس کانفرنس میں جناح صاحب تو نہیں آ سکے لیکن ان کی کمی پوری کرنے کے لئے مسلم لیگ کے کئی اہم رہنما بھیجے گئے تھے۔ کانفرنس کی صدارت سردار شوکت حیات نے کی جنہیں حال ہی میں پنجاب کابینہ سے نکالا گیا تھا اور عام تاثر یہ تھا کہ انہیں مسلم لیگ سے ہمدردی رکھنے کی سزا دی گئی ہے۔ افتتاحی تقریر لیاقت علی خان نے کی۔ دیگر مقررین میں سردار عبدالرب نشتر، قاضی عیسیٰ اور اورنگ زیب خان شامل تھے۔

1945ء کا سال مسلم لیگ کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا تھا کہ اس سال کے آخر میں ہونے والے انتخابات پاکستان کے سوال پر لڑے جائیں گے۔ انتخابات نے مسلم لیگ کو موقعہ فراہم کیا تھا کہ اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکے کہ وہ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اپنی تمام اتحادی قوتوں کو جنگ میں جھونکے بغیر لیگ کے لئے اس امتحان میں کامیاب ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس سال آل انڈیا مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ طلبہ کو اپنی تمام توانائیاں سیاست کے لئے وقف کرنے کی کال جاری کی۔ پارٹی کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان نے ایک بیان جاری کیا جس میں طلبہ سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے باہر نکلیں اور تمام ملک میں پھیل کر مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں اس کا ساتھ دیں۔ پنجاب میں اس اپیل کا خاص طور پر بہت اثر ہوا۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے اپنے کارکنوں کو مختلف گروپوں میں بانٹنے کا فیصلہ کیا۔ ان گروپوں نے دور دراز کے علاقوں میں پارٹی کے امیدواروں کے انتخابی جلسوں میں تقریریں کیں اور دیگر انتخابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ دسمبر کے آخر تک مرکزی اسمبلی کے تمام انتخابات کے سرکاری نتائج مکمل ہو گئے۔ مسلم لیگ نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اس نے مرکزی اسمبلی کی تمام نشستیں جیت لیں۔ یہ سو فیصد کامیابی ہندوستان کے انتخابات کی تاریخ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ووٹوں کی گنتی سے ثابت ہوا کہ تقریباً نوے فیصد مسلم ووٹروں نے مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں ووٹ دیئے۔ اس کے بعد جب صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات شروع ہوئے تو ان میں بھی صوبہ سرحد کے سوا باقی ہر صوبے کے مسلم حلقوں میں مسلم لیگ نے نوے فیصد یا اس سے بھی زیادہ مسلم سیٹیں جیت لیں۔ اس کامیابی

میں طلبہ کے اہم کردار کا اعتراف کئی مسلم لیگی رہنماؤں نے کیا۔ 17 جنوری 1946ء کو مسٹر جناح نے لاہور میں پنجاب ایم ایس ایف کے اجلاس کی صدارت کی اور اپنے خطاب میں طلبہ کے کام پر اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں امید ہے طلبہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ 2 مارچ کو لیاقت علی خان جب اسلامیہ کالج لاہور میں ایم ایس ایف کی میٹنگ میں شرکت کے لئے آئے تو انہوں نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ پنجاب اسمبلی میں موجود پارلیمانی پارٹیوں میں عددی اعتبار سے سب سے بڑی پارٹی تو بن گئی لیکن اسے قطعی اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ گورنر نے مسلم لیگ کو وزارت سازی کی دعوت دینے کی بجائے چند دن ٹال مٹول سے کام لیا اور اس دوران اپنی پسند کی کولیشن کے لئے راستہ صاف کردیا۔ جب اسمبلی میں یونینسٹ ، کانگریس اور اکالی اتحاد قائم ہوگیا تو یونینسٹ پارٹی کے خضر حیات کو کولیشن وزارت بنانے کی دعوت دے دی گئی۔ اس طرح صوبے کی مسلم اکثریت حزب مخالف بن گئی۔ مسلمانوں کے نزدیک یونینسٹ پارٹی کا نام قوم سے غداری کا ہم معنی بن گیا۔ جلد ہی اس حکومت کے خلاف جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ جب اس نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز پر پابندی لگا دی تو صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگئی۔ اس تحریک کی روح رواں بھی وہی طلبہ تھے جن کا تعلق مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا۔

باب 2

قیام پاکستان اور طالب علم تحریک کی شروعات

دور اول 58-1947

قیام پاکستان کے فوائد نئے ملک کے تمام صوبوں کو مساوی طور پر حاصل نہیں ہوئے۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب اور باقی صوبوں کے درمیان پہلے سے موجود ترقیاتی تفاوت میں اضافہ میں ہوگیا۔ پھر مہاجرین کا سیلاب بھی اپنے ساتھ بعض ایسے مسائل لایا جو ان صوبوں میں احساس محرومی پیدا کرنے کا موجب بنے۔ نئے ملک کے قیام نے پنجاب کے لئے ترقی کے نئے مواقع پیدا کئے۔ تاہم ان سے اہل پنجاب کے علاوہ اردو بولنے والے مہاجر بھی بہرہ یاب ہوئے۔ مزید پیچیدگی اس بات سے پیدا ہوئی کہ ریاستی اقتدار کی کنجی بھی پنجابی مہاجر عناصر کے ہاتھ میں آئی جس کی وجہ سے سماجی ترقی کے بیشتر مواقع سے بھی انہی نے فائدہ اٹھایا اس سے بے شمار سماجی مسائل نے جنم لیا۔ پنجاب کے ساتھ دوسرے صوبوں کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے اور بالآخر 1971ء میں ملک کا مشرقی حصہ پاکستان سے علیحدہ ہوگیا۔

پنجاب سے ہندو آبادی کے قریب قریب مکمل انخلاء کے بعد ان کی متروکہ اراضی، جائیداد، کاروبار اور ملازمتوں کا بیشتر حصہ مقامی لوگوں یا مشرقی پنجاب سے ترک وطن کر کے آنے والوں کے قبضے میں آئے۔ اسی طرح سے سندھ میں نئی آباد ہونے والی زرعی اراضی کا بھی خاصہ بڑا حصہ اہل پنجاب ہی نے خریدا، الاٹ کرایا، یا پنجابی افسروں نے انعام کے طور پر حاصل کیا۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں نئے پیدا ہونے والے بے شمار مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے دوڑ لگ گئی۔ آبادی کے بڑے حصے نے، بالخصوص

درمیانہ طبقے نے، سیاسی عمل میں دلچسپی لینا بند کر دی۔ عام مزدور اور کسان مسائل کی چکی میں پستے رہے۔ مگر سوسائٹی کے بالائی حصے ملک میں جاری لوٹ مار میں ہمہ تن مشغول رہے۔ پنجاب میں موجود سیاسی بے حسی کی فضا نے صوبے کے اندر ان قوتوں کو مضبوط کیا جو صورتحال کو جوں کا توں رکھنا چاہتی تھیں۔ درمیانہ طبقہ سیاست کو جاگیرداروں کا کھیل قرار دے کر اس سے دستکش ہو گیا۔ طالب علموں کو یہ درس دیا گیا کہ تعلیم حاصل کر کے ملازمت کریں، عزت سے روٹی کمائیں اور سیاست کی طرف توجہ نہ دیں۔ ایک طرف ترقی کے مواقع اور دوسری جانب سیاست کے خلاف پراپیگنڈہ ان دونوں کا اثر یہ ہوا کہ طلبہ ملکی صورتحال میں کم اور اپنی حالت سدھارنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

چنانچہ پاکستان میں طالب علم تحریک کی شروعات مشرقی پاکستان اور کسی قدر صوبہ سندھ سے ہوئیں جہاں قیام پاکستان کے ساتھ ہی احساس محرومی پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ وہ صوبے تھے جہاں مسلمانوں کو ہندوؤں کی معاشی و سماجی بالادستی سے تو نجات مل گئی تھی۔ لیکن اب پنجاب اور یوپی سے تعلق رکھنے والے ان کے ہم مذہب ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ نیا ملک بننے کے نتیجے میں ہندو چلے گئے مگر اب ان کی جگہ پنجاب اور یوپی سے تعلق رکھنے والے مسلمان سارے کاروبار اور بہترین ملازمتوں پر قابض ہوتے چلے جا رہے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں معاشی بالادستی کے خلاف جنگ مذہبی حوالوں سے لڑی گئی تھی، نئے حالات میں اس نے قومیتی جدوجہد کی شکل اختیار کر لی۔

بنگال اور سندھ کے مسلمانوں میں جب یہ احساس پیدا ہوا تھا کہ ہندو اپنی سماجی فوقیت کی بناء پر انہیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیں گے، تو تمام تر لسانی اور ثقافتی اشتراک کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے علیحدہ قوم شمار کرنے لگے تھے۔ ان دونوں صوبوں کے مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتے تھے کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی پسماندگی کا باب ختم ہو گا، ان کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع میسر ہوں گے، ان کے لئے روزگار کے نئے دروازے کھلیں گے۔ اور ان کے صوبوں میں موجود وسائل ان کی پسماندگی کے خاتمے کے لئے استعمال ہوں گے۔ بنگالی اور سندھی زبانیں پاکستان میں بولی جانے والی دیگر زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔ ان میں اخبار اور رسالے بھی چھپتے تھے

اور یہ دفتروں اور کچہریوں میں بھی عرصہ دراز سے سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ توقع رکھنا کہ نئے ملک میں ان زبانوں کو اور بھی زیادہ ترقی دی جائے گی فطری امر تھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد مرکزی حکومت نے جس پر پنجابی اور مہاجر اثرات غالب تھے چند ایسے اقدامات کا اعلان کیا جن کے نتیجے میں مشرقی پاکستان اور سندھ کے اندر عوام کے وسیع حلقوں میں احساس محرومی ابھرنے لگا۔ آبادی کا وہ حصہ جسے بے چینی کی لہر نے سب سے پہلے اپنی لپیٹ میں لیا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم تھے۔ وہی طالب علم جو اس سے پہلے تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد شروع ہونے والی قومیتی تحریکوں کی روح رواں بنے۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ تعلیم نے ان کے آگہی کی جو شمع روشن کی تھی اس کی وجہ سے وہ مرکزی حکومت کے فیصلوں سے پیدا ہونے والے نتائج سے باخبر تھے۔ اور عمر کے اس حصے میں ہونے کی وجہ سے جس میں انسان عواقب کی پروانہیں کرتا وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار تھے۔ پاکستان بنتے ہی جب ان توقعات کی نفی ہونے لگی جو انہوں نے نئے ملک سے وابستہ کر رکھی تھیں تو سوسائٹی میں سب سے شدید ردعمل انہی میں پیدا ہوا۔

بنگالی مسلم نیشنلزم اور قومی زبان کا سوال

قیام پاکستان کے وقت ملک کی نصف سے زیادہ آبادی مشرقی صوبے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں بسنے والے بنگالی مسلمانوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسی صوبے کے صدر مقام ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کی قیام گاہ پر آل انڈیا مسلم لیگ کی داغ بیل رکھی گئی تھی۔ تیس سال بعد جب آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا مرحلہ آیا اور علی گڑھ اور لکھنو کی یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبہ کی لیڈرشپ نے اس کے تاسیسی کنونشن کے لئے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو اس تنظیم کا قیام بھی بنگال ہی کے شہر کلکتہ میں عمل میں لایا گیا تھا۔ (1) کلکتہ کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ بنگالی میں مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نئی تنظیم کو سرگرم حمایتی حاصل تھے۔ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے بنگال میں باقی مسلم اکثریتی صوبوں کے مقابلے

میں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر 1946ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کے نتیجے میں بھی مسلم لیگ جن دوصوبوں میں حکومت قائم کرسکی تھی وہ بنگال اور سندھ ہی تھے۔

ہم باب اول میں ان وجوہات کا تذکرہ کر چکے ہیں جنھوں نے بنگال کے مسلمانوں کو اپنی علیحدہ سیاسی شناخت قائم کرنے کے لئے بنیاد فراہم کی۔ اور جس وجہ سے بنگال مسلم لیگ کے قیام کی کوشش کا مرکز بن گیا۔ بنگالی مسلمانوں کی معاشی پسماندگی نے ان میں بنگالی ہندوؤں سے علیحدہ ہونے کا احساس تو پیدا کر دیا۔ تاہم ان میں اور بنگالی ہندوؤں میں کئی ایک باتیں مشترک رہیں جن میں زبان، رسم و رواج اور ثقافتی ورثہ شامل تھے۔ ان جھگڑوں کے باوصف جن کی بنیاد معاشی مسابقت نے فراہم کی تھی، بنگال کے عام مسلمان اور ہندو ثقافتی اعتبار سے ہم رنگ اور برصغیر کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے مختلف تھے۔ بنگال میں فارسی یا اردو زبان کا استعمال صرف اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے مٹھی بھر مسلمان گھرانوں تک محدود تھا۔ باقی سب بنگالی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔ دونوں مذاہب سے تعلق رکھنے والی عورتیں ساڑھی پہنتی تھیں۔ موسیقی بنگالی کلچر کا مقبول عام حصہ تھی۔ بہت سے تہوار بھی مشترک تھے۔ اس لحاظ سے بنگالی مسلمان دیگر صوبوں کے مسلمانوں سے علیحدہ شناخت بھی رکھتے تھے جسے صرف بنگالی شناخت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ بیک وقت بنگالی بھی تھے اور مسلمان بھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب پاکستان کے حصول کی تحریک چلی تو جلد ہی نئے ملک کے بارے میں بنگالی مسلمانوں اور مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے تصورات میں ایک واضح فرق نظر آنے لگا۔ مسلمان اقلیتی صوبوں کے مسلم لیگی قائدین نے تحریک پاکستان کے ڈانڈے سرسید کی تحریک سے ملائے۔ ان کے خیال میں سارے برصغیر کے مسلمان ایک ہی ثقافتی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ جس میں دھاگے کا کام اردو زبان کرتی تھی۔ اس کے برعکس بنگال کے مسلمانوں کی نظر میں قیام پاکستان کا مدعا ہندوؤں کے معاشی غلبے سے نجات حاصل کرنا تھا۔ پاکستان بنانا اس لئے ضروری تھا تاکہ بنگال کے مسلمانوں کو بھی ترقی کے مواقع نصیب ہوں۔ انہیں توقع تھی کہ نئے ملک میں ان ناانصافیوں کا خاتمہ ہو گا جن کا

وہ ہندو بالادستی کی وجہ سے اب تک شکار ہوتے رہے تھے۔ ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا۔ ان پر روزگار کے دروازے بند نہیں ہوں گے اور ان کی سماجی پسماندگی ختم ہو گی۔ نا انصافیوں کا سب سے بڑا نشانہ بنگال کے مسلمان نوجوان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبے کے مسلمان نوجوانوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پاکستان کے قیام کے بعد بنگالی ہندوؤں کی بڑی تعداد نقل مکانی کر کے باہر چلی گئی۔ چونکہ سرکاری ملازموں میں زیادہ تعداد ہندوؤں ہی کی تھی اس لئے ان کے جانے سے بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ پنجاب میں یہ خلا مقامی مسلمان افسروں نے پورا کیا تھا اس لئے پاکستان کا قیام اہل پنجاب کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان میں صورتحال مختلف تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جو مسلمان آئی سی ایس افسر ملک میں رہ گئے تھے ان میں صرف ایک بنگالی تھا۔ چنانچہ نیا ملک وجود میں آنے کے موقع پر مشرقی بنگال میں سرکاری افسروں کی شدید گرمی پیدا ہوگئی۔ ایک وقت تو حالت یہاں تک جا پہنچی کہ نصف سے زیادہ سول اور فوجداری عدالتوں نے ایگزیکٹو اور جوڈیشل افسروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کام کرنا بند کر دیا۔ (2) ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ صورتحال سے نبٹنے کے لئے ہنگامی طور پر نچلے مقامی افسروں کو ترقی دے دی جاتی اور ان کے لئے کریش ٹریننگ کورس کا بندوبست کیا جاتا۔ اس سے وقتی طور پر انتظامی مسائل ضرور پیدا ہوتے مگر بنگالی مسلمانوں میں وہ بیگانگیت جنم نہ لیتی جس کا اظہار جلد ہی ہونا شروع ہوگا۔ تاہم جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ خالی ہونے والے عہدوں پر یوپی اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے افسروں کو متعین کر دیا گیا۔ ان افسروں کی اکثریت بنگالی عوام کی زبانی اور ثقافتی سے نابلد تھی۔ اور اس کی جانب حقارت آمیز رویہ رکھتی تھی۔

مارچ 1949ء میں جب دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی تو اس کے نتیجے میں خاص طور پر مشرقی پاکستان میں بحث چھڑ گئی۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس موقعہ پر اعلان کیا کہ پاکستان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی زندگی اسلام کی تعلیمات اور روایات کے مطابق گزارنے کے خواہاں تھے۔ جو قرار داد پاس کی گئی اس میں یہ تو تصریح نہیں کی گئی تھی کہ پاکستان اسلامی ریاست ہوگا اور نہ ہی علماء کو کسی قسم کے

اختیارات دیئے گئے تھے۔ تاہم قرار داد کی پانچویں شق میں مسلمانوں کے حق خود ارادیت کا ذکر موجود تھا۔ اور اس کے مطابق دو قومی نظریہ کو مستقبل کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں حزب مخالف نے جس کی اکثریت مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہندو ارکان پر مشتمل تھی قرار داد کی اسلامیہ شقوں کو بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ قرار داد نے مذہب اور ریاست کے درمیان دستوری رشتہ پیدا کر دیا ہے۔ جب کہ قائداعظم پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔ ان کا یہ اعتراض بھی تھا کہ قرار داد مقاصد نے اقلیتوں کو دوسرے درجہ کے شہریوں کا مقام دے دیا ہے۔ قرار داد مقاصد کے مخالفین میں واحد مسلمان میاں افتخار الدین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ قرار داد سیاسی سماجی اور معاشی انصاف کی ضمانت مہیا نہیں کرتی۔

قرار داد مقاصد پاس ہونے کے بعد دستور ساز اسمبلی نے پچیس سے پینتیس ارکان اسمبلی پر مشتمل بنیادی اصولوں کی کمیٹی (BPC) مقرر کی جس کا مقصد مستقبل کے آئین کے بنیادی اصول طے کرنا تھا اس کمیٹی کی سفارشات نے مشرقی پاکستان میں رفتہ رفتہ پیدا ہونے والے احساس محرومی کو مزید تقویت دی۔ اگست 1950ء میں بی پی سی نے اپنی عبوری رپورٹ پیش کی جس کے دو نکات مشرقی پاکستان میں خاص طور پر غیر مقبول ہوئے۔ پہلی قابل اعتراض بات یہ تھی کہ وفاقی پارلیمنٹ کا جو ڈھانچہ تجویز کیا گیا تھا وہ مشرقی پاکستان کی اکثریتی حیثیت کو ختم کر دیتا تھا۔ دوسری یہ کہ پاکستان کی سرکاری زبان کی حیثیت صرف اردو کو دی گئی تھی۔ ان سفارشات کے خلاف مخالفت کی جو رو مشرقی پاکستان میں چلی اس میں صوبائی مسلم لیگ بھی بہ گئی۔ یہ مخالفت اتنی شدید تھی کہ لیاقت علی خان نے مجبوراً عبوری رپورٹ کو واپس لے لیا۔

عبوری رپورٹ کے پیچھے جو بدنیتی موجود تھی اس نے رپورٹ کی واپسی کے باوجود صوبائی خود مختاری کے مسئلہ کو مشرقی پاکستان میں سب سے اہم مسئلہ بنا دیا۔ اس مسئلے کو اٹھانے میں طلبہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مشرقی پاکستان کے وہی طلبہ جو تحریک پاکستان کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ نئے ملک کی قیادت کی ناانصافیوں کے خلاف سر بکف ہو گئے۔ جنوری 1948ء میں ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ وجود میں آئی۔ شیخ مجیب

الرحمان اس نئی تنظیم کا آرگنائزنگ سیکرٹری مقرر ہوا۔ مجیب اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔

شیخ مجیب الرحمان کون تھا؟ کیا وہ مسلم لیگ کی کسی مخالف پارٹی کا کارکن تھا؟ یا وہ ان لوگوں میں سے تھا جونظریہ پاکستان سے بغض رکھتے تھے؟ یا اس کا تعلق کسی ایسے انتہا پسند گروپ سے تھا جوتوڑ پھوڑ کے ذریعہ مقصد بر آری کا خواہاں ہو؟ حقائق ان تمام باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ مجیب چند ماہ پہلے تک مسلم لیگ کا سرگرم کارکن تھا۔ وہ شخص جس نے بعد میں بنگلہ بندھو کا لقب حاصل کیا اور جس کی قیادت میں مشرقی پاکستان باقی ماندہ ملک سے علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بنا آٹھ سال تک حصول پاکستان کی جدوجہد میں ایک متحرک کارکن کے طور پر حصہ لیتا رہا تھا۔ مجیب سترہ برس کا تھا جب اس نے 1939ء میں گوپال گنج کے قصبہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور اسے مقامی پارٹی کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ پھر جب 1946ء میں بہار ہندو مسلم فسادات کی زد میں آیا تو مسلم لیگ کی جانب سے مجیب ہی کو وہاں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اسی سال وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بنگال اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ زبان کا مسئلہ جب تحریک کی شکل اختیار کرنے لگا تو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ اپسو یعنی ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ بن گئی۔ نام کی یہ تبدیلی معمولی بات نہ تھی۔ بلکہ اس بات کی علامت تھی کہ مسلم بنگالی نیشنلزم اب خالص بنگالی نیشنلزم میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

نئی طالب علم تنظیم میں وہی نوجوان شامل تھے جو اس سے پہلے تحریک پاکستان میں فعال کردار ادا کرتے رہتے تھے۔ وہ نئی تنظیم اس لئے بنا رہے تھے کیونکہ وہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی مشرقی پاکستان کے بارے میں پالیسی سے ناخوش تھے۔ وہ ماضی میں بھی خواجہ ناظم الدین کے مخالف تھے اور ان کی ہمدردیاں حسین شہید سہروردی کا ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسی طلبہ تنظیم کے سینیئر گروپ نے مولانا بھاشانی کی زیر قیادت ایسٹ بنگال مسلم عوامی لیگ (بعد میں صرف عوامی لیگ) کی بنیاد ڈالی۔ جب جون 1949ء میں یہ پارٹی قائم ہوئی تو مجیب اور کھونڈ کر مشتاق احمد اس کے جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس پارٹی کے بائیس نکات میں سے پہلے دو یہ تھے: مشرقی بنگال کے لئے 1940ء کے

ریزولیوشن کے مطابق صوبائی خودمختاری اور بنگلہ زبان کو بھی قومی زبان کا مقام دلوانا۔(3)

مشرقی پاکستان سے ہندو افسر شاہی اور بڑے زمیندار تو رخصت ہو گئے لیکن ان کی جگہ جن مسلمانوں نے لی وہ نہ صرف غیر بنگالی تھے بلکہ انتہائی فرعون مزاج بھی واقع ہوئے تھے۔ طرہ یہ کہ وہ مقامی لوگوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ نئے حاکموں کی زبان سیکھیں۔ اس سے عام آدمی کے لئے مشکلات کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ان شکایات کی بازگشت دستور ساز اسمبلی میں بھی جلد ہی سنی جانے لگی۔ منی آرڈر فارم یا انگریزی میں ہوتے تھے یا اردو میں۔ انہیں کیسے بھرا جائے؟ اشٹام پیپر اور ڈاک کے ٹکٹ بھی انگریزی یا اردو میں ہوتے تھے۔ ان کی مالیت معمولی پڑھا لکھا آدمی کیسے معلوم کرے؟ یہ آخر بنگالی زبان میں کیوں نہیں چھاپے جاتے تھے؟ دستور ساز اسمبلی (یہ اس وقت قومی اسمبلی کے طور پر بھی کام کرتی تھی) صرف کراچی میں کیوں بیٹھتی ہے اس کے سیشن ڈھاکہ میں کیوں منعقد نہیں کئے جاتے؟ بیگم شائستہ اکرام اللہ جو سیاست میں میانہ رو رجحان کی نمائندہ تھی اور مسلم لیگ کی سرگرم اور پرانی کارکن تھی دستور ساز اسمبلی میں یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ پاکستان کے مشرقی بازو کی آبادی کے اندر یہ احساس تیزی سے ابھر رہا ہے کہ ان کے صوبے پر توجہ نہیں دی جا رہی اور اس سے ایسا برتاؤ کیا جا رہا ہے جیسے یہ مغربی پاکستان کی نوآبادی ہو۔

بنگال میں اردو زبان مسلمان اشرافیہ کے طبقہ تک محدود تھی۔ آبادی کی اکثریت کے لئے یہ ایک ایسی اجنبی زبان تھی جسے سمجھنا وقت طلب کام تھا۔ پاکستان کے قیام کے چار سال بعد بھی جو مردم شماری ہوئی اس کے مطابق صوبے میں ان لوگوں کی تعداد جو اردو بول سکتے تھے صرف ایک فیصد تھی۔ اس لحاظ سے اہل بنگال مغربی پاکستان کے لوگوں سے مختلف تھے جہاں شہروں کی حد تک اردو رابطے کی زبان بنتی جا رہی تھی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ نئے ملک کی قومی زبان کیا ہو۔ اس سوال کا تعلق معاشی زندگی سے بھی تھا۔ قومی زبان نے ہی بالآخر دفتری زبان بھی بننا تھا۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے انٹرویو اسی زبان میں ہونے تھے۔ عدالتوں میں بھی قومی زبان مروج ہونا تھی۔ اردو کے قومی زبان بننے سے چونکہ پنجابیوں اور یوپی کے مہاجروں کو بنگالیوں پر برتری حاصل ہوتی تھی اس لئے وہی اس کے سب سے بڑے حامی تھے۔ اردو

کے قومی زبان بننے کا نقصان واضح طور پر بنگالی بولنے والی آبادی کو تھا جو ملک کی اکثریت تھی۔ بنگالی مسلمانوں کی توقع کے برعکس جب1948ء میں مرکزی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اردو ہی ملک کی واحد قومی زبان ہوگی تو اس کے خلاف صوبے میں شدید ردعمل ہوا۔ مشرقی بنگال کے عوام نے مطالبہ کیا کہ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس جدوجہد میں طالب علم ہراول دستہ بنے۔

بنگلہ زبان کی تحریک کا مقصد اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ کو بھی ایک قومی زبان کا مرتبہ دلوانا تھا۔ اس مطالبے کو کسی شکل میں بھی بلا جواز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بنگالی یہ مطالبہ نہیں کر رہے تھے کہ صرف بنگلہ ہی ملک کی واحد قومی زبان ہو۔ بلکہ وہ تو صرف اسے بھی اردو کے شانہ بشانہ ایک قومی زبان کا درجہ دینے کی مانگ کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد چونکہ مرکزی حکومت پر پنجابی اور مہاجر افسر شاہی کا غلبہ قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے مشرقی پاکستان کے اس مقبول عام مطالبے کو حکومتی سطح پر پذیرائی نہ مل سکی بلکہ مطالبے کو رد کیے جانے کے نتیجے میں جو تحریک ابھری اسے طاقت کے زور پر دبانے کی کوشش کی گئی۔ فی الحقیقت بنگلہ دیش کی بنیاد کی پہلی اینٹ اس وقت رکھی گئی جب اس پر امن تحریک کو ریاستی طاقت کے بل کچلا گیا۔ ملک کے مشرقی حصے میں اردو کے واحد قومی زبان قرار دیئے جانے کی مخالفت میں جو تحریک اٹھی اس کے پس پشت صوبے میں موجود بنگالی مسلم نیشنلزم کی وہی تحریک تھی جو قابل ازیں قیام پاکستان کے لئے جذبہ محرکہ بنی تھی۔ اس تحریک میں پیش پیش بھی وہی طالب علم تھے جو اس سے پہلے تحریک پاکستان کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ بنگلہ زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک قیام پاکستان کے بعد طالب علموں کی پہلی بڑی تحریک تھی۔ یہ تحریک دو مرحلوں میں چلی۔

تحریک کی پہلی لہر1948ء

پاکستان کو وجود میں آئے مشکل سے تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ ملک میں قومی زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمٰن نے جن کا تعلق بنگال سے تھا نومبر 1947ء میں کراچی میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد یہ طے کرنا تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام کو اسلامی آئیڈیالوجی کے خطوط پر کس طرح مرتب کیا جائے۔ اس کانفرنس

میں جب قومی زبان کے تعین کا سوال اٹھا تو بنگالی نمائندوں نے اردو کو بطور قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فروری 1948ء میں مسٹر دھریندرناتھ دتہ نے جو دستور ساز اسمبلی کے ایک کانگریسی رکن تھے اسمبلی کے ضوابط میں ایک ترمیم پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایوان میں انگریزی اور اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی میں بھی تقریر کی اجازت ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ بنگالی چونکہ ملک کی اکثریتی آبادی کی زبان ہے اس لئے اسے بھی اردو کے پہلو بہ پہلو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ لیاقت علی خان نے تحریک کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''چونکہ پاکستان ایک مسلم ریاست ہے اس لئے وہی زبان یہاں کی قومی زبان بن سکتی ہے جو مسلمان قوم کی زبان ہو...... (محرک کو) معلوم ہونا چاہیے۔ کہ پاکستان کا قیام برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبے کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور ان دس کروڑ لوگوں کی زبان اردو ہے...... یہ ضروری ہے کہ ایک قوم کی زبان بھی ایک ہی ہو۔ اور یہ زبان اردو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'' (4)

دستور ساز اسمبلی کے اندر تو ضوابط میں ترمیم پیش کرنے والے رکن کی آواز دبا دی گئی مگر ملک کے مشرقی حصے میں جا بجا بنگالی زبان کے حق میں آواز بلند ہونے لگی۔ بنگالی کی حمایت کرنے والوں میں ویسے تو ہر طبقے کے لوگ شامل تھے مگر ان میں طلبہ سب سے آگے تھے۔ صوبائی اسمبلی کے بعض ارکان کی بھی اس مانگ کو در پردہ حمایت حاصل تھی۔ فروری 1948ء تک زبان کا مسئلہ بند کمروں اور چائے خانوں سے نکل کر سڑکوں تک آ پہنچا۔ بنگلہ زبان کی حمایت میں چلنے والی تحریک کا جھنڈا اسٹوڈنٹس لیگ کے ہاتھ میں تھا جسے قائم ہوئے ابھی ایک مہینہ ہوا تھا۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک ایکشن کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی میں ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے طالب علم تھے۔ بائیں بازو کے بھی، دائیں بازو کے بھی اور میانہ رو بھی۔ اس مرحلے پر ابھی سیاسی جماعتیں تحریک میں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ 11مارچ کو ایکشن کمیٹی نے ڈھاکہ میں بنگالی زبان کو قومی زبان کا درجہ دلوانے کے لئے جلوس نکالا۔ اس جلوس پر لاٹھی چارج ہوا اور بہت سے مظاہرین حراست میں لے لئے گئے۔ خواجہ ناظم الدین اس وقت صوبے کے وزیراعلیٰ تھے۔ ان کا تعلق بنگال کی مسلم اشرافیہ سے تھا اور وہ عوام کے جذبات کی

شدت سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طاقت کے استعمال سے تحریک کو دبایا جا سکتا ہے۔ جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔ تشدد کے استعمال کا اثر یہ ہوا کہ تحریک ہر طرف پھیل گئی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مظاہرہ ہونے لگا۔

19 مارچ کو قائداعظم کو بطور گورنر جنرل ڈھاکہ پہنچنا تھا اور صورت حال تھی کہ روز بروز بے قابو ہوتی چلی جا رہی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کو جب کوئی اور راستہ نظر نہ آیا تو انہوں نے ایکشن کمیٹی کے لیڈروں سے گفت وشنید کا فیصلہ کیا۔ محمد علی بوگرا کی وساطت سے بنگالی زبان کے حامی طلبہ سے رابطہ کیا گیا۔ گفت وشنید کے بعد طرفین میں بالآخر ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی دو شقیں اہم تھیں۔ اول یہ کہ مشرقی بنگال اسمبلی ایک قرارداد منظور کرے گی جس کے مطابق بنگالی مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار پائے گی۔ نیز اسے پرائمری سکول سے یونیورسٹی تک ہر سطح پر ذریعہ تعلیم کا درجہ دیا جائے گا۔ دوم یہ کہ صوبائی اسمبلی ایک اور قرارداد کے ذریعے آئین ساز اسمبلی سے سفارش کرے گی کہ اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی ایک قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین نے بالآخر اس معاہدے کی صرف ایک شق پر عمل کیا۔ اسمبلی نے بنگالی کو صوبے کی زبان قرار دینے کا ریزولیوشن تو پاس کر دیا تاہم آئین ساز اسمبلی سے متعلق قرارداد گول کر دی۔

قومی زبان کے مسئلے پر جو کشیدگی مشرقی بنگال میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے سائے قائداعظم کے ڈھاکہ کے دورہ پر بھی پڑے۔ قائداعظم کو کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے مشرقی بنگال کی صورتحال کے بارے میں جو بریفنگ دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ زبان کی تحریک کے پس پشت وہ بھارت نواز قوتیں کارفرما ہیں جو افراتفری کے ذریعے پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ اور ان قوتوں میں پیش پیش کمیونسٹ ہیں۔ بنگالی کو قومی زبان بنانے کا شاخسانہ ان لوگوں نے کھڑا کیا ہے جو مشرقی بنگال کو مغربی بنگال میں از سر نو ضم کرنے کے درپے ہیں۔ کیا یہ باور کرانے میں حسین شہید سہروردی کے مخالفین کا ہاتھ تھا جو اس وقت ملک کے مشرقی صوبے پر حکمران تھے؟ یا اس میں پنجابی مہاجر افسر شاہی کا عمل دخل تھا جو اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دینا چاہتی تھی اور جسے لیاقت علی خان کی سرپرستی حاصل تھی؟ یا دونوں کا؟ 21 مارچ کو قائداعظم نے ڈھاکہ میں ایک بڑے جلسہ عام

سے خطاب کیا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے ان شکوک وشبہات کا تذکرہ کیا جو پاکستان بننے کے ساتھ ہی ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے صوبائی منافرت کی مذمت کی۔ اسے غیر ملکی ایجنٹوں اور کمیونسٹوں کی شرارت قرار دیا۔ زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جہاں تک کہ بنگالی زبان کو صوبائی سطح پر سرکاری زبان کا درجہ دینے کا تعلق ہے اس سلسلے میں صوبائی اسمبلی جیسے چاہے فیصلہ کرنے کی مختار ہے۔ لیکن جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے وہ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے کہا'' میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی مملکت کی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی۔ جو شخص آپ کو گمراہ کرتا ہے وہ فی الحقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ جب تک مملکت کی ایک زبان نہ ہو قوم متحد رہ کر کام نہیں کرسکتی۔''

قائداعظم قیام پاکستان کے بعد پہلی دفعہ ڈھاکے آئے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی کرشمہ ساز شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پنجابی یا مہاجر بھی نہیں تھے اور اس لحاظ سے بھی ان کی شخصیت غیر متنازعہ تھی۔ اس لئے مجمع نے ان کی تقریر خاموش سے سنی۔ تاہم جب انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے انہی خیالات کو دہرایا تو طالب علموں میں قدرے ہلچل کے آثار نمایاں ہوئے۔ (5) تاہم اس اتھارٹی کی وجہ سے جو قائداعظم کو بطور بابائے قوم حاصل تھی زبان کا مسئلہ وقتی طور پر دب گیا۔

تحریک کی دوسری لہر: شہید مینار کی تعمیر

بنگالی زبان کی حمایت میں اٹھنے والی تحریک سے ملک کی ان قوتوں نے جو مضبوط مرکز اور اردو زبان کی حامی تھیں کوئی بھی سبق حاصل نہیں کیا۔ بلکہ اردو کو قومی زبان قرار دینے کے لئے کوششیں تیز کر دی گئیں۔ 1950ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی عبوری رپورٹ جب منظر عام پر آئی تو اس میں بھی اردو ہی کو واحد قومی زبان بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی سفارشات کے خلاف مشرقی بنگال میں فوری ردعمل ہوا۔ اس کے باوجود اگر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اس معاملے کے بارے میں غیر دانشمندانہ رویہ اختیار نہ کرتے تو مسئلہ شاید کچھ دیر تک دبا رہتا 27 جوری 1952ء کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر قائداعظم کے حوالے سے

قومی زبان کے بارے میں غیر محتاط زبان استعمال کی۔ کہا جاتا ہے کہ جو تقریر انہوں نے جلسے میں پڑھی اسے ان کے ہمراہ کراچی سے آتے ہوئے ایک سرکاری افسر نے جہاز میں لکھ کر ان کے حوالے کیا تھا اور خواجہ ناظم الدین کو اسے پڑھنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ تاہم وزیراعظم بنگالی اشرافیہ کے اس حصے سے تعلق رکھتے تھے جو نہ تو بنگالی زبان پڑھ سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ان کا اردو کے حق میں تعصب قابل فہم تھا۔ فضا پہلے ہی سے مکدر ہو چکی تھی۔ موصوف کے اس مسئلہ پر اظہار خیال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اگلے دن ہی سے بنگالی زبان کے حق میں تحریک کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ ناظم الدین نے 1948ء میں طلبہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ صوبائی اسمبلی ایک ریزولیوشن کے ذریعے دستور ساز اسمبلی سے بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دینے کی مانگ کرے گی۔ اب وزیراعظم اپنے اس وعدے سے پھر گئے تھے۔ چنانچہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے اٹھنے والی تحریک نے وزیراعظم، وزیراعلیٰ اور تمام صوبائی وزراء کو مغربی پاکستان کا آلہ قرار دے دیا۔

ڈھاکہ کے طلبہ ایک مرتبہ پھر 1948ء والے عمل سے گزرے۔ ایک ایکشن کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جو حسب سابق ہر طبقہ فکر کے طلبہ کی نمائندگی کرتی تھی۔ اب اس میں یوتھ لیگ بھی شامل تھی جسے ایسٹ پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے 1951ء میں قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے کمیونسٹ پارٹی صرف زیرزمین کام کرتی تھی۔ ''راجشاہی جیل تھیس'' کے بعد جب پارٹی نے قانونی تنظیمیں بنانے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے یوتھ لیگ قائم کی۔ یوتھ لیگ کا پروگرام ''سیکولرازم، سامراج کی مخالفت، جاگیرداری کی مخالفت، عالمی امن، مکمل جمہوریت اور ملک کے تمام لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع کے حصول کے لئے صوبے کے تمام طبقات کے زیادہ سے زیادہ افراد کو ایک جھنڈے تلے لانا'' تھا۔ یوتھ لیگ قومی زبان کی تحریک پر حاوی رہی۔ کمیونسٹ پارٹی کے کئی ارکان عوامی لیگ اور سٹوڈنٹس لیگ میں شامل ہو کر بھی تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ جب تک انہوں نے ان دونوں سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ نہیں کیا ان کا ان تنظیموں پر خاصہ اثر رہا۔ مشرقی پاکستان میں ابھرنے والی بنگالی قوم پرستی کو یوتھ لیگ نے نظریاتی بنیاد فراہم کی اور اس کے ثقافتی پہلو کو اجاگر کیا۔ (6)

30 جنوری سے ڈھاکہ یونیورسٹی اور شہر کے مختلف کالجوں میں ہڑتالوں کا آغاز

ہو گیا اور مظاہرے کیے گئے۔ چونکہ اردو بولنے والے طلبہ احتجاج میں شرکت سے گریزاں تھے اس لئے تعلیمی اداروں میں پہلی مرتبہ بنگالی اور اردو بولنے والوں کے درمیان لسانی بنیادوں پر لڑائیاں ہوئیں۔تحریک کی دوسری لہر میں حزب اختلاف کی سیاسی جماعتیں بھی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئیں۔اس سلسلے میں عوامی لیگ نے پہل کاری کرتے ہوئے ڈھاکہ میں 31 جنوری کو ایک آل پارٹیز کنونشن بلائی۔اس وقت عوامی لیگ کی باگ ڈور مولانا عبدالحمید بھاشانی کے ہاتھ میں تھی۔مولانا نے سیاست کا آغاز ظالم ہندو راجاؤں اور زمینداروں کے خلاف کسانوں کو منظم کرنے سے کیا تھا۔آسام کے مسلم اکثریتی حصے کو مشرقی پاکستان میں شامل کرانے میں بھی ان کی شعلہ بیانی کو دخل حاصل تھا۔ایجی ٹیشن ان کے خون میں رچی بسی ہوئی تھی۔ اس کنونشن میں سیاسی جماعتوں نے ایک آل پارٹیز ایکشن کمیٹی تشکیل دی۔کمیٹی میں حزب اختلاف کی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ طلبہ تنظیموں کو بھی نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔کمیٹی نے طے کیا کہ 21 فروری کو سارے صوبے میں ہڑتال ہو گی اور اگر حکومت نے اسے طاقت کے زور پر روکنے کی کوشش کی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی۔

ہر چند کہ تحریک کے روح رواں طلبہ ہی رہے مگر اب ان کے ساتھ سماج کے دیگر طبقات بھی شامل ہو گئے تھے۔ان میں کہنہ مشق لیڈر بھی تھے اور تجربہ کار سیاسی کارکن بھی۔ چنانچہ تحریک میں ایک کیفیتی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ تحریک کی حمایت صرف ایک شہر تک محدود نہیں رہی بلکہ سارے صوبے میں پھیل گئی۔ یوتھ لیگ کی شمولیت کے بعد تحریک کی قیادت بائیں بازو کے لوگوں کے پاس چلی گئی تھی۔ چنانچہ بہت سے نوجوان طلبہ کا رابطہ متحرک کمیونسٹ کارکنوں سے ہوا۔

خواجہ ناظم الدین کا تعلق نوابان ڈھاکہ خاندان سے تھا۔ وہ کوئی عوامی لیڈر نہ تھے اور کسی تحریک سے نمٹنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ باقی رہ گئے صوبے کے مسلم لیگی وزیراعلیٰ اور ان کی کابینہ کے ارکان تو ان کی تمام تر کوششیں اپنی اپنی کرسی کو بچانے پر مرکوز تھیں۔ان میں سے وہ لوگ بھی جو لسانی سوال پر طلبہ کے ہمنوا تھے۔مثلاً محمد علی بوگرا، تفضّل علی اور حبیب اللہ بہار ان میں سے بھی کسی میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ خواجہ ناظم الدین کی رائے

سے اختلاف کی جرات کر سکے۔ وزیراعظم ہو یا صوبے کا وزیراعلیٰ دونوں کا انحصار ان رپورٹوں پر تھا جو نیچے سے سرکاری افسر ارسال کرتے تھے۔ ان افسروں کی بڑی تعداد اپنی مخصوصی قومیتی ساخت کی بناء پر بنگالی مسلمانوں کی امنگوں سے ہمدردی نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ سرکاری حلقوں نے ایکشن کمیٹی کے بیانات کو چائے کی پیالی میں ابال سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ بات چند شرپسندوں تک محدود ہے۔ ہڑتال کی کال دینے والوں کو اگر حکومت نے بات چیت کا عندیہ دے دیا تو ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ ان مٹھی بھر لوگوں کا علاج ریاستی طاقت کا بھرپور استعمال ہے۔ جب انہیں مار پڑے گی تو ان کے ہوش خود بخود ٹھکانے آ جائیں گے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈھاکہ میں دفعہ 144 کا نفاذ کر کے جلسوں جلوسوں پر پابندیاں لگا دی گئی۔ سابق مسلم لیگی رہنما حمید الحق چودھری کے اخبار ''پاکستان آبزرور'' کو طلباء کے مطالبات کی حمایت کے الزام میں دو سال کے لئے بند کر دیا گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر اور حمید الحق چودھری کو حراست میں لے لیا گیا۔ (7)

مارچ 1948ء کو معاملہ ڈھاکہ تک محدود رہا تھا۔ اس دفعہ 21 فروری کو جو تحریک شروع ہوئی اس کے جھٹکے سارے صوبے میں محسوس کئے گئے۔ ہر طرف سے مرکز اور صوبائی حکومت کے خلاف اعلان جنگ ہونا شروع ہو گیا۔

ہڑتال کے دن ڈھاکہ شہر کے تمام اطراف سے جلوس یونیورسٹی کی جانب روانہ ہوئے۔ دوپہر تک یونیورسٹی کے میدان میں ہزاروں کی تعداد میں مظاہرین اکٹھے ہو چکے تھے۔ لاؤڈ سپیکر میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں نصب کر دیئے گئے جو یونیورسٹی کے اندر واقع تھا۔ یہاں سے حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں شروع ہو گئیں۔ مظاہرین ٹولیوں میں بٹ کر یونیورسٹی کے احاطے سے باہر نکلنے لگے۔ دفعہ 144 کے تحت لگائی جانے والی پابندیاں توڑ دی گئیں۔ اسی اثناء میں لڑکیوں کا ایک جلوس بھی اسی طرف بڑھنے لگا جہاں مظاہرہ جاری تھا۔ پولیس نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو یونیورسٹی کے اندر سے مشتعل طلباء کا ہجوم پولیس کا گھیرا توڑ کر باہر نکل آیا اور لڑکیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب تمام مظاہرین نے اکٹھے ہو کر اسمبلی ہال کا رخ کیا جہاں اس وقت اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ صوبے کی انتظامیہ نے مظاہرین سے سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ مسٹر عزیز احمد اس وقت

چیف سیکرٹری تھے اور موقعہ پر موجود پولیس کی کمان ایک نوجوان اے ایس پی مسعود محمود کے پاس تھی۔ یہ وہی مسعود محمود تھا جو بعد میں ضیاء الحق کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سرکاری گواہ بن گیا تھا پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پہلے تو آنسو گیس استعمال کی اور جب اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں ایک طالب علم موقعہ پر مارا گیا اور دو زخمی ہوئے۔ یہ دونوں بھی بالآخر زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں چل بسے۔

اسمبلی کا اجلاس شام ساڑھے تین بجے شروع ہوا تو اس وقت تک پولیس فائرنگ اور اس کے نتیجے میں طالب علموں کی ہلاکت کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔ حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے ارکان سخت اشتعال کے عالم میں تھے۔ جب اس واقعہ پر بحث کا آغاز ہوا تو مسلم لیگ کے کئی ارکان نے بھی سخت الفاظ میں حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ مسٹر نور الامین نے جو صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے خود ایک قرار داد ایوان میں پیش کی جس میں دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ بنگالی کو بھی پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ یہ قرار داد ایوان میں متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ تاہم جذبات اتنے برانگیختہ ہو چکے تھے کہ اس کاروائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تحریک اس کے بعد بھی جاری رہی۔ 22 فروری کو ڈھاکہ میں ہڑتال ہوئی اور اگلے دن یونیورسٹی کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا گیا۔ ڈھاکہ میں کئی دن تک مظاہرین اور پولیس کے درمیان تصادم ہوتا رہا۔ گرفتار شدگان کو جب بھی پولیس عدالت میں لاتی تھی ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا اور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

لسانی تحریک کے نتائج

فائرنگ کے اس واقعہ کے بعد ہر سال اکیس فروری کا دن مشرقی پاکستان میں یوم شہداء کے طور پر منایا جانے لگا۔ جس جگہ پولیس کی فائرنگ سے زخمی ہو کر تین طلبہ گرے تھے وہاں پر شہید مینار تعمیر کیا گیا۔ فروری 1952ء کی تحریک کا فوری نتیجہ تو یہ نکلا کہ صوبائی اسمبلی نے بالآخر وہ قرار داد پاس کر دی جس کا وعدہ بنگالی زبان کے حامی طلبہ سے چار سال پہلے کیا گیا تھا۔ تیس ارکان پر مشتمل ایک پارلیمانی وفد بھی کراچی بھیجا گیا تا کہ وہ مرکزی

حکومت کو بنگالی زبان کو اس کا جائز مقام دینے پر قائل کر سکے۔ تاہم کراچی میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کو اب بھی حالات کی سنگینی کا احساس نہ ہوا۔ دس اپریل کو ایک بنگالی رکن نے دستور ساز اسمبلی میں بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا رتبہ دینے کی قرار داد پیش کی۔ اس ریزولیوشن پر بہت لے دے کے بعد تبدیلیاں کی گئیں اور پھر تبدیل شدہ قرار داد پر بحث موخر کر دی گئی۔ کہا گیا کہ اس پر دوبارہ گفتگو اس وقت ہو گی جب بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ اسمبلی کے سامنے آئے گی۔ سال کے آخر پر جب یہ رپورٹ آئی تو اس میں یہ مسئلہ گول کر دیا گیا تھا۔ (8) مرکزی حکومت کی آنکھیں کھلنے میں مزید دو سال لگے۔ تاہم اس وقت تک حالات کی باگ ڈور مسلم لیگ کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ فروری 1952ء کے واقعات نے ملک کے مشرقی حصے میں پارٹی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اب اس جماعت کے لئے صوبے میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے سرکردہ رہنما حتیٰ کہ اس سے تعلق رکھنے والے وزراء بھی صوبے کے کسی حصے میں آزادی سے آ جا نہیں سکتے تھے۔ صوبائی اسمبلی کے اندر موجود حزب اختلاف اب تک چند ہندو ارکان تک محدود تھی لیکن فروری کے سانحہ کے بعد اس میں مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے کئی ارکان بھی شامل ہو گئے اور انہوں نے ایوان میں اپنے لئے علیحدہ نشستوں کا مطالبہ کر دیا۔ کئی لیگی ارکان اسمبلی تو اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی نشستوں سے استعفے دے دیئے۔ طلبہ پر فائرنگ کے اس واقعہ کے بعد مشرقی پاکستان کی سیاست میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ اب یہاں ملکی حوالوں کی جگہ علاقائی حوالوں نے لے لی۔ ملک گیر سیاسی جماعتیں اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھیں۔ وہی جماعتیں آگے آئیں جن کا پروگرام بنگالیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے ازالے تک محدود تھا۔

1954ء میں جب مشرقی بنگال میں صوبائی انتخابات کا ڈول ڈالا گیا تو زبان کا مسئلہ پھر سے ابھرا۔ مسلم لیگ کو شکست ہوتی نظر آئی تو اس نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ لیکن یہ سیاسی چال بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اب وہ زمانہ گزر چکا تھا جب مسلم لیگ صوبے سے باہر کے لیڈر کو بھی مشرقی بنگال سے باآسانی منتخب کرا لیتی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح کی امداد کے باوجود مسلم لیگ انتخابات میں شکست فاش سے دو چار ہوئی۔

صوبائی اسمبلی کے 309 حلقوں میں سے صرف نو حلقوں میں اس کے نامزد امیدوار جیتے۔ پاکستان مسلم لیگ کا مشرقی پاکستان سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو تحریک کے دوران بطور طالب علم رہنما کے گرفتار ہوتا تھا جیل ہی سے الیکشن لڑا اور اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ اپریل کے مہینے میں جب بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کا آغاز ہوا تو اس وقت تک زبان کا سوال اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا۔ کہ دستور ساز اسمبلی کی کاروائی روکنا پڑی۔ یہ کاروائی تین ہفتے تک رکی رہی اور دوبارہ اس وقت شروع ہوئی جب فریقین ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ مئی 1954ء میں شہید ان ڈھاکہ کی قربانی بالآخر رنگ لائی اور بنگالی زبان کو بھی ایک قومی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ یہی بات اگر 21 فروری 1952ء سے پہلے تسلیم کر لی جاتی تو یہ احساس جنم نہ لیتا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں سے اپنا کوئی معقول سے معقول مطالبہ بھی بغیر لڑے بھڑے اور قربانی دیئے تسلیم نہیں کرا سکتے۔

باب 3

سندھ میں طالب علم سیاست

پاکستان کا دوسرا صوبہ جہاں نئے ملک کے قیام کے ساتھ ہی احساس محرومی بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا وہ سندھ تھا۔ اس احساس کا پہلا اظہار اس وقت ہوا جب کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے مرکز کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ احساس اس وقت شدید تر ہو گیا جب عوام کی خواہشات کے برعکس سندھ کی صوبائی حیثیت ختم کر کے اسے ون یونٹ میں مدغم کر دیا گیا۔ اسی دوران کراچی کی بڑھتی ہوئی طالب علم آبادی کو بھی بعض شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ یہاں بھی طلبہ نے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کے راستے کا انتخاب کیا۔ جلد ہی بعض ایسی سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوگئیں جن کے نتیجے میں سندھی طلبہ اور ان طلبہ کے درمیان جو مہاجر تھے یا پاکستان کے دوسرے صوبوں سے آ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے یا جن کے خاندان یہاں آباد ہو گئے تھے۔ دوری پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد یہ سوال اٹھا کر ملک کا دارالحکومت کس شہر میں قائم کیا جائے۔ جومختلف وجوہات کی بناء پر مرکزی حکومت نے کراچی کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ وجوہات سیاسی بھی تھیں اور معاشی بھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ کے بعض اہم رہنما مہاجر تھے اور ان کا پاکستان کے کسی بھی صوبے میں حلقہ انتخاب موجود نہیں تھا۔ ہندوستان کے کئی صوبوں سے ترک مکانی کر کے آنے والے بوجوہ لاہور یا راولپنڈی کے برعکس کراچی میں بسنا پسند کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے یہ رہنما کراچی میں مہاجر آبادی کا ارتکاز کر کے اپنا سیاسی دائرہ اثر بڑھا سکتے تھے۔

کراچی کو دارالحکومت بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے وفاق کے سپرد کر کے

سندھ کی ابھرتی ہوئی قومیتی تحریک کو کمزور کیا جائے۔ تقسیم ہند کے دوران وقوع پذیر ہونے والے مذہبی فسادات کے نتیجے میں لاہور اور راولپنڈی کے شہر تباہی کا شکار ہوئے تھے اور ان میں وفاقی حکومت کے عملے کی فوج ظفر موج کو ان کے اہل و عیال سمیت ٹھہرانا محال تھا۔ معاشی اعتبار سے کراچی اس لئے مفید تھا کہ یہ ہوائی ٹرانسپورٹ کا اہم مرکز بھی تھا اور یہاں ملک کی واحد بندرگاہ بھی واقع تھی۔ اس کے علاوہ کراچی سارے پاکستان سے بذریعہ سڑک و ریلوے لائن منسلک تھا۔ اس لحاظ سے یہ پاکستان کا صنعتی مرکز بننے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ تاہم کراچی کو مرکز کے حوالے کر کے سب سے بڑا نقصان سندھ کو ہوا جس کا یہ شہر معاشی اور تعلیمی مرکز تھا اور یہاں سے صوبے کو مختلف ٹیکسوں کی شکل میں سب سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ معاشی مسئلہ کے علاوہ تاریخی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر بھی سندھ کے لوگ کراچی کو مرکز کے سپرد کرنے کے خلاف تھے۔ قیام پاکستان کے وقت سندھ کو بمبئی سے علیحدہ ہوئے صرف بارہ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اہل سندھ نے قریباً نوے برس کے بعد اپنے اس صدیوں پرانے تشخص کو بحال کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ جس سے انگریز حکومت نے انہیں 1847ء میں محروم کر دیا تھا۔ اپنے تشخص کی بحالی کے لئے انہیں طویل جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ ان کے دماغ میں ابھی بمبئی پریزیڈنسی کے دور کی تلخ یادیں موجود تھیں اور وہ ہر اس کاروائی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے جس کے نتیجے میں سندھ کی وحدت کو نقصان پہنچتا نظر آتا ہو۔ چونکہ سند کی بیشتر آبادی دیہات سے تعلق رکھتی تھی اس لئے انہیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ کراچی جب وفاق کا حصہ بن جائے گا تو یہاں سندھی بولنے والے اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ شہر ترقی تو کرے گا لیکن وہ یہاں خود اجنبی بن جائیں گے۔ کراچی کے کاروبار اور ملازمتوں میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہوگا۔ چنانچہ جب کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی بات چلی تو صوبے میں اس کی شدید مخالفت کی گئی اور اس کاروائی کو سندھ کا سر کاٹنے کا نام دیا گیا۔

کراچی کے مستقبل کے بارے میں مرکزی حکومت اور حکومت سندھ کے درمیان ابھی خط و کتابت جاری تھی کہ سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے 30 جنوری 1948ء کو ایک قرارداد پاس کی جس میں واضح کیا گیا تھا کہ ''سندھی طلبہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی

تجویز کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر پورے سندھ میں استصواب کرایا جائے۔ کراچی چند افراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ سارے سندھی عوام اس کے مالک ہیں۔''
(1)اس کے باوجود جب نظر آیا کہ مرکزی حکومت اپنے فیصلہ پر عملدرآمد کرانے پر تلی بیٹھی ہے تو فیڈریشن نے اعلان کیا کہ 20فروری کو پورے سندھ میں ''یوم کراچی'' منایا جائے گا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے اس اعلان کو غیر سندھیوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کاروائی قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان کوئی تصادم ہوا تو یہ نہ صرف دونوں فریقوں کے لئے بلکہ صوبے کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس انتباہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حسب اعلان 20فروری کو''یوم کراچی'' منایا گیا۔ سندھ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں طلبہ سکولوں اور کالجوں سے غیر حاضر رہے اور مختلف شہروں اور قصبوں میں جلوس نکالے گئے۔ (2)

مئی 1948ء میں دستور ساز اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ کراچی کو مرکز کے حوالے کر کے اسے وفاقی علاقہ قرار دے دیا جائے۔ بالآخر 22جولائی 1948ء کو سندھ کی جانب سے تمام تر مخالفت کے باوجود گورنر جنرل کے حکم کے تحت کراچی کو بشمول اس کے ملحقہ علاقوں کے (جو812مربع میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے) مرکزی حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ کراچی کی علیحدگی کے نتیجے میں سندھ کو ہونے والے مالی نقصان کا تخمینہ 600سے 800بلین روپیہ لگایا گیا۔ اس نقصان کو وفاقی بجٹ سے پورا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ تاہم معاوضے کے طور پر جو رقم بالآخر ادا کی گئی وہ محض 100ملین روپے تھی۔ سندھ کو مالی لحاظ سے کئی مزید نقصانات اٹھانے پڑے۔ شہر کے وفاقی حکومت کے کنٹرول میں چلنے کے جانے کے بعد بھی صوبائی حکومت کراچی کے سب سے بڑا ہسپتال، شہر کے تمام کالجوں کی تدریسی عمارتوں اور ہاسٹلوں کے اخراجات ادا کرتی رہی کیونکہ مرکز نے انہیں خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ کراچی کے اولین صنعتی کمپلیکس ''سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ'' کا انفراسٹرکچر بھی صوبے کے خرچ پر تیار کیا گیا تھا مگر اب یہ بھی مرکز کے کنٹرول میں چلا گیا۔ سات سال کے بعد بھی کراچی شہر میں جو سندھ کی جائیداد موجود تھی اس کی مالیت 96 کروڑ 50لاکھ روپے تھی۔ کراچی کے سندھ سے علیحدہ کروائے جانے کے نتیجہ میں صوبائی بجٹ مستقل طور

پر خسارہ کا شکار ہو گیا۔50-1949 میں یہ خسارہ ایک کروڑ 76 لاکھ 58 ہزار روپے تھا۔ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ وفاقی حکومت صوبے کو 60 لاکھ روپے کی گرانٹ دے گی اور اس کے علاوہ وفاقی سیلز ٹیکس میں سے سندھ کے حصے کے طور پر 20 لاکھ روپے ادا کرے گی اور اس طرح یہ خسارہ پورا کیا جائے گا۔ مگر جو ہوا وہ یہ تھا کہ صوبے کو اس سے بہت کم رقم ملی۔ (3) کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی مخالفت میں سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سب سے آگے تھی۔ ابھی مرکز اور صوبائی حکومت کے درمیان اس مسئلے پر خط و کتابت جاری تھی کہ فیڈریشن نے 30 جنوری 1948ء کو ایک قرار داد مذمت پاس کی جس میں کہا گیا تھا کہ ''سندھی طلبہ کراچی کو صوبے سے علیحدہ کرنے کی تجویز کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر پورے سندھ میں استصواب کرایا جائے۔ کراچی شہر چند افراد کی ملکیت نہیں بلکہ سارے سندھی عوام اس کے مالک ہیں (4) جب قرار دادوں کا مرکزی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا تو فیڈریشن نے تجویز کی مخالفت میں صوبائی سطح پر احتجاجی مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں 20 فروری کو یوم کراچی منانے کا اعلان کیا گیا۔ اس دن سندھی طلبہ نے کراچی سمیت پورے صوبے میں کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور جلوس نکالے۔

خود مسلم لیگ کی صوبائی کونسل کراچی کو مرکز کے حوالے کرنے کی مخالف تھی۔ نہ صرف لیگ کی صوبائی شاخ نے اس اقدام کے خلاف قرار دادیں پیش کیں، بلکہ بعد میں جب 10 فروری کو یہ تجویز سندھ اسمبلی کے اجلاس میں لائی گئی تو وہاں بھی اسے رد کر دیا گیا۔ تاہم مرکزی حکومت کے اس اقدام کی جو مخالفت سندھ میں ہوئی وہ ملک کے مشرقی صوبے میں قومی زبان کے سوال پر چلنے والی تحریک کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے برعکس سندھ کی صوبائی سیاست پر جاگیردار چھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ حسب ضرورت کبھی مسلم لیگ میں اور کبھی اس کی مخالف جماعتوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ جاگیردارانہ سیاست کا بنیادی اصول یہ تھا کہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے کسی حربہ کے استعمال سے گریز نہ کیا جائے۔ چنانچہ بنگالی سیاستدانوں کے برعکس وہ بالعموم حکومت سے ٹکر لینے سے کتراتے تھے۔ اسی طرح سے پاکستان کے قیام کے اوائل میں سندھی طلبہ نہ صرف عددی اعتبار سے کم تھے بلکہ ان میں درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے

بہت تھوڑے تھے۔ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے طلبہ کی تعداد ان سے بھی کم تھی۔ ایم ایس ایف کی طرح کی طالب علم تنظیمیں کسی نہ کسی جاگیردار دھڑے سے وابستہ تھیں۔ ان وجوہات کی بناء پر سندھی طالب علموں کی اکثریت ابھی اس طرح کی عوامی جدوجہد چلانے کے قابل نہ ہوئی تھی۔ جس کی بنیاد مشرقی پاکستان میں طلبہ نے رکھی تھی۔

کراچی کے سندھ سے علیحدہ کر دیئے جانے کے نتیجے میں سندھ کے مقامی لوگوں اور کراچی میں تازہ وارد ہونے والوں کے درمیان ایک نفسیاتی دوری پیدا ہونا شروع ہوئی۔ جس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس دوری نے بعض اوقات شدید تناؤ کی شکل اختیار کی۔ کراچی مرکز کا حصہ تھا اس لئے یہاں پر باہر سے آ کر آباد ہونے والے اپنے آپ کو سندھی تصور نہیں کرتے تھے۔ 1949ء میں جب سندھ یونیورسٹی ابھی کراچی ہی میں تھی تو مرکزی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن نے اپنے ایک مراسلے میں اسے ہدایت کی کہ چونکہ اب کراچی صوبہ سندھ کا حصہ نہیں رہا اس لئے شہر کے سکولوں اور کالجوں میں سندھی زبان کو لازمی مضمون قرار دینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی کراچی کے اخبارات میں انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج میں کوٹہ پالیسی پر عملدرآمد پر سخت تنقید شروع ہوگئی۔ یہ تنقید بعض اوقات طنزیہ انداز بھی اختیار کر جاتی تھی۔ 10 جولائی 1949ء کو روزنامہ امروز کے کراچی ایڈیشن میں شائع ہونے والے ایڈیٹوریل میں کہا گیا تھا ’’ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے سندھی طالب علموں کو انجینئرنگ کالج میں داخلہ دیا گیا ہے۔ جبکہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے مہاجر طالب علموں کی درخواستیں مسترد کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پالیسی کے تعلیمی معیار پر برے اثرات مرتب ہوں گے...... حکومت سندھ نے حال ہی میں ایک سرکلر کے ذریعے ہدایت کی ہے کہ ہاسٹلوں میں داخلوں کے سلسلے میں سندھی طالب علموں کو ترجیح دی جائے۔ یعنی سب سے پہلے سندھی طلبہ کو جگہ دی جائے۔ اس کے بعد پاکستان کے دوسرے صوبوں کے طلبہ کو رکھا جائے۔ اور اگر ان کے بعد رہائش کی کوئی جگہ ہو تو وہ مہاجر طلبہ کو دی جائے۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کے پرنسپل جو خود غیر سندھی ہیں صوبائیت کے پرچار میں سندھیوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں اور انہوں نے ہاسٹلوں میں داخلے کے لئے اصلی سندھی کی شرط عائد کر دی ہے۔ اب تک اصلی سندھی کی اصطلاح

بھینسوں کی پہچان کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ لیکن اب محکمہ تعلیم نے بڑھا کر اسے انسانوں کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ (5)

کراچی کی غیر سندھی آبادی کے اسی طرح کے خیالات کا اظہار کراچی میونسپل کارپوریشن کی اس قرار داد میں بھی ہوتا ہے۔ جو 1954ء میں پاس کی گئی۔ اس قرار داد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ آج میونسپلیٹی کا سارا کام اردو میں ہوگا۔ یہ قرار داد اس دور میں پاس کی گئی جب کارپوریشن کے ملازمین کی اکثریت اردو زبان سے بخوبی واقف نہیں تھی۔ (6)اسی طرح سے جب کراچی یونیورسٹی کے امتحانات میں سندھی زبان کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ تو مقامی طلبہ نے احتجاجی جلسے اور جلوس منظم کئے۔ 1954ء میں سندھی کے تحفظ کی تحریک میں سندھ متحدہ طلبہ محاذ اور کئی مقامی ثقافتی و ادبی تنظیمیں شامل ہوگئیں۔ سندھی زبان کے ساتھ کئے جانے والے سلوک نے سندھی اور غیر سندھی آبادی کے درمیان خلیج کو وسیع کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ طلبہ تحریک بھی دو دھاروں میں بٹ گئی۔ آنے والے دنوں میں اس سے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ جب ون یونٹ کے قیام کا اعلان ہوا تو اس کے خلاف سندھی طلبہ میں تو شدید ردعمل پیدا ہوا۔ لیکن ون یونٹ کے خلاف چلنے والی تحریک سے (ماسوائے بائیں بازو کے مٹھی بھر طالب علموں کے) غیر سندھی طلبہ زیادہ تر غیر متعلق رہے۔

جب وزیراعظم محمد علی بوگرا نے 22 نومبر 1954ء کو ون یونٹ کی سکیم کا اعلان کیا تو سندھ کے سیاسی قائدین دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک دھڑے نے اس کی شدید مخالفت کی جبکہ دوسرے نے اس سکیم کو سندھ اسمبلی سے پاس کرانے کے لئے اپنی خدمات مرکز کے سپرد کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ شرط یہ تھی کہ سندھ کی وزارت اعلیٰ اس کے سپرد کر دی جائے۔ وفاق کی مختلف اکائیوں کو توڑ کر انہیں ایک صوبے میں مدغم کر دینا صوبائی خود مختاری کے تصور کی نفی تھا۔ اس کاروائی سے پیدا ہونے والے منفی اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ چھوٹے صوبوں کے وسائل ان کے اختیار سے نکل گئے، ان کا سرکاری ملازمتوں میں حصہ کم ہوگیا۔ سندھ جہاں ابھی تک بمبئی کے ساتھ ادغام کے نقصانات کا ازالہ نہیں ہو سکا تھا، ایک نئے اور پہلے سے بھی زیادہ نقصان دہ جبری اتحاد کا حصہ بنا دیا گیا۔ سندھ کی

شناخت ایک مرتبہ پھر ختم کر دی گئی۔ ون یونٹ کی مخالفت کرنے والی سیاسی جماعتوں میں سندھ عوامی محاذ پیش پیش تھا۔ محاذ نے جب صوبے میں ''یوم سندھ'' منانے کا اعلان کیا تو اس میں طلبہ نے نمایاں طور پر شمولیت کی۔ اسی طرح محاذ نے ون یونٹ کی سکیم کی مخالفت کے لئے جو مشاورتی کمیٹی تشکیل دی اس میں بھی سندھ کی طلبہ تنظیموں نے شرکت کی۔ سندھ کے نئے وزیراعلیٰ محمد ایوب کھوڑو نے سیفٹی ایکٹ کے تحت جب ون یونٹ کے مخالفین کی گرفتاریاں شروع کیں تو پابند سلاسل ہونے والوں میں سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ کالجوں اور سکولوں کے بہت طلبہ بھی شامل تھے۔ (7)

ون یونٹ کی مخالفت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے خاتمے کا مطالبہ بھی طلبہ میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا گیا۔

کراچی کی 1953ء کی طلبہ تحریک

قیام پاکستان کے بعد کراچی کی آبادی میں ایکدم اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس شہر کے مسائل بھی دو چند ہو گئے تھے۔ جو لوگ ان مسائل کی لپیٹ میں آئے ان میں طلبہ بھی شامل تھے۔ کراچی کے دارالحکومت بننے کے بعد باہر سے آنے والے سرکاری ملازم بڑی تعداد میں یہاں آباد ہو رہے تھے۔ صنعتوں کا بڑا حصہ بھی اب یہیں مرتکز ہو رہا تھا اور یہ بھی شہری آبادی میں اضافہ کا موجب بن رہا تھا۔ تاہم شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے سہولتیں مہیا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ کراچی کے تعلیمی اداروں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری 1953ء میں بھی صوبائی حکومت کے سپرد تھی جو کراچی کے مرکز کے حوالے کر دیئے جانے کے بعد صوبائی محاصل کے بڑے حصے سے محروم کر دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی اداروں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ کراچی میں زیر تعلیم طلبہ کا ایک حصہ پاکستان کے دوسرے صوبوں سے تعلق رکھتا تھا، اور اندرون سندھ سے بھی سینکڑوں طلبہ شہر میں زیر تعلیم تھے۔ مگر اکثر تعلیمی اداروں کے پاس ہاسٹل نہیں تھے۔ ان طلبہ کو پرائیویٹ طور پر رہائش کا بندوبست کرنا پڑتا تھا جو بہت مہنگا پڑتا تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والی پہلی نسل لٹ پٹ کے آئی تھی۔ چنانچہ والدین کی معاشی بدحالی کی وجہ سے بہت سے طلبہ کے لئے فیسیں ادا کرنا اور بسوں کے کرائے دینا بھی ممکن نہ تھا۔ شہر

میں ایک میڈیکل کالج موجود تھا لیکن ابھی تک اس کی طرف سے دی جانے والی ڈگریاں تسلیم نہیں کی جاتی تھیں۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھنے والے طلبہ تعلیم اور شعور کے اعتبار سے عام کالجوں کے طلبہ سے آگے تھے۔ ان میں سے کچھ طالب علموں نے جو کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر تھے کراچی میں بھی ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن(DSF) کا ایک یونٹ قائم کرلیا۔ اور طلبہ کو ان کے مسائل کے حوالے سے منظّم کرنا شروع کیا۔

1952ء میں انہی طلبہ نے ڈاؤ میڈیکل کالج میں ہڑتال کی کال دی۔ اس ہڑتال کے بعد ڈی ایس ایف وسیع پیمانے پر شہر میں متعارف ہوئی۔ جلد ہی کئی کالجوں میں تنظیم کا پینل الیکشن جیتا۔ سال کے آخر تک اس کی رکنیت اڑہائی ہزار تک پہنچ گئی۔ ڈی ایس ایف کی دو روزہ کونسل میٹنگ 12-11 اکتوبر کو کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں منعقد ہوئی جس میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے محمد سرور کو صدر اور ڈی جی کالج کے مرزا محمد کاظم کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ دوسرے دن پاس ہونے والے ریزولیوشن میں جو مطالبات پیش کیے گئے ان میں سے کچھ یہ تھے:

پاکستان کے دستور میں ہر شہری کے لئے تعلیم اور روزگار کے حق کی ضمانت، ٹیکنیکل تعلیم کے لئے موجود ناکافی سہولتوں کے پیش نظر ان اداروں کی تعداد میں اضافہ، فیسوں میں کمی، ہاسٹلوں کی فراہمی، ایوننگ کلاسوں کا اجرا، تعلیمی اداروں میں ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ضروری سہولتوں کی فراہمی۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان میڈیکل کونسل کی جانب سے ڈاؤ میڈیکل کالج کو تسلیم کیا جائے۔ ایک اور ریزولیوشن کے ذریعے دنیا بھر میں جاری قومی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کا اعلان کیا گیا۔ اکتوبر 1952ء کے کونسل سیشن کے فوراً بعد ڈی ایس ایف نے اپنے آرگن "Student Herald" کا اجرا کیا جس کے پہلے ایڈیٹر محمد نسیم مقرر ہوئے۔ سٹوڈنٹ ہیرلڈ پندرہ روزہ مجلّہ تھا اور طلبہ کے مسائل کی ترجمانی میں پیش پیش تھا۔ کراچی کے طلبہ کو اس وقت جو مسائل درپیش تھے ان میں فیسوں کا مسئلہ سرفہرست تھا۔ ایک ایڈیٹوریل میں اس مسئلہ کی شدت کو نمایاں کرنے کے لئے سٹوڈنٹ ہیرلڈ لکھتا ہے:

"درمیانے طبقے کے ایک عام گھرانے کی ماہوار آمدنی مبلغ 80 روپے سے لے

کر 150 روپے تک ہوتی ہے۔ جبکہ ایک بچی یا بچے کو تعلیم دینے کے لئے جو خرچہ ٹیوشن فیس، تعلیمی اور امتحانی اداروں کے دیگر اخراجات اور کتابوں کی خرید اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کی شکل میں برداشت کرنا پڑتا ہے کم از کم 50 روپے ماہوار ہوتا ہے۔ بالفظ دیگر سوسائٹی کے نچلے طبقات کا تو کیا ذکر، تعلیم کے دروازے درمیانے طبقے پر بھی بند کر دیئے گئے ہیں۔'' (8) اسی اداریئے میں کراچی کے مختلف تعلیمی اداروں کی فیسوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس وقت مبلغ 2 روپے سے لے کر 40 روپے ماہوار تک تھیں۔ ڈی ایس ایف نے شہر کے تعلیمی اداروں میں موجود منتخب طلبہ یونینوں کے صدور اور سیکرٹریوں پر مشتمل انٹر کالیجیٹ باڈی کے قیام کا بھی مطالبہ کیا جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے بی اے حلیم اور ڈی ایس ایف کے درمیان دیر تک وجہ تنازعہ بنا رہا کیونکہ وائس چانسلر مختلف حیلوں بہانوں سے معاملے کو لٹکائے رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم ڈی ایس ایف کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور بالآخر انٹر کالجیٹ باڈی (آئی سی بی) کا قیام عمل میں آ گیا۔ ان دونوں تنظیموں نے مل کر مختلف تعلیمی اداروں کی فیسوں کے بارے میں تجاویز مرتب کیں جنہیں انتظامیہ کے سامنے رکھا گیا۔ جب انتظامیہ نے طلبہ کے مطالبات کے بارے میں اپنا غیر ہمدردانہ رویہ تبدیل نہ کیا تو ڈی ایس ایف اور انٹر کالجیئیٹ باڈی نے 7 جولائی 1953ء کو یوم مطالبات منانے کا اعلان کیا۔

ڈی ایس ایف اور انٹر کالجیئیٹ باڈی کی کال پر 7 جولائی کو کراچی کے تمام تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی۔ طالب علم رہنماؤں نے جلسہ عام سے خطاب کیا جس میں قریباً 5 ہزار طلبہ نے شرکت کی۔ اس وقت کی کراچی کی آبادی کو مدنظر رکھا جائے (1951ء میں 1,068,959) تو یہ اجتماع کچھ کم نہیں تھا۔ حاضرین جلسہ میں یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کے علاوہ سکولوں کے طالب علم بھی شامل تھے جو ہائی سکول فیڈریشن کی کال پر آئے تھے۔ یہ تنظیم بھی بائیں بازو کے لوگوں نے قائم کی تھی۔ تقریروں کے بعد تمام حاضرین جلوس کی شکل میں دستور ساز اسمبلی کی بلڈنگ کی طرف چل پڑے تاکہ وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کو اپنے مطالبات پیش کر سکیں۔ راستے میں اس جلوس سے رکن دستور ساز اسمبلی اور آزاد پاکستان پارٹی کے صدر میاں افتخار الدین نے بھی خطاب کیا۔ انہوں نے تقریر میں وعدہ کیا کہ وہ طلبہ کے مطالبات دستور ساز اسمبلی کے آگے رکھیں گے۔ وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن ایک

دقیانوسی ذہن رکھنے والے بنگالی سیاستدان تھے۔ نومبر 1947ء میں انہی نے کراچی میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس میں انہوں نے سب سے زیادہ زور اس تجویز پر دیا تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ موصوف کا خیال تھا کہ قومی زبان کا تنازعہ اس طرح سے حل کیا جا سکتا ہے کہ عربی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا اعلان کر دیا جائے۔

جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے راستے میں پہلے الفنسٹن روڈ پر آنسو گیس کا استعمال کیا اور بعد میں لاٹھی چارج کے ذریعے اسے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا۔ جس کے نتیجے میں بہت سے طلبہ زخمی ہوئے۔ اس سے پہلے کہ انٹر کالیجیٹ باڈی کا وفد (جس کی قیادت محمد سرور اور آئی سی بی کے صدر اقبال احمد پروانہ کر رہے تھے) وزیر تعلیم سے ملتا، کراچی یونیورسٹی کے شاطر وائس چانسلر پہلے ہی وزیر موصوف کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ چند ایسے لوگ بھی تھے جو انتظامیہ کے اشارے پر چلتے تھے۔ انہیں وہ طلبہ کے نمائندوں کے طور پر ہمراہ لے گئے تھے۔ مسٹر اے بی اے حلیم کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ تعلیمی اداروں میں موجود غنڈہ عناصر کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے طلبہ میں پھوٹ ڈلواتے ہیں۔ ملاقات کے بعد انہوں نے پریس کو جو بیان دیا اس میں یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ طلبہ کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ بیان کا مقصد طلبہ تحریک میں کنفیوژن پھیلانا تھا۔ چونکہ وزیر تعلیم طلبہ کے نمائندہ وفد سے ملاقات کے لئے تیار نہ تھے اس لئے جلوس نے ان کی کوٹھی کا گھیراؤ کرنے کا فیصلہ کیا۔ طالب علموں کے دباؤ سے مجبور ہو کر وزیر تعلیم بالآخر مذاکرات کے لئے تیار ہو تو گئے مگر دو گھنٹے کی گفتگو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

8 جنوری کو اس سے بھی بڑا جلوس نکلا۔ طالب علموں میں اشتعال پھیلانے میں کراچی کے روزنامہ Dawn کے ایڈیٹر الطاف حسین نے بھی کردار ادا کیا۔ ان کا حکمران پارٹی کے اعلیٰ عہدے داروں سے قریبی تعلق تھا۔ چنانچہ اخبار نے اگلے دن مظاہرے کی خبر کو کہیں اندر کے صفحے پر غیر اہم واقعات کی رپورٹوں کے ساتھ جگہ دی اور اوپر سے یہ بھی لکھ دیا کہ طلبہ تو اصل میں منتشر ہو گئے تھے، جن لوگوں نے وزیر تعلیم کی کوٹھی کا گھیراؤ کیا وہ چند

شر پسند عناصر تھے۔ دوسرے دن جو مظاہرہ ہوا اسے حکومت نے پہلے سے بھی زیادہ تشدد سے روکنے کی کوشش کی۔ فریئر روڈ اور وکٹوریہ روڈ پر پولیس نے بے تحاشہ آنسو گیس استعمال کی۔ اسی دوران طلبہ کے جذبات ٹھنڈا کرنے کی خاطر وزیر داخلہ مشتاق احمد گورمانی نے راستے میں ان سے خطاب کرنے کی کوشش کی مگر ان کی تقریر کے دوران جب پولیس نے دوبارہ آنسو گیس کے شیل پھینکے تو جلوس بھڑ گیا۔ مظاہرین نے وزیر داخلہ کی کیڈیلک گاڑی نظر آتش کر دی۔ اس کے فوراً بعد پولیس نے وحشیانہ لاٹھی چارج کیا اور جب اس کے باوجود ہجوم منتشر نہ ہوا تو گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا۔ فائرنگ کے نتیجے میں سات طلبہ جاں بحق ہوئے جبکہ 112 زخمی ہوئے۔ شام تک کراچی میں معاملہ اتنا سنگین ہو چکا تھا کہ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو ریڈیو پر خطاب کرنا پڑا۔ تاہم ان کی تقریر مشتعل طلبہ اور شہریوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے میں ناکام رہی۔ طلبہ کے ساتھ وسیع عوامی ہمدردی کی بناء پر سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں اور سماجی تنظیموں نے 9 جنوری کو ہڑتال کی کال دے دی۔ ہڑتال کا اعلان کرنے والی جماعتوں میں جناح عوامی مسلم لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، اسلام لیگ، جماعت اسلامی سبھی شامل تھے۔ تاہم جب کمشنر کراچی ابو طالب نقوی نے طالب علموں کی جدوجہد کو کمیونسٹوں کی سازش قرار دے دیا تو جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ نے اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ حکومت حالات پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ اس نے شہر کے تمام تعلیمی ادارے 17 جنوری تک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

کراچی میں طلبہ کو بے پناہ تشدد سے دبایا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں جتنے طلبہ ہلاک ہوئے اس کی مثال پاکستان کی اس وقت تک کی تاریخ میں مفقود تھی۔ ریاستی مشینری کے اس سفاکانہ استعمال کی مذمت سارے ملک کی طلبہ برادری کی جانب سے کی گئی۔ 10 جنوری کو ملک بھر میں شہدائے کراچی کا دن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دن ملک میں ہر طرف کراچی کے طلبہ کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا بھرپور اظہار دیکھنے میں آیا۔ مشرقی پاکستان کے صدر مقام ڈھاکہ میں تمام تعلیمی ادارے بند رہے، اور بیس ہزار طلبہ نے شہر میں جلوس نکالا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں ایک بہت بڑے جلسہ عام میں شہدائے کراچی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ احتجاج میں حصہ لینے والوں میں مشرقی بنگال کی تینوں

معروف تنظیمیں یعنی ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین(EPSU)، ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ(EPSL)اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن شامل تھیں۔ اندرون سندھ سکھر اور شکار پور میں طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا، حیدر آباد میں ہڑتال ہوئی اور دو بڑے جلوس نکالے گئے۔ جن میں ہائی سکول کے طلبہ نے بھی حصہ لیا۔ اسی طرح سے پنجاب کے شہروں میں بھی احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ لاہور میں ڈی ایس ایف کی کال پر طالب علموں کا جلوس نکلا۔ راولپنڈی، سیالکوٹ، ملتان، لائلپور (فیصل آباد) اور منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بھی طلبہ نے مظاہرے کئے۔ (9) کراچی کے طلبہ کی جدوجہد کو اخبارات نے خراج تحسین پیش کیا۔ روزنامہ ڈان کا رویہ ابتدا میں معاندانہ تھا لیکن پولیس تشدد کے واقعات کے بعد اس میں واضح تبدیلی آ گئی اور اخبار نے طلبہ سے اظہار ہمدردی کرنا شروع کر دیا۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز اور امروز نے طلبہ کے مطالبات کی حمایت نیز انتظامیہ کے رویہ کی مخالفت میں کئی اداریے شائع کئے۔ امروز نے 12 جنوری کو ایک سپلیمنٹ چھاپا اور پورا ایک ورق طالب علموں کی جدوجہد اور ان پر ہونے والے ناروا تشدد کی مذمت کے لئے وقف کیا۔ اسی روز اخبار میں چھپنے والے اداریہ کا عنوان تھا ''کوئی نہ کوئی سرکاری افسر حواس کھو بیٹھا ہے۔'' اخبار نے فیض کی نظم ''ایرانی طلبہ کے نام'' بھی شائع کی۔ اس نظم کی مقامی حالات سے ایسی مطابقت پیدا ہو گئی تھی کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگلے دن اخبار میں شائع ہونے والے اداریہ کی سرخی تھی ''چرا کارے کند'' اور یہ بھی کراچی انتظامیہ کی بے حسی اور کوتاہ اندیشی کی مذمت میں لکھا گیا تھا۔ اخبار نے ''طلبہ کا خون'' کے عنوان سے درج ذیل نظم بھی چھاپی۔

لہو جو قوم کی پلکوں میں جھلملاتا تھا
سجا گیا ہے وطن کے اداس چہرے کو
یہ خون سینہ گیتی میں جب اترنے لگا
سنا ہے وقت کا دل کانپ کانپ جاتا تھا
جو اٹھ گئے وہ اٹھا تو لئے گئے لیکن
لہو کا رنگ کسے آئینہ دکھاتا تھا
فضا میں کس نے لہو کی پھوار چھوڑی تھی
یہ کون تھا جو ہوا میں دیئے جلاتا تھا

16 جنوری کو امروز نے احمد ظفر کے مندرجہ ذیل قطعات شائع کئے جن کا عنوان تھا ''یہ ستم ارض وطن!''

مشعل علم جلانا بھی بغاوت ہے یہاں
تیرگی ایک نئے روپ میں لہراتی ہے
سیل جمہور کے بھرپور تقاضوں کے عوض
دورِ چنگیز کی تصویر نظر آتی ہے

سینہ کوبی کی صداؤں سے جگر چاک ہوئے
مائیں روتی ہیں تو کونین کا دل روتا ہے
جس جگہ نورِ جگر چھین لئے جاتے ہیں
کیا وہی خطۂ تاریک وطن ہوتا ہے؟

تاہم قتیل شفائی کی جو نظم روزنامہ امروز میں انہی دنوں شائع ہوئی اور جس میں کراچی میں طلبہ پر کی جانے والی فائرنگ کی منظرکشی کی گئی تھی، وہ اس دور میں لکھی جانے والی شعری نگارشات میں بے مثال تھی۔ نظم کا عنوان تھا ''دھم دھم دھم دھم''

دھم دھم دھم دھم

راج محل کے نقارے پر چوٹ پڑی
دوڑو، بھاگو، پکڑو چاروں جانب شور اٹھا
رات کی اس تاریکی میں
علم کی مشعل ہاتھ میں لے کر کون آیا؟
کون ہے جس نے اندھیاروں سے یہ اجلی گستاخی کی؟
کون ہے جس کے ماتھے سے شب تاب شعاعیں پھوٹی ہیں؟
کس نے رات کی آنکھوں میں شفاف اجالے گھول دیئے؟

راج محل کے نقارے پر چوٹ پڑی
راجاؤں کے راجہ چوپٹ راجہ کا پیغام سنو:

راج محل کے رکھوالو
تم نے آج مقدس اندھیاروں کا ساتھ نبھایا
علم کی شمع ہاتھ میں لے کر آئے تھے کچھ دیوانے
تم نے مہر لگا دی جن کے ہونٹوں پر سناٹے کی

دھم دھم دھم دھم
دوڑو بھاگو پکڑو چاروں جانب شور اٹھا
لیکن آگے کون بڑھے؟
تاریکی پر کرنوں کے تیروں کی یوں بوچھاڑ ہوئی
اندھیارے میں گھائل گھائل رات کا سینہ چھلنی ہے
اجیالوں نے مستقبل کی ایک نئی تاریخ لکھی
وہ تاریخ کہ جس میں اجیالوں کا خون بھی شامل ہے۔(10)

1953ء کی جدوجہد میں جن طلبہ نے نمایاں طور پر حصہ لیا ان کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔ ان میں سے کئی ایک بعد میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں، پروفیشنل تنظیموں کے رہنماؤں کے طور پر مشہور ہوئے (عابد حسن منٹو، ذکی عباس، ڈاکٹر رحمان ہاشمی) اور کئی ایک کی شناخت بطور دانشور کے ہوئی (ڈاکٹر ایوب مرزا، ابو الفضل، شرف علی، علی امجد، حمزہ واحد بشیر اور صغبت اللہ قاری)۔ جیسا کہ اوپر تذکرہ ہوا اس جدوجہد کے دوران ہی حکومت نے اسے کمیونسٹوں کی کاروائی قرار دے دیا تھا۔

راولپنڈی سازش کیس کے بعد سے بائیں بازو کی تنظیمیں خاص طور پر حکومتی عتاب کا شکار تھیں۔ اس لئے ڈی ایس ایف کی قیادت نے کچھ عرصے کے بعد اسے آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اے پی ایس او) میں ضم کر دیا۔ جب حکومت نے 1954ء میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کے محاذوں پر پابندی لگائی تو اے پی ایس او بھی غیر قانونی تنظیم قرار دے دی گئی۔ یہ وہی سال تھا جب پاکستان حکومت نے سیٹو اور بغداد پیکٹ (جسے بعد میں معاہدہ سینٹو کا نام دیا گیا) میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ امریکی انتظامیہ گزشتہ چند

سالوں کی بین الاقوامی تبدیلیوں سے سخت پریشانی میں مبتلا تھی۔1949ء میں عوامی جمہوری چین ایک آزاد سوشلسٹ ملک کے طور پر وجود میں آ گیا تھا۔ اور اس نے سوویت یونین کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر لئے تھے۔کوریا کی جنگ بھی امریکہ کے لئے دردسر بنی ہوئی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں قومی آزادی کی تحریکیں جدید نوآبادیاتی نظام کے لئے چیلنج بنتی جا رہی تھیں۔ ایران میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت نے اینگلو پرشین آئل کمپنی کے کاروبار کو قومی تحویل میں لے لیا تھا اور ایران اور برطانیہ کے درمیان تیل کے مسئلے پر سرد جنگ جاری تھی۔ ادھر مصر کی حکومت اس معاہدے کو منسوخ کرنے پر تلی ہوئی تھی جس کے تحت برطانیہ کو نہر سویز کی حفاظت کی خاطر ایک مخصوص علاقے کے اندر اپنی فوج متعین کرنے کی رعایت حاصل تھی۔

عرب ملکوں میں قوم پرستی کی لہر اٹھ رہی تھی۔ امریکہ کو ان تمام تبدیلیوں کے پیچھے عالمی سوشلسٹ نظام کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ان ملکوں کی قیادت امریکہ کے پاس آ چکی تھی۔ جنہوں نے تیسری دنیا میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ امریکہ اور مغربی یورپ کی کثیر القومی کمپنیاں جو تیسری دنیا کی معدنیات اور زرعی پیداوار پر قابض تھیں ان تمام سیاسی تحریکوں سے خوفزدہ تھیں جن کا مقصد قومی آزادی اور خودمختاری ہو۔ امریکہ کی یہ خواہش تھی کہ تیسری دنیا کے حکمرانوں کو معاشی امداد اور قرضوں میں جکڑ کر نیز فوجی معاہدوں میں شامل کر کے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ امریکی بلاک کے معاشی اور سیاسی تسلط کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو دبانے میں اس کی مدد کریں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے جب امریکی اثر و رسوخ قبول کیا تو انہوں نے ایسی تمام تنظیموں کو نشانہ بنایا جو معاشی آزادی اور سیاسی خودمختاری کا پرچار کرتی تھیں۔ ان میں طلبہ تنظیمیں بھی شامل تھیں۔

اے پی ایس او پر پابندی لگا جانے کے بعد دو سال تک کراچی میں طالب علم محاذ پر خاموشی رہی۔ اکتوبر 1956ء میں جب برطانیہ نے نہر سویز پر قبضے کے لئے مصر پر حملہ کیا تو ملک کے کئی دیگر شہروں کی طرح کراچی میں بھی اس کے خلاف طلبہ نے مظاہرہ کیا۔ اسی عرصے میں حکومت نے ڈی ایس ایف اور اے پی ایس او کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو اپنی کٹھ پتلی تنظیم سے بھرنے کی کوشش کی۔ یہ مشن کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر

اے بی اے حلیم کے سپرد کیا گیا۔ پروفیسر حلیم قیام پاکستان سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ ہی میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن یک سرپرستی کے دوران ان کے تعلقات مسلم لیگ کے بااثر لوگوں کے ساتھ ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آ گئے اور اس اثر و رسوخ کی بناء پر جو انہیں مسلم لیگی حلقوں میں حاصل تھا۔ نئ قائم ہونے والی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ جب 1951ء میں کراچی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو انہیں کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری سونپ دی گئی۔ پروفیسر اے بی اے حلیم ہمیشہ سے طلبہ کا ایک گروپ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ انہی عناصر کی مدد سے انہوں نے 1956ء میں ''نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے نام سے ایک نئ تنظیم قائم کی۔

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن یا این ایس ایف بنائی تو گئی تھی حکومت اور انتظامیہ کی مدد کے لئے لیکن جو ہوا وہ اس سے مختلف تھا۔ جلد ہی طلبہ کے اس حصے نے جس کی نظریاتی وابستگیاں پرانی ڈی ایس ایف کے ساتھ تھیں نئ تنظیم کی قیادت پر قبضہ کر لیا۔ 1958ء میں مارشل لا لگ جانے کے نتیجے میں طالب علموں کی جدوجہد کا باب وقتی طور پر ختم ہو گیا۔ اور این ایس ایف بھی کچھ دیر کے لئے غیر فعال ہو گئی۔

باب 4

پنجاب میں طالب علم تنظیموں کی شروعات

پاکستان بننے کے بعد پنجاب میں وسیع پیمانے پر سماجی اتھل پتھل ہوئی۔ ایک طرف لاکھوں کی تعداد میں ہندو اور سکھ سرحد کی دوسری جانب نقل مکانی کر گئے۔ دوسری طرف بڑی تعداد میں مشرقی پنجاب اور بھارت کے دوسرے حصوں سے مسلمان پناہ گزین یہاں آ کر آباد ہوئے۔ متحدہ پنجاب میں سیاسی طور پر متحرک درمیانہ طبقہ کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ یہی حال طلبہ کا بھی تھا۔ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نیز دوسری سیکولر طلبہ تنظیموں میں مسلمان بھی شامل تھے اور کئی ایک قیادتی حیثیت بھی رکھتے تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد طالب علم سیاست میں فعال انداز سے حصہ لینے والوں میں بہت کمی پیدا ہوئی۔

یہ کمی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پورا کر سکتی تھی لیکن دو وجوہات کی بناء پر یہ اس کام کو سرانجام دینے میں ناکام ہوئی۔ اول یہ کہ مسلم لیگ کی قیادت طالب علموں کے سیاست میں حصہ لینے کی حمایت نہیں کرتی تھی اور تقسیم ہند سے پہلے صرف ایک محدود وقت کے لئے اس نے طلبہ کو عملی سیاست میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد اب اسے کسی متحرک طالب علم تنظیم کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ایم ایس ایف قائم تو رہی لیکن اب اس کی پوزیشن کاغذی تنظیم کی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی قیام پاکستان کے بعد ایم ایس ایف کے لیڈر اور کارکن ترقی کے ان مواقع سے کما حقہ استفادہ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے جو نئے ملک میں دستیاب تھے۔ مسلم لیگ کی حکومت قائم ہونے کے بعد انہیں سرکار دربار میں رسائی حاصل تھی۔ چنانچہ اب ان کے پاس ایم ایس ایف کی رہنمائی کے لئے وقت نہ

تھا۔

پنجاب میں طلبہ کو اس طرح کے مسائل کا سامنا بھی نہیں تھا جو کراچی کے طلبہ کو درپیش تھے۔ یہاں گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں کے علاوہ مقامی مسلمان انجمنوں کی جانب سے قائم کی گئی درسگاہیں بھی تھیں، مشنری ادارے بھی تھے اور ان کے علاوہ ہندو اور سکھ کمیونٹی کے چھوڑے ہوئے کئی ایک سکول اور کالج بھی موجود تھے۔ ہر کالج کے اپنے ہاسٹل تھے۔ ان اداروں پر داخلوں کے سلسلے میں دباؤ بھی نہیں تھا۔ کئی تعلیمی اداروں میں طلبہ کی تعداد ملک بننے کے فوراً بعد کم ہو گئی تھی۔ ملک کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن اس کی شرح کراچی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ پھر پنجاب میں ترقی کے نت نئے مواقع بھی پیدا ہو رہے تھے۔ غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی جائیداد تھی، ملازمتیں تھیں اور پنجاب اور سندھ کی نئی کالونیوں میں زرعی اراضی تھی۔ جب حقیقت اتنے جاذب نظر ہو تو خواب دیکھنے کی خواہش کم ہو جاتی ہے۔ پڑھے لکھے افراد کے اندر یہ فضا ذاتی ترقی کی خواہش تو پیدا کرتی تھی، لیکن کسی اعلیٰ آدرش کی خاطر جدوجہد کرنے کے لئے تھوڑے لوگوں ہی کو آمادہ کر سکتی تھی۔

پنجاب میں اس دور میں دو نئی طالب علم تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ایک کا تعلق دائیں بازو تھے دوسری کا بائیں بازو سے۔ دسمبر 1947ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کے زیر اثر چند طالب علموں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی بنیاد رکھی۔

1949ء میں راولپنڈی میں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے طالب علموں نے ڈی ایس ایف قائم کی۔ بعد میں یہ دونوں تنظیمیں کراچی پہنچیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ارتقا کا جائزہ اسی کتاب کے باب ''طلبہ اور مذہبی تنظیمیں'' میں لیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور کی طرح راولپنڈی بھی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا۔ یہاں گورڈن کالج میں زیر تعلیم بعض طلبہ نے بائیں بازو کی اس تنظیم کا پودہ لگایا جس کی سرگرمیوں کا بڑا مرکز بعد میں کراچی بنا۔ راولپنڈی میں ڈی ایس ایف کی بنیاد رکھنے والوں میں پروفیسر خواجہ مسعود، ایوب مرزا، علی امام (بعد میں مشہور مصور) جلال خٹک، اے ایچ اسلم، امین راحت چغتائی اور اسلم شیخ تھے(1) ابتدا میں ڈی ایس ایف کا کوئی باقاعدہ منشور نہیں تھا۔ اس کا پروگرام صرف طلبہ کے تعلیمی مسائل حل کرانے تک

محدود تھا۔ جلد ہی ڈی ایس ایف کے کچھ فعال کارکن کراچی کے تعلیمی اداروں میں داخل ہو گئے اور انہوں نے وہاں سے اس کی داغ بیل رکھی۔ ان کے جانے کے بعد ڈی ایس ایف کی سرگرمیوں کا محور بھی کراچی بن گیا۔ (2)

1951ء میں ڈی ایس ایف نے شہنشاہ ایران کے دورہ لاہور کے موقع پر شاہ کے خلاف ایک پوسٹر نکالا۔ مقصد شاہ کے آمرانہ اقدامات کی مذمت کرنا تھا۔ اسی سال ڈی ایس ایف کے کارکنوں نے پنجاب میں ہونے والے انتخابات کے موقعہ پر آزاد پاکستان پارٹی کے امیدواروں کی انتخابی مہم میں کام کیا۔ اسی طرح سے کمیونسٹ پارٹی کی ٹریڈ یونین تنظیموں میں بھی ڈی ایس ایف کے کارکنوں نے اعانت کی۔ 1952ء میں ڈی ایس ایف نے تین دوسری تنظیموں یعنی پنجاب سٹوڈنٹس کمیٹی، جناح عوامی سٹوڈنٹس فیڈریشن اور ایم ایس ایف کے ساتھ مل کر پنجاب سٹوڈنٹس فرنٹ قائم کیا۔ مشرقی پاکستان کے طلبہ کی طرح فرنٹ نے بھی بنیادی اصولوں کی کمیٹی (BPC) کی سفارشات کی مخالفت کی۔ کیونکہ یہ غیر جمہوری بھی تھیں اور ان کے تسلیم کر لینے سے نہ صرف ملائیت کو فروغ حاصل ہوتا تھا بلکہ صوبوں کے درمیان منافرت پھیلنا بھی یقینی تھا۔

کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ جانے کے بعد جو پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اس کے نتیجے میں ڈی ایس ایف پنجاب میں کمزور ہوگئی۔ اور اس کی سرگرمیاں جو پہلے ہی محدود تھیں اور بھی سمٹ گئیں۔ اگلے چند سالوں میں پنجاب میں جو مختصر طالب علم ایکٹیویٹی ہوئی وہ چند مظاہروں تک محدود تھی۔ ان مظاہروں پر بائیں بازو ہی کے اثرات تھے۔ 1952ء کے آخر میں لاہور کے طلبہ نے وزیراعظم کی خوراک کی پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر جلوس نکالا اس پالیسیوں کے نتیجہ میں ملک گندم کی قلت کا شکار تھا۔ اور مجبوری کی تحت امریکہ سے اسے درآمد کرنا پڑ رہا تھا۔ 1956ء میں جب برطانوی فوج نے نہر سویز پر قبضہ کرنے کے لئے مصر پر حملہ کیا تو لاہور کے طلبہ نے پھر بڑا زور دار مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرہ تیسری دنیا کے کمزور ملکوں میں سامراجی مداخلت کے خلاف تھا۔ اسی طرح سے جب 1961ء میں کانگو کے وزیراعظم پیٹریس لوممبا کو قتل کیا گیا تو لاہور کے طلبہ نے پھر سامراجی ملکوں کی جنگجوئی کی پالیسی کے خلاف اپنے جذبات کا زور وشور سے اظہار کیا۔ اس مظاہرہ میں بھی شہر کے کئی

تعلیمی اداروں کے طلبہ شریک ہوئے۔

پنجاب میں تحریک کی اگلی رو ایوب دور میں چلی جب تین سالہ ڈگری کورس اور یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف صوبہ بھر کے طلبہ نے جلوس نکالے۔1968ء میں راولپنڈی کے طالب علم عبدالحمید کی ہلاکت ایوب خان کے خلاف آخری حلے کا نقطہ آغاز بن گئی۔اس سانحہ کے خلاف ملک کے دونوں بازوؤں میں شدید ردعمل ہوا۔ اس واقعہ نے پنجاب میں طالب علموں کی ایسی بے مثال تحریک کو جنم دیا جو صوبے کے چھوٹے چھوٹے قصبوں تک پھیل گئی۔

باب 5

ایوب دور اور طالب علم تحریک

7اکتوبر1958ء کو بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے پاکستان کے آئین کومنسوخ کر کے فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ ابتداء میں سکندر مرزا کو صدارت کے عہدے پر بدستور قائم رکھا گیا لیکن بیس روز کے بعد استعفیٰ طلب کر کے اسے رخصت کر دیا گیا۔ اسی رات ایوب خان نے صدارت کا منصب سنبھال لیا اور وزیراعظم کا عہدہ ختم کر دیا۔ اس طرح ایوب کی ذات میں تین عہدے جمع ہو گئے ۔ یعنی صدرمملکت کا عہدہ، افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر کا عہدہ اور مارشل لال کے ناظم اعلیٰ کا عہدہ۔ اس کے بعد شخصی حکمرانی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس میں تمام تر اختیارات صدر کی ذات میں مرتکز کر دیئے گئے تھے۔ مارشل لاء کے اعلان کے ساتھ ہی تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ جنوری1959ء میں طلبہ تنظیموں کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں کچھ عرصے کے لئے ملک بھر میں قبرستان کی سی خاموشی طاری ہوگئی۔ ملک کی تاریخ کے گیارہ سالوں میں افسر شاہی نے سیاسی جماعتوں میں اس قدر اکھاڑ پچھاڑ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مارشل لاء کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ گورنر جنرل غلام محمد کے دور میں ملک کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ بشمول کابینہ اور پارلیمانی پارٹی کے گورنر جنرل کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی۔ مغربی پاکستان کی بیشتر سیاسی جماعتوں کی قیادت پر جاگیردار قابض تھے جن کی سیاست میں جدوجہد کا کوئی مقام نہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں بھی ابھی تک کوئی بڑی سیاسی جماعت ابھر کر سامنے نہ آئی تھی۔

ایوب آمریت کے دس سال کے عرصے میں طالب علموں نے کئی لحاظ سے وہی

فریضہ سرانجام دیا جو جمہوری معاشروں میں سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری تصور کیا جاتا ہے۔ جب چاروں جانب سناٹا چھا گیا تو نوجوان طلبہ نے اپنے گریبانوں کا پرچم بنا کر آمریت کو للکارا۔ طلبہ کا ایوب آمریت کے ساتھ مقابلہ مارشل لاء نافذ ہونے کے تین سال بعد شروع ہوا۔ ابھی ملک میں مارشل لا پورے زوروں پر تھا اور فوجی عدالتیں معمولی جرائم پر شہریوں کو سزائیں دے رہی تھیں کہ دو واقعات طالب علموں میں ہلچل کا باعث بنے۔ جنوری 1961ء میں کانگو کے مقبول قوم پرست رہنما اور وزیراعظم پیٹریس لوممبا کو قتل کر دیا گیا۔ چونکہ لوممبا کا تنازعہ ان کثیر القومی کمپنیوں کے ساتھ چل رہا تھا جو نو آزاد کانگو میں تانبے کی کانوں پر قبضہ جمائے بیٹھی تھیں، اس لئے یہ تاثر عام ہو گیا کہ یہ قتل دراصل نو آزاد ملکوں کے خلاف عالمی سامراج کی سازش کا ایک حصہ ہے۔ پاکستان میں سیاسی جماعتیں اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ لوممبا کے قتل کے خلاف اس موقعہ پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کر سکتیں۔ چنانچہ ملک کے بڑے شہروں میں طلبہ نے اس واقعہ کی مذمت کے طور پر مظاہرے کئے۔ کراچی میں بھی اس سلسلے میں جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس میں شہر کے بائیں بازو کے طلبہ پیش پیش تھے۔ ظاہر ہے کہ مارشل لا حکام کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

اگلے مہینے یعنی فروری میں بھارت کے شہر جبل پور میں (فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان قتل ہوئے۔ پاکستان میں طلبہ کمیونٹی نے اس واقعے کی مذمت کے طور پر بھی مظاہرے کئے۔ کراچی میں 27 فروری کے جلوس کی تیاریاں جاری تھیں کہ شہر کی انتظامیہ نے ICB کی قیادت کو جو اس کاروائی میں پیش پیش تھی انتباہ کیا کہ مارشل لا کے ضابطے کسی بھی احتجاجی سرگرمی کی اجازت نہیں دیتے۔ اور اجازت کے بغیر جلوس نکالنے کی صورت میں ان کے خلاف کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ICB نے جلوس منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن طلبہ میں چونکہ اشتعال پھیلا ہوا تھا اس لئے بہت سے نوجوانوں نے آزادانہ طور پر ٹکڑوں میں بٹ کر مظاہرے شروع کر دیئے۔ عوام میں بھی سانحہ جبل پور کے بارے میں شدید جذبات موجود تھے۔ چنانچہ وہ بھی طلبہ کے ساتھ شریک ہو گئے اور جلد ہی ان سب کا پولیس کے ساتھ مقابلہ شروع ہو گیا۔ ان ہنگاموں کے نتیجے میں چار سو کے قریب لوگ گرفتار ہوئے۔ بعد میں 16 طالب

علموں کے علاوہ سبھی کو رہا کر دیا گیا۔ ان طالب علموں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ اگلے ماہ چھ طلبہ ایک ایک لاکھ روپے کی ضمانت پر رہا کر دیئے گئے (حسین نقی، رہنما کراچی یونیورسٹی، علی احمد، صدر ڈاؤ میڈیکل کالج یونین، انور سلیم سیکرٹری ڈاؤ سٹوڈنٹس یونین، سابق صدر حسن رضا قصوری، مختار شیخ اور مسعود جعفری) جب کہ چار طلبہ کو ایک ایک سال (فتح یاب علی خان، چیئرمین ICB، معراج محمد خان، نائب چیئرمین، شیر افضل ملک، جوہر حسین) اور چار کو چھ چھ ماہ کی سزائے قید سنائی گئی (امیر حیدر کاظمی، علی مختار رضوی، اقبال میمن اور احسن صدیقی) اور دو کو بری کر دیا گیا۔ ان سزاؤں کا مقصد طلبہ کو ہراساں کرنا تھا مگر جو ہوا وہ اس کے الٹ تھا۔ طلبہ میں غم و غصہ کی لہر پھیل گئی اور خم ٹھونک کر میدان میں نکل آئے۔ 17 اپریل کو کراچی کی طالبات نے ان سزاؤں کی مذمت میں احتجاجی جلوس نکالا۔ یہ جلوس مزار قائداعظم کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا ٹکراؤ پولیس کے گھوڑ سوار دستے سے ہو گیا۔ پولیس ایکشن سے 55 طالبات زخمی ہوئیں۔ یہ واقعہ طلبہ میں مزید اشتعال کا سبب بنا اور انہوں نے جوابی کاروائی کے طور پر امتحانات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ طالب علموں میں گرفتاریوں اور فوجی عدالتوں سے جانے والی سزاؤں کے خلاف ردعمل جب شدید سے شدید تر ہوتا گیا تو کراچی کی فوجی انتظامیہ اپنے رویہ کے بارے میں نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جون 1961ء تک تمام سزا یافتہ طلبہ کو رہا کر دیا گیا۔ (1) تاہم یہ لڑائیاں آنے والے واقعات کا صرف پیش خیمہ تھی۔ ایوب خان کے دور اقتدار میں طلبہ اور سرکاری مشینری کا بڑے پیمانے پر ٹکراؤ چار حوالوں سے ہوا۔ تین سالہ ڈگری کورس، یونیورسٹی آرڈیننس، معاہدہ تاشقند اور 1968ء کی بحالی جمہوریت کی جدوجہد۔

تین سالہ ڈگری کورس اور طلبہ

جلد ہی کراچی سمیت سارے ملک کے طلبہ ایوب خان کی حکومت کے خلاف ایک اور حوالے سے صف آرا ہو گئے۔ یہ حوالہ ایوب حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی نے فراہم کیا۔ اس پالیسی کی مخالفت میں طلبہ 1961ء اور 1962ء کے پورے دو سال ڈٹے رہے۔ حکومت نے ان کی حوصلہ شکنی کے لئے تمام ممکنہ ہتھکنڈے آزمائے۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس، پولیس ٹارچر، تعلیمی اداروں سے اخراج اور فوجی عدالتوں سے سزائیں، غرضیکہ

عقوبت کا ہر ایک طریقہ استعمال کیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز انہیں منزل مقصود حاصل کرنے سے نہ روک سکی۔ بالآخر آمر کو طلبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اقتدار میں آنے کے بعد جلد ہی دسمبر 1958 میں ایوب خان نے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ کمیشن قائم کرنے کا ظاہری مقصد تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا تھا۔ تاہم چند ماہ کے بعد کمیشن نے جو سفارشات حکومت کو پیش کیں ان پر آمرانہ نظام کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ 1960 کے تعلیمی سال سے کمیشن کی مرتب کردہ سفارشات پر عمل درآمد کا آغاز ہوگا۔ کمیشن کی وہ سفارشات جو خاص طور پر طلبہ کی ناراضگی کا باعث بنیں مندرجہ ذیل تھیں:

1- بی اے اور بی ایس سی کا ڈگری کورس جو اب تک دو سال کا تھا اس کی میعاد بڑھا کر تین سال کر دی جائے گی۔

2- یونیورسٹیوں کے علاوہ اب تعلیمی ادارے بھی داخلی امتحانات لیں گے۔ ان امتحانات کے لئے کل نمبروں کا 25% مخصوص ہوگا۔

3- امتحان میں کامیابی کے لئے کم سے کم نمبر اور فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن کے لئے نمبروں کا تناسب بڑھایا جائے گا۔

4- اعلیٰ تعلیم کو محدود کیا جائے گا۔ بعض اقسام کے طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

5- طالب علم تنظیموں پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے نیز ان کے سیاسی شخصیات سے میل جول رکھنے پر پابندی عائد کی جائے گی۔

6- تعلیمی اداروں کی فیسوں میں اضافہ کیا جائے گا۔

7- یہ بھی تجویز کیا گیا کہ جز وقتی تعلیم کے مواقع جن سے معاشی طور پر پچھڑے ہوئے طلبہ بہرہ یاب ہوتے تھے ختم کر دیئے جائیں، نیز تعلیمی اداروں میں طلبہ کو ڈسپلن کا پابند بنانے کے لئے انتظامیہ کو خصوصی اختیارات دیئے جائیں۔

تین سالہ ڈگری کورس غریب اور نچلے درمیانہ طبقے کے لئے خاص طور پر تکلیف دہ تھا۔ اس مطلب نہ صرف یہ تھا کہ اب والدین کو مزید ایک سال خرچہ برداشت کرنا پڑے

گا بلکہ طالب علم کو ملازمت کے حصول کے لئے بھی ایک اور سال انتظار کرنا ہوگا۔ ملک کے اندر تعلیم یافتہ لوگوں میں بے روزگاری عام تھی۔ یہ تصور کیا جاتا تھا کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری حصول روزگار آسان بنا دیتی ہے۔ ان حالات میں تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں رکاوٹوں سے تعبیر کیا گیا۔ فیسوں میں اضافہ، داخلوں میں پابندی اور انتظامیہ کو حاصل ہونے والے وسیع اختیارات جن کے ذریعے وہ طلبہ کو تعلیمی اداروں سے خارج کر سکتی تھی سارے ملک میں ہدف تنقید بنے۔ مشرقی پاکستان چونکہ معاشی اعتبار سے باقی ملک کے مقابلے میں زیادہ پسماندہ تھا اس لئے نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف سب سے شدید ردعمل اسی صوبے میں ہوا۔ یہاں رپورٹ کے منظر عام پر آتے ہی احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈھاکہ شہر نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف احتجاج کا مرکز بنا۔ جون 1961 کے بعد خاص طور پر مشرقی پاکستان کے طلبہ میں تین سالہ ڈگری کورس کے خلاف وسیع پیمانے پر بے چینی پھیلنے لگی۔ حکومت نے طلبہ اتحاد کو توڑنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے۔ 1960 میں این ایس ایف کے نام پر ایک حکومت نواز تنظیم قائم کی جا سکی تھی۔ جس کا مغربی پاکستان کی این ایس ایف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تنظیم آخر تک حکومت کے ساتھ وابستہ رہی مگر اس کا عام طالب علموں پر کوئی اثر و رسوخ قائم نہ ہو سکا۔ یکم اگست 1961ء کو ڈھاکہ میں مرکزی وزیر تعلیم فضل القادر چودھری کے جلسہ کو طلبہ نے الٹا دیا۔ اس ہنگامے کے نتیجے میں بہت سے طالب علم گرفتار ہوئے۔ 17 اگست کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور ملحقہ کالجوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کو کالعدم قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ 21 اگست کو سارے مشرقی پاکستان میں تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی اور ڈھاکہ شہر کی سڑکوں پر طلبہ نے مظاہرہ کیا۔ تعلیمی پالیسی کے خلاف جلد ہی مغربی پاکستان میں بھی ہلچل شروع ہوگئی۔ 1960 میں کراچی کے تعلیمی اداروں میں بائیں بازو کے طلبہ نمائندے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب تین سالہ ڈگری کورس ختم کرانے کا وعدہ کر کے آئے تھے۔ جون 1961 میں سزا یافتہ رہنماؤں کی رہائی کے بعد طلبہ میں پھر سے حرکت کے آثار نظر آنے لگے تو کراچی انتظامیہ نے اس کا سد باب کرنے کی غرض سے 9 طالب علموں کو ایک سال کے لئے شہر بدر کر دیا۔ (فتح یاب علی خان، معراج محمد خان، شیر افضل ملک، عبد

الودود، سید سعید حسن، جوہر حسین، آغا جعفر، اقبال میمن، نواز بٹ اور پھر حسین نقی، صدر کراچی یونیورسٹی یونین) ان کی شہر بدری کراچی تک محدود نہ رہی بلکہ انہیں حیدر آباد اور خیر پور ڈویژن میں بھی قیام کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کاروائی سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ حکومت کی توقعات کے برعکس تھا۔ کراچی بدر ہونے والے طلبہ جس جس شہر سے گزرے وہاں نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف جدوجہد کے بیج بوتے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تین سالہ ڈگری کورس کے خلاف تحریک تمام مغربی پاکستان میں پھیل گئی۔ اب ملک کے دونوں صوبوں میں جاری ایجی ٹیشن کے دھارے اکٹھے ہو گئے۔ 1962ء میں 12 طلبہ کو ایک سال کے لئے کراچی یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ ان طلبہ کی جانب سے جاری ہونے والے ایک ہینڈ بل میں ہڑتال کی اپیل کی گئی اور مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے گئے:

1- یونیورسٹی سے طلبہ کے اخراج کا حکم واپس لیا جائے۔
2- اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کی پالیسی ختم کی جائے۔
3- تین سالہ ڈگری کورس کی جگہ دو سالہ کورس کا اجراء کیا جائے۔
4- فیسوں میں 50 فیصد کمی کی جائے۔
5- یونیورسٹی آرڈیننس منسوخ کیا جائے۔
7- فیل ہونے والے طلبہ کو سپلیمنٹری امتحان دینے کی اجازت دی جائے۔
8- کرائے اور تفریح کے سلسلے میں طلبہ کو رعایت دی جائے۔
9- نصابی کتابوں کی سستے نرخ پر فراہمی یقینی بنائی جائے۔

ان مطالبات کی منظوری کے لئے جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

کراچی کے علاوہ سندھ کے دیگر شہروں، حیدر آباد، ٹھٹھہ، ٹنڈو جام اور سکھر میں طلبہ نے جلسے منعقد کئے اور تین سالہ ڈگری کورس کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح سے پنجاب کے کئی شہروں میں بھی نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف احتجاج ہوا۔ لاہور میں طلبہ کے ایک وفد نے وزیر تعلیم سے اسی مطالبہ کے سلسلے میں ملاقات کی۔ بہاولپور میں صادق ایجرٹن کالج کے اندر طلبہ نے ایک جلسہ کیا جس میں تین سالہ ڈگری کورس کے خاتمے اور کراچی یونیورسٹی سے طلبہ کے اخراج کے فیصلہ کو کالعدم قرار دینے کی مانگ کی گئی۔ گجرات میں زمیندارہ کالج

کے طلبہ نے شہر میں جلوس نکالا۔ جھنگ کی تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی اور طلبہ نے شہر کے میونسپل پارک میں تقریریں کیں اور پھر جلوس کی شکل میں سارے شہر کا چکر لگایا۔ جلوس کی قیادت کرنے والوں نے ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے سامنے وہی مطالبات دہرائے جو سارے ملک میں طلبہ کی آواز بن چکے تھے۔ اسی طرح سے ملتان میں بھی تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی اور طالب علموں کے جلوس نے سڑکوں پر گشت کی۔ تاہم تین سالہ ڈگری کورس کی سب سے زیادہ مخالفت مشرقی پاکستان میں ہوئی۔ اس جگہ طلبہ نے وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مطالبات کی فہرست میں عوام کے جمہوری مطالبات کو بھی شامل کیا۔ مشرقی پاکستان کی دونوں بڑی طالب علم تنظیمیں یعنیEPSLاورEPSU جو بالترتیب عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے زیر اثر تھیں نئی تعلیمی پالیسی کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔ جنوری 1962 کو عوامی لیگ کے رہنما حسین شہید سہروردی کو کراچی میں ''پاکستان دشمن سرگرمیوں'' میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تو اس سے طلبہ میں مزید اشتعال پھیلا۔ اب طلبہ تحریک کے ایجنڈے پر نئی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کے علاوہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور شہری آزادیوں کی بحالی جیسے سیاسی مطالبات بھی شامل ہو گئے۔ اس سے طلبہ کی تحریک عام جمہوری تحریک کے ساتھ جڑ گئی۔ چنانچہ طلبہ کے پلیٹ فارم سے کئی جانے والے مطالبات کی ڈھاکہ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن نے بہ زور حمایت کی۔ عوام کے اندر بھی طلبہ کی جدوجہد میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک فطری بات تھی کیونکہ ایک ایسے دور میں جب سیاسی جماعتیں مہر بلب تھیں۔ طالب علم عوام کے جمہوری حقوق کے حصول کی خاطر ایک آمر کے خلاف سینہ سپر ہو گئے تھے۔ مارچ کے مہینے میں ایوب خان نے نئے آئین کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس آئین کے ذریعے ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں نئے آئین کے اعلان نے جلتی پر تیلی کا کام کیا۔ صوبے میں پہلے ہی صوبائی خودمختاری کی شد و مد کے ساتھ مانگ کی جا رہی تھی۔ صدارتی طرز حکومت کے نفاذ کے بعد تمام تر اختیارات مرکز کے پاس چلے گئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی طلبہ تنظیموں نے صدارتی نظام کے نفاذ کے خلاف 15 مارچ کو عام سٹرائیک کا اعلان کر دیا۔ اس دن یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں ایک جلسہ عام میں طلبہ نے ایوب خان کے آئین کی کاپیاں نذر آتش

کیں۔

(2) 24مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے تین مطالبات پیش کئے جو سراسر سیاسی نوعیت کے تھے۔

(1) نیا آئین منسوخ کیا جائے۔

(2) ملک میں جمہوری نظام واپس لایا جائے۔

(3) تمام سیاسی قیدی بشمول سہروردی اور شیخ مجیب الرحمان رہا کئے گئے۔

یہ بھی اعلان کیا گیا کہ جب تک یہ مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ ہڑتال پر رہیں گے۔ مشرقی پاکستان میں فروری اور مارچ کے مہینے طالب علموں کی ایجی ٹیشن میں گزر گئے۔ اس دوران 200 کے قریب طلبہ گرفتار کئے گئے۔ اپریل کے وسط میں حکومت نے تنگ آ کر ڈھاکہ یونیورسٹی غیر معینہ عرصے کے لئے بند کر دی۔ تاہم طلبہ اور حکومت کی جنگ یونیورسٹی بند ہونے کے باوجود سلگتی رہی۔ آخر 17 ستمبر کو طلبہ کی جانب سے تمام ملک میں ہڑتال کی اپیل کی گئی۔ اس اپیل کا اثر زیادہ تر مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ہڑتال کے دن ڈھاکہ، جیسور اور چٹاگانگ میں نہ صرف تعلیمی ادارے بند رہے بلکہ ان شہروں میں کاروبار زندگی مکمل طور پر معطل ہو گیا۔ ڈھاکہ اور جیسور میں پولیس نے مظاہرین پر گولی چلا دی۔ فائرنگ کے نتیجے میں ڈھاکہ میں ایک شخص ہلاک ہوا جو کسی جگہ ڈرائیور کا کام کرتا تھا۔ زخمیوں کی تعداد 253 تک پہنچ گئی۔ یہاں مشتعل ہجوم نے وزیر مواصلات کی گاڑی کو آگ لگا دی۔ جب پولیس پبلک کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوئی تو بالآخر فوج طلب کر لی گئی۔ جیسور میں پولیس فائرنگ کے نتیجے میں 41 مظاہرین زخمی ہوئے۔ اگلے روز ڈھاکہ کے طلبہ نے فائرنگ کے خلاف ایک میل لمبا ماتمی جلوس نکالا جس میں تمام طلبہ و طالبات ننگے پاؤں شامل ہوئے۔ جلوس کے عقب میں آنے والے سیاہ ماتمی جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ ایک تعزیتی جلوس تھا جو مکمل خاموشی کے ساتھ بغیر کوئی نعرہ لگائے شہر کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ اور جسے دیکھ کر ہر قسم کی گاڑیاں احتراماً رک جاتی تھیں۔ جلوس کے شرکاء نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں فائرنگ سے ہلاک ہونے والے ڈرائیور کی نماز جنازہ ادا کی اور ہر سال 17 ستمبر کو ''یوم تعلیم'' منانے کا اعلان کیا۔ (3) اب تک طلبہ تحریک

ڈھاکہ اور دو ایک دوسرے بڑے شہروں تک محدود تھی۔ 17 ستمبر کو جو ہڑتال ہوئی وہ اس تحریک کو جیسور، سلہٹ ، باریسال، رنگ پور، بوگرا، کشتیہ، راجشاہی، بپنہ، دنیاج پور اور برہمن باڑیہ تک لے گئی۔ ان میں سے کئی ایک بہت چھوٹے شہر تھے۔ ڈھاکہ کے طلبہ پر ہونے والی فائرنگ کا مغربی پاکستان میں بھی شدید ردعمل ہوا۔ وہ شہر جو اب تک مظاہروں سے محفوظ تصور کئے جاتے تھے۔ اب ان کی زد میں آ گئے۔ مغربی پاکستان کا دارالحکومت لاہور انہیں میں شامل تھا۔ یہاں صوبائی گورنر نواب کالا باغ کی دہشت اور پنجاب پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں کا خوف اب تک طلبہ کو سڑکوں پر آنے سے روکے ہوئے تھا۔ اب اس شہر میں بھی مظاہرے شروع ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ جلوس کی شکل میں باہر نکلے تو ان کے ساتھ اسلامیہ کالج سول لائنز، ہیلی کالج، ایم اے او کالج، اینیمل ہسبنڈری کالج، لا کالج اور ایف سی کالج کے طلبہ بھی شریک ہو گئے۔ اسی طرح کے جلوس راولپنڈی اور لائکپور (موجودہ فیصل آباد) میں بھی نکالے گئے۔ ہڑتالوں کا سلسلہ کراچی سے شروع ہو کر پشاور تک پہنچ گیا۔ خیبر میڈیکل کالج میں ڈھاکہ فائرنگ کے خلاف ایک روزہ علامتی ہڑتال ہوئی۔ سکھر اور حیدر آباد میں بھی طلبہ نے احتجاجی جلسے منعقد کئے۔

مشرقی پاکستان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احتجاج میں شدت آتی گئی۔ 19 ستمبر کو ڈھاکہ میں ایک مرتبہ پھر ہزاروں طلبہ نے ماتمی جلوس نکالا اور میمن سنگھ میں برہنہ پا طلبہ اور طالبات نے مل کر مظاہرہ کیا۔ 17 ستمبر کی فائرنگ کے دوران زخمی ہونے والا ایک طالب علم بھی اس روز جاں بحق ہو گیا جس کی وجہ سے طلبہ میں غم وغصہ کی لہر شدت اختیار کر گئی۔ چنانچہ صوبائی وزیر تعلیم کو یقین دہانی کرانا پڑی کہ فائرنگ کی تحقیقات کے لئے ہائی کورٹ کا ایک جج مقرر کیا جائے گا، طلبہ کے خلاف قائم شدہ مقدمات ختم کئے جائیں گے، نیز زخمی ہونے والوں کو اور ہلاک ہونے والوں کے ورثا کو معاوضہ دیا جائے گا۔ وزیر تعلیم نے اس بات کا انکشاف بھی کیا کہ ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی نے تعلیمی پالیسی میں اہم تبدیلیوں کی سفارش کی ہے اور تین سالہ ڈگری کورس کے ختم کئے جانے اور فیسوں میں کمی کی توقع ہے۔ 20 ستمبر کو ڈھاکہ سے فوج بھی ہٹا لی گئی۔ ان یقین دہانیوں کی بناء پر جو صوبائی وزیر تعلیم نے کرائی تھیں ڈھاکہ کے طلبہ نے 22 ستمبر کو ہڑتال ختم کرنے کے فیصلہ کا اعلان

کیا۔ تاہم یہ فیصلہ جلد ہی تبدیل کرنا پڑا۔ کیونکہ اسی روز پولیس نے چٹاگانگ میں ہائی سکولوں کے طلبہ کے ایک جلوس پر فائرنگ کر دی جس سے دو بچے شدید زخمی ہو گئے۔ ستمبر کی ساری تحریک کے دوران ایوب خان ملک سے باہر دورے پر تھا۔ کسی کے سان گمان میں نہ تھا کہ طلبہ کی تحریک جنگل کی آگ کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیل جائے گی۔ ستمبر کے اوائل میں ایوب خان پورے اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ یورپ کے دورے پر روانہ ہوا تھا جہاں اسے تین ہفتے گزارنے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں سارے ملک کے طلبہ حکومت کے خلاف برسر پیکار ہو گئے تھے۔ ایوب کی واپسی سے ایک دن پہلے مشرقی پاکستان کے طلبہ نے پورے صوبے میں مظاہرے کرنے کا اعلان کر دیا۔ انتظامیہ نے جو اب سخت خوفزدگی کا شکار تھی اسی دن بیان جاری کیا کہ وہ طلبہ کی جائز شکایات فوری طور پر رفع کرنے کو تیار ہے۔ ایوب کے ملک میں پہنچتے ہی طلبہ کے اہم مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔ تین سالہ ڈگری کورس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ بھی مان لیا گیا کہ امتحانات ہر سال کی بجائے حسب سابق دو سالوں کے لئے لئے جائیں گے، سپلیمنٹری امتحانوں کی اجازت دے دی گئی، فیسوں میں کمی اور نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا وعدہ کیا گیا۔ تاہم جمہوری مطالبات کے بارے میں کوئی بات نہ کی گئی۔ طلبہ کا شعور صرف ایک حد تک بلند ہوا تھا۔ ملک کی سیاسی جماعتیں ہنوز صف بندی کر رہی تھیں۔ اس لئے طلبہ کو جو کچھ ملا وہ اس پر رضا مند ہو گئے۔

یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف تحریک

تین سالہ ڈگری کورس اور اس سے متعلقہ مسائل کے خلاف طلبہ کی جدوجہد ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک اور مسئلہ کے حوالے سے طلبہ اور ایوب حکومت میں ٹھن گئی۔ حکومت نے ایک نیا تعلیمی کمیشن قائم کیا تھا جسے Commisssion on Students Problems and Welfare کا نام دیا گیا تھا مگر جسے مرکزی ایجوکیشن سیکرٹری اور کمیشن کے چیئرمین کے نام کی مناسبت سے شریف کمیشن کہا جاتا تھا۔ کمیشن نے جو سوال نامہ جاری کیا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد سے خوفزدہ ہے نیز اس کے خیال میں طلبہ سڑکوں پر ہنگامے کرنے کے باوجود اس لئے امتحان پاس کر لیتے ہیں

کہ ڈگری حاصل کرنا آسان ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ حکومت سمجھتی ہے کہ طلبہ میں ڈسپلن کی کمی ہے اور اس کی وجہ تعلیمی اداروں میں انتظامیہ کا کنٹرول نرم ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی وضع کی گئی جسے صدر نے آرڈیننس کے ذریعے نافذ کر دیا۔ اس پالیسی پر بھی ملک پر مسلط آمرانہ نظام کی چھاپ بہت واضح تھی۔ ایک اہم تبدیلی جو اب لائی گئی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹیوں کے انتظامی ڈھانچہ میں جو تھوڑا بہت جمہوری عنصر تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ منتخب سینٹ کو جسے یونیورسٹی کی مجلس حاکمہ یا پارلیمنٹ کا درجہ حاصل تھا ختم کر دیا گیا اور اس کے اختیارات سینڈیکیٹ کے حوالے کر دیئے گئے۔ جس کی حیثیت ایک نامزد ادارہ کی تھی۔ اس نئے نظام میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چانسلر سیاہ وسفید کے مالک بن گئے۔ ایک اور تبدیلی کے ذریعے چانسلرز کمیٹی کو یہ اختیار تفویض کر دیا گیا کہ وہ کسی بھی طالب علم سے جو اس کے خیال میں ''قابل اعتراض سرگرمیوں'' میں ملوث ہو یونیورسٹی ڈگری چھین سکتی ہے۔ ''قابل اعتراض سرگرمیوں'' کی اصطلاح بہت وسیع تھی اور اس میں اخلاقی گراوٹ(Moral turpitude) سے لے کر سیاسی شخصیتوں کی صحبت میں بیٹھنا سبھی کچھ شامل کر دیئے گئے تھے۔ اس سے ملتی جلتی ایک شق پہلے بھی مختلف یونیورسٹی کے ضوابط میں موجود تھی لیکن اب جو تبدیلی لائی گئی وہ یہ تھی کہ ڈگری واپس لینے کے اختیارات سینڈیکیٹ کی بجائے چانسلر یعنی صوبے کے گورنر کو تفویض کر دیئے گئے۔ اس بات کے باوصف کہ نئی تعلیمی پالیسی کے کئی مثبت پہلو بھی تھے اور اسے تیار کرنے میں تعلیمی وسائنسی میدان کی بعض معروف اور قابل احترام شخصیات نے حصہ لیا تھا نئی پالیسی کے پس پشت بعض واضح سیاسی مصلحتیں کارفرما تھیں۔ حکومت کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس پالیسی کے ذریعے طلبہ کو کنٹرول کر کے ملک پر مسلط آمریت کو تحفظ فراہم کیا جائے۔

شریف کمیشن نے طلبہ کو سیاست سے الگ رکھنے کے لئے ماہانہ امتحانات کا نظام متعارف کیا۔ جو سالانہ امتحان کے علاوہ تھا۔ داخلی امتحانات کے لئے 25 فیصد نمبر مخصوص کئے گئے جو اساتذہ کی صوابدید پر دیئے جانے تھے۔ اس سے یہ تاثر پھیلا کہ حکومت اساتذہ اور تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے اختیارات میں اضافہ کرنا چاہتی ہے تاکہ ان کے ذریعے طلبہ کو دباؤ میں رکھ سکے۔ بعض اساتذہ تنظیموں مثلاً ویسٹ پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن

WPCTA نے بھی ان تجاویز پر تنقید کی۔ تاہم طلبہ میں نئی پالیسی کے لاف سخت ردعمل ہوا اور ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا جسے یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف جدوجہد کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تحریک 1963ء اور 1964ء کے دو سالوں پر محیط تھی۔ تر یک کا آغاز پنجاب یونیورسٹی سے ہوا ستمبر 1963ء میں پنجاب یونیورسٹی اور لاہور کے تمام کالجوں کے نمائندوں نے مل کر ''یونیورسٹی آرڈیننس تنسیخ کمیٹی'' کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کمیٹی میں شامل طلبہ کا تعلق دائیں بازو سے بھی تھا اور بائیں بازو سے بھی۔ کمیٹی کا کنوینز اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک تھا۔ کمیٹی نے ارکان اسمبلی، وزراء اور محکمہ تعلیم کے اہلکاروں کے سامنے اپنا موقف رکھنے کے لئے ایک وفد راولپنڈی بھی بھیجا۔ بالآخر طلبہ نے حکومت پر واضح کر دیا کہ اگر تین ہفتے تک طلبہ کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ راست اقدام پر مجبور ہو جائیں گے۔ تسیخ کمیٹی کے اس الٹی میٹم کا جواب حکومت نے یہ دیا کہ اس نے بارک اللہ خان کو جو تنسیم کمیٹی کا کنوینز ہونے کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے عنقریب منعقد ہونے والے انتخابات میں جمعیت کا امیدوار بھی تھا، دو سال کے لئے یونیورسٹی سے خارج کر دیا۔ یہ اعلان 2 نومبر کو ہوا۔ اس کاروائی کے ردعمل میں اگلے ہی روز 65 امیدواروں نے جو مختلف عہدوں کے لئے الیکشن لڑ رہے تھے یہ اعلان کیا کہ جب تک یونیورسٹی آرڈیننس منسوخ نہیں ہو جاتا۔ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ 4 ستمبر کو احتجاج کے طور پر شہر کے تمام تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہو گی۔

4 نومبر کو نہ صرف تعلیمی اداروں میں ہڑتال ہوئی بلکہ پنجاب یونیورسٹی، لاکالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلبہ نے مال روڈ پر مظاہرہ بھی کیا۔ چیرنگ کراس پر مظاہرین اور پولیس میں جھڑپ ہو گئی جس کے بعد بائیس طلبہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں احمد رضا قصوری، شمیم احمد خان، امتیاز سپرا، سجاد سپرا اور خالد رانجھا بھی شامل تھے۔ اس سے طلبہ میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ طلبہ کے ایک ہجوم نے وائس چانسلر کے دفتر پر حملہ کر دیا۔ دفتر کا فرنیچر اور شیشے توڑ دیئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وائس چانسلر بارک اللہ کے اخراج کا فیصلہ واپس لے۔ وائس چانسلر نے نہ صرف طلبہ کے مطالبے کو رد کر دیا بلکہ اسی روز ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلے کا دفاع بھی کیا۔

5 نومبر کو یونیورسٹی اور ملحقہ کالجوں کے طلبہ نے پھر مظاہرہ کیا۔ طلبہ نے اولڈ کیمپس ہال کے باہر مال روڈ پر دھرنا دے کر سڑک بلاک کر دی۔ پولیس نے جب انہیں ہٹانے کے لئے طاقت استعمال کی تو ان کا پولیس کے ساتھ ایک بار پھر تصادم ہو۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور طلبہ نے جوابی کاروائی کے طور پر خشت باری کی۔ خشت باری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پولیس نے چاروں طرف سے یونیورسٹی کی ناکہ بندی کر دی تھی اور طلبہ باہر نکلنا چاہتے تھے۔ اس کاروائی کے نتیجے میں 12 طلبہ اور پولیس کے 4 اہلکار زخمی ہوئے۔ تمام زخمیوں کو میو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ افواہ عام ہوگئی کہ بہت سے طلبہ پولیس کے ساتھ تصادم میں جاں بحق ہو گئے ہیں جب پولیس کے ہاتھ سے بات نکل گئی تو ستلج رینجرز کے دستے طلب کر لئے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کی حفاظت ان کے سپرد کر دی گئی۔ پولیس کے ساتھ تصادم کے دوران 58 طلبہ گرفتار کر لئے گئے۔ خاکسار رہنما اور صوبائی اسمبلی کے رکن حبیب اللہ سعدی کو بھی جو موقعے پر موجود تھے اور جنہوں نے پولیس افسروں کو طلبہ پر وحشیانہ تشدد کرنے سے منع کیا تھا حراست میں لے لیا گیا۔ انتظامیہ نے یونیورسٹی کو 4 دن کے لئے بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا 4 طلبہ پر کیا جانے والا پولیس ایکشن اس قدر ظالمانہ تھا کہ سیاسی جماعتیں اس کا نوٹس لئے بغیر نہ رہ سکیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما اور ممتاز قانون دان میاں محمود علی قصوری کے گھر اسی شام سیاسی رہنماؤں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مولانا مودودی، میاں ممتاز احمد خان دولتانہ، عبد الستار خان نیازی اور چودھری فضل الٰہی نے شرکت کی۔ یہاں صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ میاں محمود علی قصوری ایک دن پہلے ہی طلبہ کے مطالبات کی حمایت میں بیان دے چکے تھے۔ سیاستدانوں کی اس میٹنگ کا حکومت نے سخت نوٹس لیا اور اس کے بعد کئی دن تک صدر ایوب خان اور گورنر مغربی پاکستان طالب علموں کی ہلچل کو سیاسی جماعتوں کی سازش قرار دیتے رہے۔ ایوب خان کا کہنا تھا کہ یہ دراصل جماعت اسلامی کی کارستانی ہے جب کہ نواب کالا باغ کا کہنا تھا کہ اس کے پیچھے دو متضاد نظریات سے تعلق رکھنے والی پارٹیاں ہیں۔ (5)

روزنامہ کوہستان نے 5 نومبر کے ہنگاموں کی رپورٹ شائع کرتے ہوئے یہ خبر لگائی تھی کہ پولیس کاروائی کے نتیجے میں تین طلبہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس خبر کی بنیاد وہ

افواہیں تھیں جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے اور جنہیں اخبار کے چیف رپورٹر نے بغیر تصدیق کئے درست سمجھ لیا تھا۔ ایوب خان کی انتظامیہ اخبارات میں حکومت مخالف خبروں اور اداریوں سے پہلے ہی تنگ آئی ہوئی تھی اور ستمبر 1963ء میں آزادی صحافت پر پابندی عائد کرنے کے لئے پریس اینڈ پبلیکشنز آرڈیننس جاری کر چکی تھی۔ اخبارات نے اس آرڈیننس کے خلاف 6 ستمبر کو ملک گیر ہڑتال بھی کی تھی۔ چنانچہ روزنامہ کوہسان کے خلاف فوری طور پر ایکشن لیا گیا۔ اخبار کو دو ماہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اور نسیم حجازی، شیخ حامد محمود اور عالی رضوی کو جو بالترتیب اخبار کے چیف ایڈیٹر، منیجنگ ایڈیٹر اور ایڈیٹر تھے گرفتار کر کے لاہور ڈسٹرکٹ جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان کی ضمانت پر رہائی کئی دنوں کے بعد ہوئی۔

روزنامہ کوہستان تو دو ماہ کے لئے بند کر دیا گیا لیکن اس کی پھیلائی ہوئی افواہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دراصل حکومت جن مختلف طریقوں سے خبروں کو دباتی تھی اس کے نتیجے میں اس قسم کی افواہوں کو درست تسلیم کر لینے کا رجحان پیدا ہونا فطری امر تھا۔ 6 نومبر کو بہت سے طلبہ ''جاں بحق'' ہونے والوں کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کے لئے یونیورسٹی گراؤنڈ میں اکٹھے ہوئے۔ پولیس نے انہیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج شروع کیا۔ انتظامیہ نے لاہور کے مختلف کالجوں کے باہر پیش بندی کے طور پر پولیس متعین کر دی تھی۔ جو طلبہ یہاں سے اکٹھے ہو کر نماز جنازہ میں شرکت کے لئے باہر نکلے ان کی جھڑپیں بھی پولیس کے ساتھ شروع ہو گئیں۔ دوپہر تک شہر میں آٹھ مقامات پر پولیس نے طلبہ کے جلوس منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کیا۔ اب کل گرفتار طلبہ کی تعداد 60 ہو گئی۔ حکومت نے شہر کے تمام کالج 11 نومبر تک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ تعلیمی اداروں کے ہاسٹل پولیس کے ذریعے خالی کرائے گئے۔ کئی ہاسٹلوں میں طلبہ کو بارہ گھنٹے کے اندر کمرے خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ جن ہاسٹلوں کو پولیس نے گھیرے میں لے کر طلبہ کو باہر نکالا ان میں اسلامیہ کالج سول لائنز، ایم اے او کالج، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، ہیلی کالج، گورنمنٹ کالج اور لا کالج کے ہاسٹل شامل تھے۔ (6)

لاہور میں چلنے والی تحریک نے اگلے چند دنوں میں پنجاب کے کئی دوسرے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لائلپور کے تینوں کالجوں یعنی گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج

اور میونسپل کالج کے طلبہ نے انٹر کالجیٹ باڈی تشکیل دی اور 5 نومبر کے بعد ہر روز احتجاج میں حصہ لیا۔ 6 نومبر کو شہر کے گورنمنٹ کالج کے طلبہ کا پولیس سے ٹکراؤ ہوا جس کے نتیجے میں ایک پولیس اہلکار شدید زخمی ہوا اور اس کا موٹر سائیکل نذر آتش کر دیا گیا۔ طلبہ نے گرفتاریاں پیش کیں اور کل 64 طلبہ حراست میں لئے گئے۔ شہر کے تمام تعلیمی ادارے اگلے 4 دن کے لئے بند کر دیئے گئے۔ راولپنڈی میں بھی طلبہ نے جلوس نکالا، پولیس کے ساتھ تصادم کے بعد انہوں نے سرکاری بسوں کو نقصان پہنچایا۔ 20 طلبہ کی گرفتاری کے بعد شہر میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی اور ہر طرح کے جلسوں جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اسی طرح سے ملتان، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، سرگودھا، میانوالی اور منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں طلبہ نے مظاہرے کئے اور جلسوں میں گرفتار طلبہ کی رہائی اور یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی کے مطالبات پیش کئے۔ کراچی کے طلبہ رہنماؤں کی طرف سے لاہور میں ہونے والے پولیس ایکشن کی مذمت کی گئی۔ اسی طرح سے ڈھاکہ سنٹرل سٹوڈنٹس یونین نے پنجاب کے طلبہ کی حمایت میں قرار داد پاس کی۔ جس میں پولیس کی مذمت کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف مظاہرے نومبر کے آخر تک جاری رہے۔ ان کے نتیجے میں پہلے لائلپور زرعی یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ 9 نومبر کو پنجاب یونیورسٹی 7 دن کے لئے بند کرنے کا اعلان ہوا۔ جبکہ یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں میں تعلیمی سرگرمیاں 20 نومبر تک کے لئے معطل کر دی گئیں۔ 10 نومبر کو گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹیٹیوٹ ڈیڑھ ہفتے کے لئے بند کر دی گئی۔ 13 نومبر کو مغربی پاکستان کے سیکرٹری ہیلتھ نے اعلان کیا کہ میڈیکل کالج اور ڈینٹسٹری کالج کے جو طلبہ ہنگاموں میں ملوث پائے گئے انہیں تعلیمی اداروں سے خارج کر دیا جائے گا۔ پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے دو درجن طلبہ کے خلاف کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے ان سے طلبہ کو اکسانے کی جواب طلبی کی۔ ان میں سے 8 طلبہ کو تعلیمی اداروں سے خارج کر دیا گیا۔ اور 28 سے تحریری معافی نامے لکھوائے گرفتار شدہ طلبہ کو آہستہ آہستہ اور قسط وار ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کھول دی گئی۔

انتظامیہ کی سخت گیر کاروائیوں کے باوجود طلبہ میں بے چینی موجود رہی۔ تحریک

بظاہر ختم ہو گئی لیکن غم و غصہ اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ 1964ء میں لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے طلبہ کو ڈسپلن کی خلاف ورزی کا بہانہ بنا کر یونیورسٹی آرڈیننس کے تحت خارج کیا گیا۔ پنجاب کے کئی دیگر شہروں میں بھی یہی کاروائی دہرائی گئی۔ پشاور اور کراچی میں بھی تعلیمی اداروں کی انتظامیہ نے اسی طرح کا ایکشن لیا۔ مشرقی پاکستان میں بھی کئی طلبہ ڈگریوں سے محروم کر دیئے گئے۔ بالآخر 6اکتوبر کو کراچی میں دائیں اور بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے اکٹھے ہو کر ایک ''کل جماعتی ایکشن کمیٹی'' بنانے کا اعلان کیا جس کا مقصد یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ ایکشن کمیٹی نے طلبہ کا موقف واضح کرنے کے لئے انتظامیہ سے گفت وشنید بھی کی۔ جب اس کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہوا تو طلبہ تنظیموں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے مطالبات 20 نومبر تک تسلیم نہ کئے گئے تو وہ ایجی ٹیشن کا آغاز کر دیں گے۔ اس دوران ملک کی 5 سیاسی جماعتیں متحد ہو کر کمبائینڈ اپوزیشن پارٹیز یا COP تشکیل دے چکی تھیں اور انہوں نے 18 ستمبر کو ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا مشترکہ صدارتی امیدوار بنانے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ یکم دسمبر 1964ء کو طلبہ کی کل جماعتی ایکشن کمیٹی نے ڈی جے کالج سے مزار قائداعظم تک جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ جلوس کی تنظیم کے مطالبات تھے کہ

(1) طالب علم رہنماؤں کو رہا کیا جائے۔

(2) یونیورسٹی، آرڈیننس منسوخ کیا جائے۔

(3) قانون کا سہ سالہ کورس ختم کر کے دو سالہ کورس کا اجرا کیا جائے۔

(4) تعلیمی اداروں کی فیسوں میں 50 فیصد کمی کی جائے۔

(5) کالجوں میں پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں کا اجراء کیا جائے۔

انتظامیہ نے طلبہ کے مطالبات پر بات چیت کرنے کی بجائے پولیس تشدد سے جلوس منتشر کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لئے پہلے لاٹھی چارج کیا گیا اور جب طلبہ پھر بھی مزار قائداعظم کی طرف بڑھتے گئے۔ تو آنسو گیس کے شیل فائر کئے گئے۔ اگلے روز 6 طلبہ حراست میں لے لئے گئے۔ کراچی میں ہونے والی ہلچل کے اثرات جلد ہی اندرون سندھ تک پہنچ گئے اور طلبہ نے سکھر میں بھی کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور شہر میں جلوس نکالا۔

6دسمبر کو ایکشن کمیٹی کے ایک وفد نے محترمہ فاطمہ جناح سے سکھر میں ملاقات کی اور انہیں اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ حبیب جالب کی نظم ''بچوں پہ چلی گولی'' اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دوران کراچی کے تعلیمی اداروں میں ہڑتال مسلسل جاری رہی۔ جب اس کے خاتمہ کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو حکومت نے 7دسمبر سے انہیں غیر معینہ مدت کے لئے بند کرنے کا اعلان کر دیا وزیر تعلیم یاسین وٹو نے یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ صدارتی انتخابات کے انعقاد کے بعد یونیورسٹی آرڈیننس پر نظر ثانی کی جائے گی۔ 8دسمبر کو تعلیمی ادارے بند ہونے کے باوجود طلبہ نے کراچی میں احتجاجی جلوس نکالا۔ جلوس کے راستے میں کنویشن مسلم لیگ کا دفتر آتا تھا ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ اس پر پولیس نے جلوس پر فائر کھول دیا۔ جس کے نتیجے میں سال اول کا ایک طالب علم ہلاک ہو گیا اور بہت سے طلبہ زخمی ہوئے۔ ان واقعات سے تحریک میں شدت آ گئی اور حکومت کو اندرون سندھ میں بھی تعلیمی ادارے بند کرنا پڑ گئے۔ کراچی فائرنگ کا ردعمل تمام ملک میں ہوا۔ 9دسمبر کو لاہور کے طلبہ نے مال روڈ پر پولیس تشدد کے خلاف مظاہرہ کیا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ 10دسمبر کو پشاور، راولپنڈی سرگودھا اور حیدر آباد میں طلبہ کے جلوسوں کا پولیس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کو 5 جنوری تک بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ 11دسمبر کو طلبہ کی اپیل پر نسیم شہید کی تعزیت میں کراچی شہر میں ہڑتال ہوئی۔ اسی دن پشاور میں طلبہ کے ایک جلوس پر پولیس ایکشن کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ جس کے بعد پشاور یونیورسی سمیت شہر کے تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔ طلبہ تحریک کے اثرات پنجاب کے دور دراز کے شہروں تک پہنچ گئے اور منٹگمری، لائلپور، سیالکوٹ حافظ آباد اور جوہر آباد میں احتجاجی جلوس نکلے۔ اب تک سیاسی جماعتیں طلبہ کی تحریک سے علیحدہ رہی تھیں لیکن 16دسمبر کو جب محترمہ فاطمہ جناح نے بھی یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی کا مطالبہ کر دیا تو طلبہ تحریک اور ملک کی سیاسی پارٹیوں کی جمہوریت تحریک متحد ہو گئیں۔ 20دسمبر کو ملک کے دونوں صوبوں کی طلبہ ایکشن کمیٹیوں نے ایوب خان کو ہٹانے کی جدوجہد میں شمولیت کا اعلان کرتے ہوئے تمام ملک کے طلبہ کو ہدایت کی کہ وہ صدارتی انتخابات تک محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں کام کریں۔ طلبہ کا ایک حصہ پہلے ہی محترمہ فاطمہ جناح کے لئے کام

کر رہا تھا اور کراچی سے تو این ایس ایف کے پندرہ ارکان جن میں معراج محمد خان، نفیس صدیقی، علی مختار رضوی اور سعید حسن شامل تھے بنیادی جمہوریتوں کے تحت ہونے والے انتخابات میں کونسلر بھی منتخب ہو چکے تھے۔ ایوب خان نے انتخاب جیتنے کے لئے سرکاری مشینری کا بھرپور استعمال کیا۔ 2 جنوری 1965ء کو جو صدارتی انتخابات ہوئے ان میں ایوب خان جیت گیا۔ اس شکست نے ایوب مخالف کیمپ میں بد دلی پیدا کی اور طلبہ کی تحریک پر بھی منفی اثرات مرتب کیے۔ اگلے دو سال تک طلبہ بڑی حد تک خاموش رہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ نے بھی وقتی طور پر عوام کی توجہ داخلی مسائل سے ہٹا دی۔ تاہم جنگ کے بعد جب ملکی معیشت پر اس کے منفی اثرات ہر ایک کو محسوس ہونے لگے تو عوام میں پھر سے بے چینی کا اظہار ہونے لگا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس صورتحال سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے معاہدہ تاشقند کے فوراً بعد وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور کچھ دیر کے بعد ایوب کے خلاف چلنے والی مہم میں اہم اپوزیشن رہنما کی حیثیت حاصل کر لی۔

معاہدہ تاشقند کے خلاف ردعمل

ایوب خان نے 10 جنوری 1966ء کو معاہدہ تاشقند پر دستخط ثبت کیے۔ اس معاہدہ کے خلاف مشرقی پاکستان میں کوئی منفی ردعمل نہیں ہوا کیونکہ جنگ نے صوبے میں احساس تنہائی پیدا کیا تھا۔ جنگ کے دوران یہ احساس شدت سے ابھرا تھا کہ بیرونی حملے کی صورت میں مشرقی پاکستان کے عوام کے تحفظ کے لئے مرکزی حکومت نے کوئی بندوبست نہیں کیا اور اگر اس دفعہ یہ صوبہ حملے سے محفوظ رہا ہے تو اس کی وجہ صرف ہمسایہ میں واقع عوامی جمہوریہ چین ہے جس نے ہندوستان کو علاقے میں فوجی کاروائی سے روکے رکھا ہے۔ جنگ کے دوران مرکزی حکومت نے تمام تر توجہ مغربی پاکستان کو بچانے میں صرف کی تھی اور مشرقی پاکستان کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نفسیاتی صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں نے جن میں مجیب اور بھاشانی پیش پیش تھے۔ معاہدہ تاشقند کی حمایت کی۔ صوبے کے لوگوں نے جس طرح جنگ کے خاتمے پر سکھ کا سانس لیا تھا اسی طرح معاہدہ تاشقند کی بھی عوامی سطح پر پذیرائی ہوئی۔ تاہم مغربی پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں بہت سے لوگوں کو اس معاہدہ سے مایوسی ہوئی۔

1965ء کی جنگ سے پنجاب کی آبادی کا خاصا حصہ متاثر ہوا تھا۔ ایک طرف پنجاب کی سرحدی آبادی جنگ کی لپیٹ میں آئی تھی۔ تو دوسری جانب جنگ میں مارے جانے اور زخمی ہونے والے سپاہیوں اور افسروں کا بڑا حصہ بھی پنجاب سے تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر پنجاب کے بہت سے لوگوں نے جنگ سے جذباتی تعلق پیدا کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ صفدر میر اور حبیب جالب جیسے امن پسند شاعر بھی جنگی جنون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ حکومتی پراپیگنڈہ سے یہ سمجھا جارہا تھا کہ پاکستان جنگ جیت رہا ہے اور کشمیر کے مسئلے کے حتمی حل تک یہ لڑائی جاری رہے گی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بطور وزیر خارجہ ہزار سال تک جنگ لڑنے کا نعرہ لگایا تھا۔ ملک میں اس طرح کی ہیجانی کیفیت پیدا کر دینے کے بعد جب پاکستان حکومت نے جنگ شروع ہونے کے سترہ دن بعد ہی سکیورٹی کونسل کی جنگ بندی کی قرارداد تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو اس سے پنجاب میں کئی لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ فوج نے تو محاذ پر جنگ جیت لی تھی مگر اسے ایوب خان نے مذاکرات کی میز پر ہار دیا ہے۔ یہ تاثر رفع کرنے کے لئے جنگ بندی کی جگہ فائر بندی کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی تاکہ عوام کو باور کرایا جائے کہ ابھی دونوں ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں اور کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہونے کی صورت میں ایک مرتبہ پھر جنگ چھڑ سکتی ہے۔ تاہم حقیقت کی پردہ پوشی دیر تک نہ کی جاسکی...... معاہدہ تاشقند میں جب کشمیر کے بارے میں کوئی بات نہ کی گئی تو یہ خیال عام ہوگیا کہ حکومت عوام کو فریب دے رہی ہے...... معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے کہ پنجاب کے طول وعرض میں اس کے خلاف احتجاج کی لہریں اٹھنے لگیں...... معاہدہ تاشقند کی مخالفت میں طلبہ سب سے آگے تھے۔ طلبہ میں یہ بات عام تھی کہ حکومت نے تاشقند میں کشمیر کا سودا کرلیا ہے۔ 13 جنوری کو لاہور میں پنجاب یونیورسٹی اور مختلف کالجوں کے طلبہ اور پولیس کے درمیان میدان جنگ بنا رہا۔ یہ لڑائی جس میں ایک جانب سے آنسو گیس اور دوسری طرف سے اینٹوں کا عام استعمال ہوا کئی گھنٹے جاری رہی۔ اسی روز مال پر خواتین نے بھی جلوس نکالا۔ کئی عورتوں نے گود میں بچے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن کے اعزا واقربا جنگ میں مارے گئے تھے۔ پولیس نے طلبہ کے جلوس پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں چار طالب علم ہلاک ہوگئے۔ گرفتار ہونے والوں کی تعداد سیکڑوں میں

تھی۔ (7) 14 جنوری کو شہر کے تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔ تاہم احتجاج لاہور کے علاوہ راولپنڈی، ملتان اور پشاور تک پھیل گیا اور مزید طلبہ پولیس تشدد کا نشانہ بنے۔ لاہور میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ (8)

پنجاب کی طرح کراچی کے طلبہ میں بھی معاہدہ تاشقند کے خلاف ردعمل ہوا۔ این ایس ایف جو اس وقت تک کراچی کی سب سے بااثر طالب علم تنظیم تھی معاہدہ کے بارے میں پالیسی کے سوال پر دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ شفیع گروپ نے جو بعد میں کاظمی گروپ کے نام سے معروف ہوا۔ معاہدہ تاشقند کی حمایت کی جب کہ شیر افضل گروپ نے جسے پھر معراج محمد خان گروپ کا نام دیا گیا اس کی مخالفت کی۔ یہ تقسیم ایک لحاظ سے کراچی کے کمیونسٹوں کے دو دھڑوں کے باہمی اختلافات کی عکاسی بھی کرتی تھی۔ کاظمی گروپ کے پیچھے روس نواز دھڑا اور معراج گروپ کے پیچھے چین نواز دھڑا تھا۔ 1967ء میں جب شہر کا چین نواز، دھڑا مزید گروہ بندی کا شکار ہوا تو ڈاکٹر رشید حسن خان کی این ایس ایف ایک تیسرے گروپ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ این ایس ایف پہلے بھی عملاً کراچی تک محدود تھی اور باقی ملک میں اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس تقسیم در تقسیم نے اس کی قوت کو مزید نقصان پہنچایا۔

انہی دنوں ایوب خان اور بھٹو کے درمیان تاشقند کے حوالے سے اختلافات کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ دراصل بھٹو اس وقت وزارت چھوڑ کر میدان سیاست میں کودنے کی تیاری کر رہا تھا اور وہ اشاروں کنایوں سے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایوب خان نے تاشقند میں کچھ خفیہ معاہدوں پر بھی دستخط کیے ہیں جنہیں وہ عوام کے سامنے افشا کرنے سے خوفزدہ ہے۔ یہ افواہیں پنجاب میں مزید اشتعال پھیلانے کا باعث بنیں۔ جنوری کے تیسرے ہفتے میں کہیں جا کر حکومت نے حالات پر قابو پایا۔ 22 جنوری تک گرفتار شدہ طلبہ جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی رہا کر دیئے گئے۔ جنوری کے آخر میں پشاور اور راولپنڈی کے تعلیمی ادارے کھول دیئے گئے۔ تاہم لاہور میں یہ ادارے فروری کے آخر میں اور کراچی میں اس سے بھی بعد کھلے۔

1968ء کی جمہوری تحریک اور طلبہ

معاہدہ تاشقند کے دو سال بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے جنہوں نے ملک کی جمہوری تحریک میں تیزی پیدا کر دی اور اس کے نتیجے میں ایوب خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔ جنگ کی وجہ سے ملک کی معاشی صورتحال پر برے اثرات مرتب ہوئے تھے اور سرمایہ کاری کا عمل بھی رک گیا تھا۔ ایوب خان کے دورحکومت کے اواخر تک ملک کی دولت سمٹ کر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے چند صنعتکار گھرانوں میں مرتکز ہو چکی تھی۔ ایوب خان کی اپنی اولاد بھی اس کی نیک نامی میں چنداں اضافہ کا باعث نہ بنی۔ گوہر ایوب کے حوالے سے صدر کے اپنے خاندان کا شمار ملک کے بائس دولت مند ترین گھرانوں میں کیا جانے لگا اور ایوب خان پر اقربا پروری کے الزامات لگنے لگے۔ اس عرصے میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی ناکامی سے بھی ملک میں کاروبار پر برا اثر پڑا تھا جس سے غربت اور بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بے روزگاری آبادی کے غیر تعلیم یافتہ حصہ کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں تک پھیل گئی تھی۔ یہ نوجوان ملازمت کی درخواستیں ہاتھ میں لئے ایک دفتر سے دوسرے دفتر دھکے کھاتے پھرتے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس صورت حال کے سب سے تکلیف دہ مظاہر مشرقی پاکستان میں نظر آتے تھے لیکن مغربی پاکستان بلکہ اس کا معاشی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ پنجابی علاقہ بھی غربت اور بے روزگاری کا بری طرح سے شکار ہوا تھا۔ ملک میں موجود آمرانہ نظام نافذ ہونے کی وجہ سے احتجاج کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے تھے۔ 1968ء کے آخر میں جب نام نہاد دس سالہ دور ترقی کی تعریف میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سرکاری اخبارات نے زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے تو ہر شخص کو نظر آنے لگا کہ برسر اقتدار آمر اپنے دور حکومت کو مزید طول دینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس صورت حال نے ملک بھر کے عوام می حکومت کے خلاف شدید غم وغصہ پیدا کر دیا۔ رفتہ رفتہ احتجاج کی لہر اٹھنے لگی۔ حکومت نے اس لہر کو جب آمرانہ اقدامات سے کچلنے کی کوشش کی تو ایوب مخالف تحریک میں شدت آ گئی۔ ملک کی سیاسی پارٹیاں دیر تک عوام میں موجود ردعمل کی شدت کو نہ بھانپ سکیں۔ مارشل لا کے دس سال کے دوران یہ پارٹیاں ویسے بھی عوام سے رابطہ کھو چکی تھیں اور تنہا مارشل لا کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہ تھیں۔ چنانچہ جمہوری تحریک شروع کرنے میں کلیدی کردار طلبہ نے ادا کیا۔ اس تحریک کی آبیاری

طلبہ ہی کے خون سے ہوئی۔ طلبہ نے سوسائٹی کے دیگر طبقات کو خواب غفلت سے جگایا وکلاء، اساتذہ، صحافی، مزدور کسان اور شہری آبادی سے تعلق رکھنے والے غریب لوگ طلبہ کی بہادری اور جان نثاری سے متاثر ہو کر تحریک میں شامل ہوئے۔ ایوب مخالف جمہوری تحریک میں تیزی اس وقت آئی جب راولپنڈی میں پولیس فائرنگ کے نتیجے میں پولی ٹیکنک انسٹیٹوٹ کا ایک طالب علم عبدالحمید ہلاک ہو گیا۔ یہ واقعہ 7 نومبر 1968ء کو پیش آیا۔ اس کا ردعمل ملک کے تمام شہروں میں ہوا اور طالب علم کمیونٹی اس قدر مشتعل ہوئی کہ حکومت کو پیش بندی کے طور پر پاکستان بھر کے تعلیمی ادارے بند کرنے پڑے۔ راولپنڈی کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کرفیو کے باوجود شہر میں مظاہرے جاری رہے اور 9 نومبر کو پولیس فائرنگ سے دو مزید افراد ہلاک ہو گئے۔ 10 نومبر کو نوشہرہ میں طلبہ کے مظاہرے کے دوران پولیس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپ ہو گئی۔ یہاں بھی پولیس نے فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں ایک طالب علم یہاں بھی جاں بحق ہو گیا۔ عبدالحمید کی ہلاکت نے سیاسی جماعتوں کو حکومت مخالف ایجی ٹیشن شروع کرنے کے لئے فوری جواز فراہم کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک جلسہ عام میں خاص طور پر اس واقعہ کو ایوب حکومت کی مذمت کے لئے استعمال کیا۔ 13 نومبر تک ہنگامے مزید پھیل گئے اور حکومت نے بھٹو اور ولی خان کے علاوہ پیپلز پارٹی، نیپ اور کونسل لیگ کے کئی ایک رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ بھٹو کی گرفتاری نے تحریک میں شدت پیدا کر دی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو قائم ہوئے ابھی ایک ہی سال ہوا تھا اور بھٹو اس بات سے آگاہ تھا کہ جب تک اسے کسی مضبوط سماجی گروہ کی حمایت حاصل نہیں ہوتی وہ محض پارٹی کے بل بوتے پر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا۔ اس لئے بھٹو نے طالب علموں پر خصوصی توجہ دی۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں سوشلزم کی حمایت روٹی، کپڑا اور مکان کے وعدے اور محنت کش عوام کے لئے اصلاحات کا پروگرام پہلے ہی طلبہ کے ایک حصے کو متاثر کرتا تھا۔ بھٹو کی گرفتاری کا اثر یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کے طلبہ کے ایک حصے میں پیپلز پارٹی نے اپنی جگہ بنا لی۔ کئی طلبہ رہنما جن کی شناخت بائیں بازو کے حوالے سے ہوتی تھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بہت سے طلبہ پارٹی میں تو شامل نہ ہوئے مگر ان کے دل میں بھی بھٹو کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوا۔

اگلے چند ماہ کے دوران رفتہ رفتہ سارا مغربی پاکستان طلبہ کے مظاہروں کی لپیٹ میں آ گیا۔ طلبہ ریاستی مشینری کے جبر کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ پنجاب میں تحریک نے بڑے شہروں سے چھوٹے قصبوں کا رخ کیا۔ ان میں سے کئی قصبے ایسے تھے جہاں آبادی نے اس سے پہلے کسی بھی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اب بات لاہور، راولپنڈی، فیصل آباد اور ملتان تک محدود نہ رہی بلکہ مظفر گڑھ، شجاع آباد، میاں چنوں، وہاڑی، پاکپتن، چیچہ وطنی، دیپالپور، حویلی، ساہیوال، احمد پور شرقیہ، قصور، چونیاں، منڈی بہاؤ الدین، گجرات، جھنگ، سرگودھا اور چکوال تک پہنچ گئی۔ جاگیرداری اثرات غالب ہونے کی بنا پر اور مقامی بااثر افراد کے حکومت کے دست و بازو بنے ہونے کی وجہ سے یہاں کچھ عرصہ قبل کوئی شخص بھی حکومت مخالف جلسوں اور مظاہروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تحریک زلزلے کی شدید رو کی طرح چلی اور اس نے بڑے بڑے برج زمین بوس کر دیئے۔ طلبہ کے پر جوش نعروں ''گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو'' ایوب کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے، چینی چور، ہائے ہائے، نے برس ہا برس سے سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ جب ایسے طاقتور آمر کو برسرعام ''ایوب کتا'' کہا جانے لگا تو یہ احساس عام ہو گیا کہ شخصی حکومت کا دور اب آخری دموں پر ہے۔ طلبہ کی تحریک کے اثرات اردگرد کی دیہی آبادی پر پڑے جسے صدیوں تک تقدیر پرستی کا درس دیا گیا تھا۔ اس نے دیہات کے بے زمین کسانوں، دستکاروں اور مزارعوں میں اپنی قسمت بدلنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ابتدا میں تحریک یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ تک محدود تھی لیکن جلد ہی کالجوں کی طالبات اور سکولوں کے بچے بھی اس میں کود پڑے۔ مستقبل کی سیاست میں ناموری حاصل کرنے والے کئی لوگوں نے اپنا اولین سیاسی سبق اسی تحریک کے دوران سیکھا۔ طلبہ کی تحریک نے چھوٹے شہروں میں کس طرح وکلاء کو جدوجہد پر آمادہ کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اخباری رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے۔

'' ساہیوال ۔30 نومبر۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ڈیڑھ سو ارکان نے آج مقامی انتظامیہ اور پولیس کے متشددانہ رویہ کے خلاف بطور احتجاج مقدمات کی پیروی کے لئے عدالتوں میں حاضر نہ ہو کر مکمل طور پر بائیکاٹ کیا اور دوپہر کے وقت راؤ خورشید علی

خان ایڈووکیٹ کی زیر قیادت ایک پر امن جلوس نکالا۔ ان مقامات پر جلوس ایک ایک منٹ رکا رہا جہاں جہاں پولیس نے گزشتہ روز اور آج طلبہ کے پر امن مظاہروں پر لاٹھی چارج کیا تھا۔'' (9) اسی طرح اس خبر کو بھی ملاحظہ کریں۔

دیپالپور 30 نومبر۔ کل دیپالپور میں طلبہ کا ایک بہت بڑا جلوس نکلا جس کی قیادت ضلعی تحریک جمہوریت کے نائب صدر خان شفیق الرحمٰن کر رہے تھے۔ اس جلوس میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ شریک ہوئے جنہوں نے وکلاء کے پاس جا کر انہیں جلوس نکالنے کی ترغیب دی۔'' (10) طلبہ کی جدوجہد سوسائٹی کی دیگر پرتوں کو بھی جمہوری تحریک میں کھینچ لائی اس کی عکاسی مندرجہ ذیل خبر کرتی ہے۔

'' ساہیوال ۔ 30 نومبر۔ آج ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں گزشتہ روز ننگال انھیا ہائی سکول کے ہاسٹل سے گرفتار کیئے جانے والے 33 طلبہ کی درخواستیں پیش ہوئیں جنہیں عدالت نے مسترد کر دیا۔ اس کے علاوہ مقامی پولیس نے اسی سکول کے ہیڈ ماسٹر چودھری مشتاق احمد اور ماسٹر محمد اسلم طاہر اور برکات احمد کو توڑ پھوڑ اور طالب علموں کی اعانت کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ برکات احمد اور محمد اسلم کے خلاف ایک اور مقدمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے گزشتہ روز کے جلوس میں شمولیت کی تھی۔'' (11) '' ملتان 8 جنوری۔ ملتان میں آج کالجوں کے طلبہ کا پر امن احتجاجی جلوس نکلا یہ جلوس گورنمنٹ ڈگری کالج سے صبح ساڑھے نو بجے شروع ہوا۔ جلوس کی قیادت کالج کے پرنسپل میاں محمود احمد نے کی۔'' (12) پنجاب پولیس اس دوران مظاہرین سے اپنی روایتی سفاکی کا سلوک کرتی رہی۔ فیصل آباد میں پولیس نے جلوس میں شامل بعض طلبہ کو چنیوٹ بازار کے باہر نیم برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ (13) اسی طرح کا سلوک راولپنڈی میں بھی کیا گیا۔ تاہم طلبہ نے ہر قسم کے تشدد مقابلہ ثابت قدمی سے کیا اور جدوجہد میں کمی نہ آنے دی۔ سندھ میں طلبہ نے نہ صرف کراچی اور حیدر آباد اور سکھر بلکہ چھوٹے قصبات میں بھی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جیکب آباد میں طلبہ کے ایک جلوس نے حکمران پارٹی کے رکن اور صوبائی ڈپٹی سیکرٹری احمد میاں سومرو کی رہائش گاہ پر خشت باری کی اور کھڑکیوں کے دروازے توڑ دیئے۔ (14) شکار پور میں طلبہ کے جلوس پر لاٹھی چارج کے بعد مشتعل

ہجوم نے سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا۔ تین طلبہ گرفتار ہوئے۔ نومبر اور دسمبر کے دوران کراچی اور حیدر آباد میں طلبہ نے کئی عظیم الشان جلوس نکالے۔ حیدر آباد میں نکالے جانے والے 8 دسمبر کے جلوس میں شامل مظاہرین کی تعداد 20 ہزار کے لگ بھگ تھی اور اس میں ابتداء میں طالبات بھی شامل تھیں۔ اس جلوس پر شہر میں جا بجا پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں اور طلبہ کے مطالبات کی حمایت میں تمام شہر کے کاروباری ادارے تین گھنٹے تک بند رہے۔ (15) سرحد میں پشاور، مردان نوشہرہ بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خان میں طلبہ خاص طور پر متحرک تھے۔ 30 نومبر کو پشاور میں احتجاجی مظاہرے کے دوران پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہو گیا جس کے نتیجے میں مظاہرین نے سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا اور 18 مظاہرین حراست میں لے لئے گئے۔ 25 دسمبر کو پشاور میں طلبہ نے کنونشن لیگ کے جلسے میں ہنگامہ کر کے سٹیج پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد چوک یادگار اور قصہ خوانی بازار میں طالب علموں پر لاٹھی چارج ہوا۔ 28 دسمبر کو مردان میں مقامی کالج اور سکولوں کے طلبہ نے شہر کی سڑکوں پر ایک گھنٹہ تک مظاہرہ کیا۔ مغربی پاکستان میں طلبہ نے 1969ء کے نئے سال کا آغاز یوم سیاہ منانے سے کیا۔ یکم جنوری کو پشاور ، راولپنڈی، سیالکوٹ اور کئی دوسرے شہروں میں طلبہ اور طالبات نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر مظاہرے کئے۔ مغربی پاکستان سے ایوب دشمن تحریک مشرقی پاکستان پہنچی جہاں اگر تلہ سازش کیس کے حوالے سے حکومت کے خلاف لاوہ پک رہا تھا۔ یہ کیس 6 جنوری 1968ء کو رجسٹر ہوا تھا اور جیسے کہ بعد کے شواہد نے ثابت کیا یہ کیس بے بنیاد بھی نہ تھا۔ (16) تاہم حکومت کی بے اعتباری کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ بلکہ سازش کیس کے ملزموں کے خلاف پراپیگنڈہ ان کی مقبولیت میں اضافہ کا موجب بن رہا تھا۔ اس کیس میں مجیب کے علاوہ 27 دیگر افراد بھی گرفتار تھے۔ ان سب پر الزام تھا کہ انہوں نے مغربی بنگال میں اگر تلہ کے مقام پر بھارتی انٹیلی جنس کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی سازش تیار کی تھی۔ ابھی مقدمہ جاری تھا کہ 16 فروری 1969ء کو ایک ملزم سارجنٹ اظہار الحق جو فوج کی تحویل میں تھا مار ڈالا گیا۔ اگلے دن مرنے والے کے ماتمی جلوس میں کوئی دس لاکھ کے لگ بھگ افراد نے شرکت کی۔ (17)

اسی دوران ہی دسمبر 1968ء میں مشرقی پاکستان کی تین طالب علم تنظیموں نے مل کر ایک اتحاد کی بنیاد رکھی جس کا نام آل پاکستان سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی (SAC) طے ہوا۔ اتحاد میں شمولیت کرنے والوں میں EPSL کے علاوہ (Matia) EPSU اور (Menon) EPSU شامل تھے۔ ان کے اتحاد کی بنیاد ایک گیارہ نکاتی پروگرام تھا جس میں مجیب کے چھ نکات اور بھاشانی کی NAP کے کچھ نکات کے علاوہ طلبہ کے مخصوص مطالبات شامل تھے۔ مطالبات کی فہرست مندرجہ ذیل تھی۔ (18)

صوبائی تحویل میں لئے گئے کالجوں کی پرانی حیثیت بحال کی جائے۔

سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

کالجوں میں رات کی شفٹ شروع کی جائے۔

فیسوں کی شرح میں 50 فیصد کمی کی جائے۔

ہاسٹل کے اخراجات میں کمی کی جائے۔

بنگالی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

ساتویں کلاس تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دی جائے۔

مشرقی پاکستان میں میڈیکل یونیورسٹی قائم کی جائے اور میڈیکل کونسل آرڈر واپس لیا جائے۔

j پولیس ٹیکنیک کے طلبہ کا نصاب تعلیم مختصر کیا جائے۔

k طلبہ کے لئے ٹرین اور بس کے کرایہ میں رعایت کی جائے۔

l فارغ التحصیل طلبہ کے لئے روزگار کی گارنٹی دی جائے۔

m یونیورسٹی آرڈیننس ختم کیا جائے یونیورسٹیوں کو مکمل خودمختاری دی جائے۔

n نیشنل ایجوکیشن کمیشن اور محمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹوں کو کالعدم قرار دیا جائے۔

2- ملک میں پارلیمانی جمہوریت اور حق بالغ رائے دہی بحال کئے جائیں۔

(a) 3- وفاقی نظام حکومت قائم ہو اور مجلس قانون ساز حاکم اعلیٰ (Sovereign) ہو۔

(b)وفاقی حکومت کے پاس صرف تین محکمے ہوں یعنی دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی۔

4-پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کا ذیلی وفاق(Sub-federation) قائم کیا جائے جس میں

ہر اکائی کو علاقائی خودمختاری حاصل ہو۔

5-بنکوں انشورنس کمپنیوں اور بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔

6-ٹیکسوں مین نیز کسانوں سے وصول کئے جانے و مالیہ میں کمی کی جائے۔

7-مزدوروں کو مناسب اجرتیں اور بونس دیئے جائیں۔

8-مشرقی پاکستان میں طوفانوں کے کنٹرول کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

9-سکیورٹی قوانین اور مختلف امتناعی قوانین کا خاتمہ کیا جائے۔

10-سیٹو سینٹو اور دیگر فوجی معاہدوں کا خاتمہ کیا جائے۔

11-تمام سیاسی نظر بندوں اور اسیروں کو بشمول اگر تلہ سازش کیس میں گرفتار ہونے والوں کے رہا کیا جائے۔

آل پاکستان سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی نے (جو مشرقی پاکستان تک محدود تھی اور جس کا بعد میں مغربی پاکستان میں قائم ہونے والی ایکشن کمیٹی سے کوئی رشتہ نہ تھا) ایوب حکومت کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لینے کا اعلان کیا۔ ایکشن کمیٹی کی قیادت ڈھاکہ یونیورسٹی سینٹرل سٹوڈنٹس یونین کے پاس تھی۔ کمیٹی کا سربراہ ایک 26 سالہ نوجوان طفیل احمد تھا جس کی شعلہ بیانی کی ہر طرف دھاک تھی۔ کمیٹی کے گیارہ نکاتی پروگرام میں سوسائٹی کے تمام محروم طبقات کے مطالبات موجود تھے۔ چنانچہ یہ کسی طالب علم تنظیم کی بجائے سیاسی جماعت کا منشور بن گیا تھا۔ اس میں صنعتی مزدوروں کے لئے بھی اپیل تھی کیونکہ پروگرام میں ان کے لئے مناسب اجرت اور بونس کی مانگ کی گئی تھی، اس میں دیہات کے غریب کسانوں کا یہ مطالبہ بھی موجود تھا کہ مالیہ اور دیگر ٹیکس کم کئے جائیں۔ چونکہ پروگرام کی تیاری میں بائیں بازو کے طلبہ نے حصہ لیا تھا اس لئے اس میں بینکوں انشورنس کمپنیوں اور بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ بھی موجود تھا۔ صوبے کے عام طلبہ کو بھی

پروگرام میں کشش نظر آتی تھی کیونکہ اس میں فیسوں میں 50 فیصد کمی نیز ٹرین اور بس کے کرایوں میں کمی کے نکات بھی شامل تھے۔ درمیانہ اور نچلے درمیانے طبقے میں پروگرام کی قبولیت کی وجہ یہ مطالبہ تھا کہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور ملک بھر میں ہر ایک شخص کو روزگار کی ضمانت دی جائے۔ اس طرح سے ایکشن کمیٹی کے گیارہ نکاتی پروگرام نے صوبے بھر کے عوام کو طالب علم تحریک کا حصہ بنا دیا۔

(19) دسمبر 1968ء سے فروری 1969ء تک سارے پاکستان میں ایک ایسا طوفان اٹھا جس کی مثال ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مشرقی پاکستان میں اس طوفان کے تھپڑوں نے ہر شے ہلا کر رکھ دی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے سارے صوبے میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نوجوان طلبہ کا راج ہے۔ سیاسی جماعتوں کی کمزوری کے باعث SAC نے جلد ہی تحریک میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ جلد ہی مشرقی پاکستان کے تمام شہروں میں طلبہ کے مطالبات کے حق میں مظاہرے ہونا شروع ہو گئے۔ حکومتی اداروں کا تشدد جس قدر بڑھتا گیا طلبہ اور ان کی حمایت کرنے والے عوام کے جوش میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

عوام کے جوش و خروش کو دیکھ کر بالآخر سیاسی جماعتیں بھی میدان میں کود پڑیں۔ 8 جنوری 1969ء کو ملک کی آٹھ سیاسی جماعتوں نے مل کر ڈیمو کریٹک ایکشن کمیٹی DAC تشکیل دی۔ 17 جنوری کو ڈھاکہ میں نئے سیاسی اتحاد کے حامی طلبہ اور پولیس میں تصادم ہوا اور پولیس ڈھاکہ یونیورسٹی کے کیمپس میں داخل ہو گئی۔ طلبہ نے اگلے دن یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا۔ اس دن دوبارہ پولیس اور طلبہ میں تصادم ہوا۔ ایک سو کے لگ بھگ طلبہ شدید زخمی ہوئے اور 34 طلبہ گرفتار کر لئے گئے۔ ان دنوں ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ طلبہ پر پولیس تشدد کے واقعے کی مذمت کے طور پر اسمبلی میں حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے نیز آزاد ارکان اسمبلی کے سیشن سے واک آؤٹ کر گئے اور گورنر نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر اسمبلی کا سیشن ملتوی کر دیا۔ 20 جنوری کو احتجاجی مظاہرے شدت اختیار کر گئے۔ پولیس نے طلبہ کے جلوس پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں لا کالج کا ایک طالب علم جس کا تعلق EPSU سے تھا جاں بحق ہو گیا۔ ان واقعات نے سارے ملک میں ایوب دشمن تحریک میں تیزی پھیلا دی۔ پولیس تشدد میں

اضافہ کے نتیجے میں تحریک میں بھی تشدد کا رجحان پیدا ہو گیا۔عوام نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا۔ اگلے چند ماہ کے دوران مشرقی پاکستان میں سو کے لگ بھگ مظاہرین مارے گئے۔کئی شہروں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ تاہم عوام نے کرفیو کی پروا کیے بغیر احتجاج جاری رکھا۔مشرقی پاکستان میں تحریک شروع میں ڈھاکہ تک محدود تھی اور اس میں صرف طالب علم شامل تھے۔اب یہ چھوٹے شہروں تک پھیل گئی اور اس میں آبادی کے دیگر طبقات بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جن میں وکلا، اساتذہ اور عام سیاسی کارکن پیش پیش تھے۔ تاہم تحریک کی روح رواں طلبہ مزدور کسان اتحاد تھا۔آبادی کے بہت بڑے حصے کی شمولیت کی بناء پر جو انتہائی پر جوش بھی تھا صوبے کی انتظامیہ مشینری مفلوج ہو کر رہ گئی۔مظاہرین نے اب فیکٹریوں، ملوں اور سرکاری دفاتر کا گھیراؤ کرنا شروع کر دیا۔

اب تک مشرقی پاکستان کے طلبہ دوسرے صوبے میں ہونے والے پولیس تشدد کی مذمت میں مظاہرے کرتے تھے۔ڈھاکہ میں ہونے والے تشدد کا ردعمل مغربی پاکستان میں ہوا۔20 جنوری کو ہونے والی پولیس فائرنگ کی خبر مغربی پاکستان کے پریس میں شہ سرخیوں سے شائع ہوئی۔ اس خبر سے عوام اور طلبہ میں غم وغصہ کی لہر پھیل گئی۔ 21 جنوری کو راولپنڈی میں حکومت کے خلاف طلبہ اور عوام نے زبردست مظاہرہ کیا۔ پولیس کے ساتھ مظاہرین کی جھڑپ کے نتیجے میں راولپنڈی میں بھی پولیس نے فائر کھول دیا۔جس کے نتیجے میں دو افراد زخمی ہوئے ان میں سے ایک مقامی انٹرمیڈیٹ کالج کا طالب علم تھا۔ ڈھاکہ فائرنگ کے خلاف لاہور میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلبہ نے بھی بڑا جلوس نکالا۔ جھنگ میں تعلیمی ادارے اسی روز عرصہ دراز کے بعد کھلے تھے۔ یہاں طلبہ نے ڈھاکہ میں ہونے والے پولیس تشدد کی مذمت میں مظاہرہ کیا جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور تعلیمی ادارے ایک مرتبہ پھر بند کر دیئے گئے۔سرگودھا میں کالجوں اور سکولوں کے ہزاروں طلبہ بھی احتجاج کے طور پر سڑکوں پر نکل آئے۔ پشاور میں سکولوں کے بچوں نے جلوس نکالا۔جلوس کے شرکاء نے گاڑیوں پر پتھراؤ کیا چنانچہ کئی ایک بچے گرفتار کر لئے گئے۔

21 جنوری کو ڈھاکہ میں طلبہ نے گزشتہ روز جاں بحق ہونے والے طالب علم کی نماز جنازہ ادا کی۔ ڈھاکہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مرشد کی قیادت میں ایک ماتمی

جلوس بھی نکلا جس کے بارے میں اخبارات کی رائے تھی کہ یہ گزشتہ بیس سال میں نکلنے والے جلوسوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس روز پھر پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں بہت سے طلبہ زخمی ہوئے جن میں دس طالبات بھی شامل تھیں۔ مظاہرین نے اگلے تین دن تک ڈھاکہ میں سوگ منانے کا اعلان کیا۔ ڈھاکہ اور راولپنڈی کے واقعات نے ملک کے دونوں بازوؤں میں مظاہروں کے ایک نئے سلسلے کو جنم دیا۔ 22 جنوری کو ڈھاکہ میں برہنہ پا طلبہ نے تین میل لمبا ماتمی جلوس نکالا۔ راولپنڈی میں غائبانہ نماز جنازہ کے بعد پرتشدد مظاہرے شروع ہو گئے۔ جن میں پولیس اور مظاہرین میں تصادم کے نتیجے میں کئی طلبہ زخمی ہوئے۔ ایک سو سے زائد افراد حراست میں لے لئے گئے۔ کراچی میں طلبہ نے جیکب لائنز کی جامع مسجد میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ احتجاج کی رو ایک مرتبہ پھر سرحد تک پھیل گئی۔ یہاں تک کہ پورا پشاور ڈویژن طلبہ کے ہنگاموں کی زد میں آ گیا۔ پشاور شہر میں ڈھاکہ اور راولپنڈی کی فائرنگ کے خلاف کالجوں اور سکولوں کے طلبہ نے زبردست احتجاج کیا۔ احتجاج کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لئے یہاں بھی پولیس نے شدید لاٹھی چارج کیا۔ مردان شہر میں کالج کی طالبات نے حکومتی تشدد کی مذمت میں مظاہرہ کیا۔ طلبہ کی جدوجہد سے اردگرد کے دیہات تک متاثر ہوئے۔ چنانچہ موضع نوشہرہ کلاں اور موضع شیخاں میں سکول کے طلبہ کلاسیں چھوڑ کر جلوس کی شکل میں باہر نکل آئے۔ نوشہرہ کالج کے طلبہ نے بھوک ہڑتال کیمپ لگانے کا اعلان کیا اور پہلے دن نو طلبہ نے بھوک ہڑتال کی۔ طلبہ کی جمہوری جدوجہد کو کچلنے کے لئے ایوب نے قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کی مدد کی۔ مغربی پاکستان میں لاہور، کراچی، راولپنڈی اور گوجرانوالہ میں کرفیو نافذ کیا گیا اور یہ شہر فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔

ایوب مخالف جمہوری تحریک کی یہ لہر نومبر 1968ء میں شروع ہو کر مارچ 1969ء تک جاری رہی۔ رفتہ رفتہ اس میں طلبہ کے ساتھ ساتھ عوام کے دوسرے طبقات بھی شریک ہوتے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ اور عوام کی جانب سے پیش کی جانے والی قربانیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ نومبر میں چار افراد پولیس کے ہاتھوں مارے گئے اور ایک ہزار گرفتار ہوئے۔ اگلے چند ماہ میں جو ہوا وہ یہ تھا۔ دسمبر 1968ء اموات

11، گرفتاریاں 1,530، جنوری اموات 57، پولیس مقابلوں میں زخمی 1,424 اور گرفتاریاں4,710 اور گرفتار356 لوگ۔(20) ایوب مخالف تحریک کے دوران طلبہ کے اندر وسیع پیمانے پر بائیں بازو کے اثرات پھیلے۔ یہ اثرات تین طرح کے نعروں کی شکل میں نمودار ہوئے امریکی سامراج کی مخالفت، سرمایہ داری نظام کی مخالفت اور آمریت کی مخالفت، ان اثرات کے پھیلنے میں مختلف عوامل کا ہاتھ تھا جن میں بائیں بازو کی جماعتوں کا طلبہ میں اثر ونفوذ، عالمی سوشلسٹ تحریک کے اثرات، تیسری دنیا میں جاری قومی آزادی کی جنگیں (جن میں فلسطین اور ویتنام کی جدوجہد ہائے آزادی پیش پیش تھیں) وغیرہ شامل تھے۔ تاہم بائیں بازو کے اثرات کے نفوذ میں طلبہ کے اپنے مسائل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان میں تعلیمی سہولتیں مفقود تھیں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بجٹ کا بڑا حصہ فوجی ضروریات پر صرف ہوتا تھا۔ پاکستان امریکہ کے دباؤ کی وجہ سے ان فوجی معاہدوں میں جکڑا ہوا تھا جو سوشلسٹ ملکوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ ان فوجی معاہدوں کے باوجود جنگ کے موقع پر امریکہ پاکستان کی امداد کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ ضرورت کے وقت پاکستان کی مدد اگر کسی نے کی تھی تو وہ سوشلسٹ چین تھا۔ امریکہ اسرائیل کا سرپرست تھا جس نے ہزاروں فلسطینیوں کو اپنی سرزمین سے طاقت کے بل پر محروم کر دیا تھا۔ اسرائیل نے امریکہ کی شہ پر برادر عرب ملکوں کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بات بھی عام تھی کہ پاکستان کی غربت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کا بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور پاکستان کا سب سے بڑا قرض خواہ امریکہ ہے جو سود کے ذریعے پاکستان کی معیشت کا خون نچوڑ رہا ہے۔ چنانچہ بہت سے طالب علموں کی نظر میں امریکہ نہ صرف عالم اسلام اور تیسری دنیا کا جانی دشمن تھا بلکہ پاکستان کے عوام کی مصیبتوں کا سبب بھی تھا۔ امریکی سامراج کی مخالفت کے ساتھ ساتھ غیر وابستہ خارجہ پالیسی کا مطالبہ بھی طالب علموں کے مظاہروں میں کیا جانے لگا تھا۔

طالب علموں میں سرمایہ داری نظام کے خلاف غم وغصہ کی وجہ ملک میں موجود مہنگائی اور بیروزگاری تھی۔ یہ بات ہر ایک کے تجربے کا حصہ بن چکی تھی کہ پاکستانی سرمایہ دار اپنی خواہش کے مطابق اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں اور انہیں کوئی روکنے والا

نہیں ہے۔ حال ہی میں چینی کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اس کی بہترین مثال تھیں۔ ہر ایک کو نظر آ رہا تھا کہ پاکستان سرمایہ داروں کے لئے ایک محفوظ مارکیٹ بنا دیا گیا ہے جنہیں یقین ہے کہ وہ معیاری یا غیر معیاری جس طرح کی بھی اشیاء بنائیں گے لوگ انہیں ان کی منہ مانگی قیمت پر خریدنے پر مجبور ہوں گے۔ اس لئے یہ سرمایہ دار انڈسٹری میں ماہر انجینئر یا کاسٹ اکاؤنٹنٹ ملازم رکھنے کی بجائے کم تنخواہ لینے والے مستریوں اور منشیوں سے کام چلاتے تھے۔ جس کا نتیجہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کی شکل میں کھول رہا تھا۔ چنانچہ ایوب مخالف تحریک کے دوران لاہور انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلبہ نے جتنے بھی مظاہرے کئے ان میں درج ذیل مطالبات سرفہرست ہوتے تھے:

''تمام ذرائع آمدنی کو قومی ملکیت میں لے کر بے روزگار انجینئروں کو بلا تاخیر ملازمتیں مہیا کی جائیں۔ سرکاری شعبے میں فولاد سازی کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ بڑے کارخانے قومی ملکیت میں لئے جائیں۔'' (21) دراصل پاکستان کا نوزائیدہ سرمایہ دار طبقہ ابھی تک ذہنی اعتبار سے بالغ نہیں ہوا تھا۔ ویسے تو اس نے ماضی میں بھی کبھی جائز منافع اور لوٹ کے درمیان موجود خط امتیاز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن ایوب دور میں جب اسے ایک آمر کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی تو اس نے نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے لوٹ کھسوٹ کا عمل اتنے کھلم کھلا طریقے سے اور اتنے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا کہ عام آدمی کے لئے بھی اسے نظر انداز کرنا محال ہوگیا۔ اکثر لوگ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ملک میں موجود نجی بنکوں پر بڑے سرمایہ داروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اور وہ نہ صرف عام کھاتہ داروں کے سرمائے کو انڈسٹریاں قائم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں بلکہ بنکوں سے حاصل ہونے والے قرضوں کو بعد میں معاف بھی کرا لیتے ہیں۔ اس طرح سے عوام کے سرمایہ کو اللوں تللوں میں اڑانے یا ملک سے باہر بھجوانے اور قرضہ کی رقم معاف کرانے کی پریکٹس اتنی عام ہو چکی تھی کہ بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا تھا۔ سرمایہ داری نظام کے مقابلے میں سوشلسٹ نظام کا تصور طلبہ کے اچھے خاصے حصے میں مقبول ہو رہا تھا۔ یہ بات بھی سوشلسٹ نظام کے حق میں جاتی تھی کہ وہاں تعلیم، ملازمت، رہائش اور علاج معالجہ مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری متصور ہوتا ہے۔ رہ گئی جمہوریت تو اس کی

ضرورت کا احساس طلبہ کو اپنی روز مرہ زندگی میں ہوتا تھا۔ انہیں ہر شعبے میں آمرانہ رجحانات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پرانی نسل ان کو برداشت کر لیتی تھی لیکن طالب علموں کے لئے جو اپنے حقوق کا احساس رکھتے تھے اور جن کا خون گرم تھا ان رجحانات کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ گزشتہ دس سال سے ملک میں شخصی حکمرانی کا نظام رائج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں ہر طرح کی آزادیاں مفقود تھیں۔ سیاسی جماعتوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی تھیں۔ اخبارات پر قدغن تھا۔ پولیس حکومتی پالیسیوں میں تبدیلی کے خواہاں طلبہ کے ساتھ متشددانہ رویہ اپناتی تھی۔ مظاہرہ کرنے والوں پر بلا سوچے گولی چلا دی جاتی تھی۔ تعلیمی اداروں کے اندر بھی آمرانہ رجحانات کا دور دورہ تھا۔ سٹوڈنٹ یونینیں عملاً ختم کر دی گئی تھی اور یونیورسٹیوں میں سینٹ کا منتخب ادارہ بھی یونیورسٹی آرڈیننس کا شکار ہو گیا تھا۔

کالجوں کے پرنسپل اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر فرعون بن گئے تھے۔ ایک اخبار نے انہی دنوں اس صورت حال پر اداریہ رقم کیا تھا جس کے کچھ فقرے یہ ہیں۔ ''اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں کے سربراہ طلبہ بالخصوص طلبہ کے نمائندوں سے ملاقات یا معاملات پھر بحث وغور کے دوران ، جوروستم ، کا مظاہرہ لازم وملزوم نہ سمجھیں۔ بالخصوص جو تعلیمی سربراہ اور وائس چانسلر طالب علم نمائندوں کی شکل دیکھتے ہی مشتعل ہو جاتے ہیں ان سے بالخصوص یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنا رویہ اور اندازِ فکر بدلیں۔ یا اسے اپنے جاہ و منصب کے خلاف سمجھتے ہیں تو پھر وہ یونیورسٹی اور درسگاہ کی جگہ کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لیں جہاں طالب علم ان کی یکسوئی اور آرام میں مداخلت نہ کر سکیں۔ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں ایسے سربراہوں کی ضرورت ہے جو عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شفیق انسان اور ہمدرد منتظم ہوں اور طلبہ ان کے منصب سے نہ ڈریں بلکہ ان کی اخلاقی و انسانی عظمت کی وجہ سے ان سے محبت کریں۔ (22) جمہوریت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو بلا امتیاز یکساں حقوق حاصل ہوں۔ مشرقی پاکستان کے عوام اس بات سے شاکی تھے کہ مغربی پاکستان ان سے نابرابری کا سلوک کرتا ہے۔ مغربی پاکستان میں سندھی ، بلوچ اور پشتون قومیتوں کو یہی شکایت پنجاب سے تھی۔ چنانچہ قومیتوں کو برابری کا درجہ دلوانے کا سوال بھی جمہوری پروگرام کا حصہ بن گیا تھا۔ 69-1968ء کی طلبہ تحریک

ایوب دشمن جمہوری جدوجہد کا اہم ترین حصہ تھی۔ طلبہ کے کئی مطالبات کا تعلق ان کی اپنی تعلیمی زندگی کے ساتھ تھا مثلاً یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی، حکومت کے احکامات کے تحت بند تعلیمی اداروں کا کھلوانا، گرفتار شدہ طلبہ کی رہائی اور ہلاک ہونے والے طلبہ کے ورثا کو معاوضہ کی ادائیگی۔ تاہم ان مطالبات کے ساتھ جمہوریت کی بحالی اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کی مانگ بھی اس تحریک کے مقبول نعروں میں شامل تھی۔ مشرقی پاکستان میں صوبائی خود مختاری اور مغربی پاکستان میں ون یونٹ کا خاتمہ اور صوبہ جات سندھ، بلوچستان اور سرحد کی بحالی بھی طلبہ کے مطالبات میں شامل تھے۔ ایوب ان نے بہت کوشش کی کہ طلبہ کا رشتہ جمہوری تحریک سے کاٹ دیا جائے مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ یکم دسمبر 1968ء کو اس طور سے ایوب نے اپنی ماہانہ نشری تقریر میں یونیورسٹی آرڈیننس میں ترمیم کرنے اور طلبہ کی ڈگریاں ضبط کرنے کی شق منسوخ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ تھرڈ ڈویژن میں امتحان پاس کرنے والے طلبہ کے اعلیٰ جماعتوں میں داخلے پر آئندہ کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ ضمنی امتحانات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔ ملک بھر میں سیکنڈ ڈویژن کے تعین کے لئے نمبروں کا ایک ہی معیار ہو گا یعنی 50 فیصد کی بجائے 45 فیصد سیمسٹر سسٹم دوبارہ شروع کیا جائے گا اور طلبہ کو بسوں، ریلوے اور ہوائی جہاز میں سفر کی مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ صدر نے یہ بھی اعلان کیا کہ ان وعدوں پر عملدرآمد یقینی بنانے کے لئے وزیر داخلہ اور وزیر تعلیم پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ نیز وائس چانسلروں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ ان اقدامات کو عملی شکل دینے کے لئے اپنی اپنی کونسلوں سے منظوری حاصل کریں۔ آخر میں ایوب خان نے طلبہ سے اپیل کی وہ اپنی توجہ تعلیم کے حصول تک محدود رکھیں اور سیاستدانوں کے ہاتھ میں نہ کھیلیں جو انہیں ہنگاموں میں ملوث کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم طلبہ میں موجود ان جمہوری امنگوں کی بنا پر جن کی تکمیل شخصی حکمرانی کے نظام میں نہیں ہو پا رہی تھی طلبہ کی جدوجہد اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ ایوب حکومت کی بساط نہ الٹ دی گئی اور ملک میں جمہوری نظام بحال نہ ہو گیا۔

ایوب مخالف جمہوری تحریک کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان کے طلبہ کے

درمیان اتحاد اور یگانگت کی فضا قائم رہی۔ ملک کے ایک بازو میں ہونے والی جدوجہد کو دوسرے بازو کے طلبہ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اور اس پر ہونے والے ریاستی تشدد کی بھرپور انداز میں مخالفت کی جاتی تھی۔ سارے ملک میں بلا استثنائے قومیت و زبان ایک ایسی لکیر کھینچ گئی تھی جس کے ایک طرف آمریت کی حمایت کرنے والے اور دوسری جانب اسے چیلنج کرنے والے تھے۔ چنانچہ جس وقت ڈھاکہ کا انگریزی اخبار Morning News راولپنڈی کے طلبہ کی جدوجہد کو Vandalism کے عنوان سے لکھے گئے اداریہ میں مورد مذمت قرار دے رہا تھا، مشرقی پاکستان کے طلبہ کی تنظیمیں اور سیاستدان اس جدوجہد کی تعریف اور سرکاری مشینری کی مذمت میں مصروف تھے۔ تاہم اس اتحاد کے باوجود دونوں بازوؤں کی سوچ میں فرق موجود تھا۔ اس طور اس سوچ میں جو پنجاب کے بہت سے لوگوں میں پائی جای تھی اور مشرقی پاکستان کے عوام اور طلبہ کی سوچ میں۔ اس فرق کو ایوب حکومت ملک میں آمریت کو دوام دینے کے لئے ہوا بھی دے رہی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام جب بھی اپنے حقوق کی بازیابی کی بات کرتے تھے تو اسے حکومت کی جانب سے علیحدگی پسندی اور ملک دشمنی قرار دیا جاتا تھا۔ 6 نومبر کو ایوب خان کا ایک بیان شہ سرخیوں سے اخبارات نے شائع کیا جس میں عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ علاقائیت پرستی کو ہوا دینے والے عناصر کے عزائم ناکام بنا دیں۔ چند ہفتے بعد جب مشرقی پاکستان کے سابق چیف جسٹس سید محبوب مرشد لاہور تشریف لائے اور انہوں نے بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا تو انہیں صراحت سے کہنا پڑا کہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرنے والے علیحدگی پسند نہیں۔ ان کی تقریر کا ایک حصہ اس طرح سے اخبارات میں رپورٹ ہوا ''مشرقی پاکستان کے سابق چیف جسٹس سید محبوب مرشد نے آج یہاں مغربی پاکستان کے بعض حصوں میں پیدا شدہ اس تاثر کو بے بنیاد قرار دیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جو لوگ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دراصل علیحدگی پسند ہیں۔ آپ نے کہا کہ معدودے چند افراد کے سوا مشرقی پاکستان کے سارے عوام اسلام اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں اور وہ پاکستان کی سلمیت کو کسی صورت میں بھی نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں۔ (23)

ایوب خان نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے میں بہت دیر کی۔ اس نے دو ماہ

تک تحریک کو طاقت کے بل پر کچلنے کی کوشش کی۔ بلاآخر جب اس نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی(DAC) کو مذاکرات کی دعوت دی تو سیاسی پارٹیوں کے درمیان تصفیہ نہ ہو سکا۔ کچھ پارٹیاں تصفیہ کی بجائے تحریک کے زور پر عوام میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتی تھیں۔ مذہبی جماعتیں عائلی قوانین کے خاتمے پر زور دیتی تھیں۔ ملک کے مشرقی اور مغربی بازو کے درمیان تقسیم اختیارات کے سوال پر بھی اتفاق رائے پیدا نہ کیا جا سکا۔ ایوب نے پہلے تو مجیب کو رہا کرنے سے انکار کیا لیکن آخر کار جب سیاسی جمعتوں کے اصرار پر اگرتلہ کیس واپس لے کر مجیب کو رہا کر دیا گیا اور اس نے کانفرنس میں چھ نکات کی منظوری کو اپنی اولیں شرط قرار دیا تو اختلافات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی نے جنرل یحییٰ خان کو ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے کے لئے سنہری موقع فراہم کیا۔ 25مارچ 1969ء کو ایوب خان نے امن و امان بحال کرنے کی کوششوں میں ناکام ہو کر اقتدار فوج کے حوالے کر دیا۔

باب 6

یحییٰ خان اور طالب علم

ایوب خان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ تحریک کو دبانے میں فوج کی مدد حاصل کی جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے بری فوج کے سربراہ جنرل خاں یحییٰ کو چند شہروں میں مارشل لاء نافذ کرنے کی تجویز دی۔ لیکن ایوب کے گیارہ سالہ دور اقتدار میں فوج اور صدر کے درمیان اختلافات کی ایک خلیج حائل ہو چکی تھی۔ یحییٰ خان نے ایوب کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا اور واضح کیا کہ اگر مارشل لاء لگنا ہے تو یہ چند شہروں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ملک گیر ہوگا۔ جس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ مارشل لاء کے نفاذ کی صورت میں ایوب کو امور مملکت بری فوج کے سربراہ کے حوالے کر کے رخصت ہونا ہوگا۔ ایوب نے قوم سے آخری بار 25 مارچ 1969ء کو خطاب کیا۔ اسی روز یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پاکستان کی مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے اختیارات سنبھال لئے۔ 4 1 اپریل کو جاری ہونے والے عبوری دستوری حکم Provisional Constitutional Order کے تحت یحییٰ خان نے ملک کے صدر کا عہدہ بھی حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے ملک کے سیاستدانوں کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا۔

مغربی پاکستان کے سیاستدانوں میں بھٹو، میاں طفیل محمد، دولتانہ اور نوابزادہ نصر اللہ خان کی تجویز تھی کہ 1956ء کا آئین بحال کیا جائے جب کہ مشرقی پاکستان سے سوائے پی ڈی پی کے نورالامین کے کوئی بڑا سیاستدان اس نقطہ نظر سے متفق نہیں تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور بھاشانی دونوں اس آئین کی بحالی پر رضامند نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو

صوبائی خودمختاری مشرقی پاکستان کے عوام چاہتے تھے وہ اس دستور کے تحت نہیں مل سکتی تھی۔ یحییٰ خان نے اسی گفت وشنید میں پورا سال گزار دیا۔ یکم جنوری 1970ء سے ملک میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ اس عرصے میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے زیر اثر طالب علم تنظیم EPSL نے اس آزادی سے بر پور فائدہ حاصل کیا۔ اس تنظیم کے ڈھاکہ یونیورسٹی یونٹ میں ساٹھ کی دہائی کے اوائل ہی میں ایک ایسا گروپ قائم ہو گیا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہ پاکستان سے آزاد ہو کر ایک علیحدہ او خودمختار ملک نہیں بن جاتا۔ بعد میں یہ طلبہ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے اور انہوں نے EPSL میں مضبوط اثرات پیدا کر لئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے ہم نوا طلبہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایوب خان کے گیارہ سالہ دور آمریت، خاص طور پر اس کے آخر میں ہونے والے ریاستی تشدد کو انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حق میں رائے عامہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ پارٹی کے اندر بھی ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا۔ 1965ء کے انتخابات کے دوران اور 1969ء میں جمہوری تحریک میں یہ دھڑا نیپ کی طالب علم تنظیم EPSU کے ساتھ مل کر جدوجہد میں کی قیادت کرنے لگا۔ اس عرصے میں عوامی لیگ کے زیادہ تر کارکن صوبائی خودمختاری کی بات کرتے تھے۔ لیکن یہ لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ چونکہ تمام تر اختیارات مغربی پاکستان میں مرتکبز ہیں اور ان پر قابض دھڑا ریاستی طاقت کے بل پر انہیں اپنے پاس رکھنے پر مصر ہے اس لئے مشرقی پاکستان کے عوام کے لئے سوائے علیحدگی کے اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام تک اس گروپ کی شناخت عوامی لیگ ہی کے بائیں بازو کے دھڑے کے طور پر ہوتی تھی۔ نیا ملک قائم ہو جانے کے بعد 1972ء میں انہوں نے ''جاتیو سماج تنترک دل'' یعنی سوشلسٹ نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے علیحدہ پارٹی قائم کی جسے مختصرا JSD کے نام پکارا جاتا تھا۔ (1) عوامی لیگ میں موجود اس دھڑے نے جس کا EPSL پر گہرا اثر تھا۔ انتخابی مہم کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ انتخابات نے انہیں موقع فراہم کیا کہ وہ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دیہات میں عوامی لیگ کے حق میں انتخابی مہم میں حصہ لینے کے لئے بھیجیں تاکہ

اب وہ دور دراز علاقوں میں بھی علیحدگی کے حق میں پروپیگنڈہ کر سکیں۔ ان کارکنوں کو اپنا نقطہ نظر عام کرنے اور اپنی تنظیم کو پھیلانے کے لئے پورا ایک سال ملا۔عوامی لیگ کے اندر موجود نوجوانوں کے اس دھڑے نے 6 جون 1969ء تک اعلان آزادی کا مسودہ تیار کر لیا تھا اور آزاد بنگلہ دیش کے جھنڈے کا ڈیزائن بھی بنا لیا تھا۔ (2) عوامی لیگ کی طالب علم تنظیم پر اس گروپ نے اپنی گرفت اتنی مضبوط کر لی تھی کہ 12 اگست کو یعنی انتخابات سے چھ ماہ قبل EPSL کی مرکزی کمیٹی نے ایک قرار داد پاس کی جس میں Swadhin Smajtantrik Bangladesh یعنی آزاد سوشلسٹ بنگلہ دیش کی مانگ کی گئی تھی۔ EPSL سے تعلق رکھنے والے طلبہ نے انتخابی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔

ابھی انتخابات میں تین ہفتے باقی تھے کہ مشرقی پاکستان میں ایک اہم سانحہ رونما ہوا جس نے عام آدمی کی سوچ پر گہرے اثرات مرتب کئے اور سیاسی طاقت کا توازن فیصلہ کن انداز میں عوامی لیگ کے حق میں بدل دیا۔ 13 نومبر کی صبح کو مشرقی پاکستان کے ساحلی اضلاع ایک انتہائی خوفناک سمندری طوفان کی زد میں آ گئے۔ کئی لاکھ افراد لقمہ اجل بنے اور ہزاروں گھر بار سے محروم ہو گئے۔ ایک طرف پونے تین سو کلومیٹر کی رفتار سے چلنے والے جھکڑ نے ہر طرف تباہی پھیلا دی تو دوسری طرف سمندر کی طوفانی لہروں نے جو پندرہ فٹ بلند تھیں ہر اس چیز کو کھینچ کر سمندر میں دھکیل دیا جو ان کی زد میں آئی۔ کئی ساحلی جزائر ایسے تھے جہاں آدمی سے زیادہ آبادی لقمہ اجل بنی۔ تین لاکھ افراد صرف جزیرہ بھولا میں مارے گئے۔ ساحلی علاقے میں بے مثال تباہی کا شکار ہوئے۔ پتوا کھلی کی کل آبادی 237,000 تھی۔ یہاں 127,562 لوگ طوفان کی نذر ہوئے۔ مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں اور ان کے تحت سرکاری اداروں نے بے مثال بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ مشرقی پاکستان حکومت کی کارکردگی خاص طور پر ناقص ثابت ہوئی۔ صوبائی گورنر وائس ایڈمرل احسن نے ہیلی کاپٹر میں متاثرہ علاقے کا سرسری فضائی معائنہ کرنے کے بعد صرف تین لاکھ روپے کی گرانٹ دینے کا اعلان کیا۔ سرکاری میڈیا نے بھی دیر تک جانی اور مالی نقصان کی سنگینی کا نوٹس نہ لیا۔ امدادی کام کے شروع کرنے میں سرکاری اداروں نے انتہائی سست روی کا مظاہرہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے ہزاروں افراد بھی مارے گئے جن کی جانیں بروقت امداد سے بچائی جا

سکتی تھیں۔ بالآخر جب عالمی ذرائع ابلاغ نے سانحہ کی ہولناکی سے پردہ اٹھایا تو یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ انسانی تاریخ میں اس قدر تباہی پھیلانے والے سانحے بہت کم ہوئے ہیں۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اتنی جانوں کے نقصان کی ایک اہم وجہ مرکزی حکومت کا مشرقی پاکستان کے بارے میں عدم دلچسپی کا رویہ ہے۔ مشرقی پاکستان کی حکومت کی جانب سے تین لاکھ کی گرانٹ کے اعلان کے دو ہی دن بعد امریکی صدر مسٹر نکسن نے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے 10 ملین ڈالر کا اعلان کیا اور اسے بھی ناکافی تصور کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ سانحہ کے شکار ہونے والوں کی مدد کے لئے سارے امریکہ میں چندہ اکٹھا کرنے کی مہم چلائی جائے گی۔ امریکی حکومت نے طوفان زدہ علاقوں سے رابطے کے لئے تین ہیلی کاپٹر ارسال کئے۔ صدر نکسن نے پاکستان میں امریکی سفیر جوزف ایس فارلینڈ کو اپنے ذاتی نمائندے کے طور پر تمام عرصہ ڈھاکہ میں ٹھہر کر امریکی امدادی کارروائیوں کی نگرانی پر مامور کیا۔ (3) عوامی جمہوریہ چین کی ریڈ کراس نے ساڑھے 12 لاکھ ڈالر کی امداد ارسال کی جبکہ پاکستان میں چینی سفیر نے فوری طور پر 30 لاکھ روپے کا چیک پیش کیا۔ حکومت برطانیہ نے امدادی کاروائی کے لئے چار ہیلی کاپٹر، چار بحری جہاز، کئی درجن کشتیاں اور 650 فوجیوں پر مشتمل دستہ فراہم کیا۔ شہنشاہ ایران نے بھی طوفان زدگان کی امداد کے لئے خطیر رقم پیش کی، تیس ہوائی جہاز بھی متاثرہ علاقوں میں خوراک اور ادویات پہنچانے کے لئے مہیا کئے اور ملکہ فرح پہلوی کو ریلیف مشن کا نگران مقرر کیا۔ (4)

جب ساری دنیا طوفان زدگان کی امداد پر کمربستہ ہوگئی تو اسلام آباد میں موجود مرکزی حکومت نے بھی سرگرمی کا آغاز کیا۔ 20 نومبر کو سارے ملک میں قومی سوگ کا دن منانے کا فیصلہ ہوا اور ریلیف کا کام مسلح افواج کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مرکزی حکومت کی بے حسی کے خلاف مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل ہوا۔ اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مطالبہ عوامی لیگ تک محدود نہ رہا بلکہ ایسے بنگالی رہنما بھی جو عوامی لیگ کے روایتی حریف اور متحدہ پاکستان کے سرگرم حامی تصور کئے جاتے تھے، برسر عام پاکستان سے آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ مولانا بھاشانی نے جب طوفان زدہ علاقوں کا دورہ کرنا چاہا تو حکومت نے انہیں روک دیا۔ تاہم بنگالی پریس کے شور مچانے پر بالآخر انہیں

دورہ کی اجازت دے دی گئی۔ 4 دسمبر کو مولانا نے بھی ایک جلسہ عام میں بنگلہ دیش کی آزادی کا مطالبہ کر دیا۔

انتخابات کے آنے تک فضا عوامی لیگ کے حق میں تیار ہو چکی تھی۔ یحییٰ خان اور اس کے مشیر اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ انتخابات کے نتیجے میں ملک کے اندر کوئی ایک پارٹی بھی فیصلہ کن اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں انہیں جو تجزیہ فراہم کر رہی تھیں وہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں مجیب اکثریت حاصل کرے گا لیکن قیوم لیگ، نیپ، جماعت اسلامی، پی ڈی پی وغیرہ بھی کئی نشستیں حاصل کریں گی۔ جس کے نتیجے میں مجیب کے لئے من مانی کرنا ممکن نہ ہو گا۔ 7 دسمبر کو ہونے والے انتخابات نے ان اندازوں کو مکمل طور پر غلط ثابت کر دیا۔ مشرقی پاکستان کی کل 162 عام نشستوں میں سے عوامی لیگ نے 160 نشستیں جیت لیں۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے جو ملک کی سب سے کم عمر پارٹی تھی صوبے کی 136 سیٹوں میں سے 81 حاصل کیں۔ انتخابی نتائج نے جرنیلوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ یہی حال دائیں بازو کی جماعتوں کا ہوا جو انتخابات سے غیر حقیقت پسندانہ توقعات وابستہ کئے ہوئے تھیں۔ انتخابات کے بعد مجیب اور بھٹو میں کشیدگی تیز ہو گئی۔ اس کشیدگی کا باعث یہ بھی تھا کہ بھٹو وفاقی طرز حکومت کا حامی تھا۔ اس کے برعکس مجیب کا چھ نکاتی پروگرام کنفیڈریشن کی طرف لے جاتا تھا جسے بہت سے لوگ علیحدگی کی جانب پہلا قدم قرار دیتے تھے۔ پھر مجیب نے اتنی نشستیں حاصل کر لی تھیں کہ وہ بغیر کسی کی مدد لئے مرکز میں حکومت بنا سکتا تھا۔ بھٹو کو یہ بھی نظر آتا تھا کہ ان انتخابات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال میں وہ مرکزی سطح پر صرف ثانوی کردار ادا کر سکتا ہے۔ بھٹو کے جرنیلوں سے قریبی تعلقات کو مجیب اور اس کے مشیر شکوک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری کے وسط تک مجیب اور بھٹو ایک دوسرے کے خلاف خم ٹھوک کر میدان میں آ گئے۔

انتخابات کے بعد سے مجیب قومی اسمبلی کا سیشن بلانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سیشن 15 فروری 1971ء سے پہلے منعقد ہونا چاہیے۔ یحییٰ خان نے پہلے 3 مارچ کی تاریخ مقرر کی لیکن یکم مارچ کو سیشن ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ التوا کی خبر عام

ہوتے ہی پورے مشرقی پاکستان میں احتجاج شروع ہوگیا۔ یکم مارچ کو جس وقت ریڈیو پر التوا کی برنشر ہوئی پاکستان اور ایم سی سی کے درمیان ڈھاکہ سٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ خبر سنتے ہی سٹیڈیم میں موجود ہزاروں تماشائیوں نے میچ کا بائیکاٹ کر دیا اور ''جئے بنگلہ'' کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر کے تعلیمی ادارے بند ہو گئے اور طلبہ جلوس کی شکل میں ڈھاکہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یہاں EPSL اور ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل سٹوڈنٹس یونین کے رہنماؤں نے مظاہرین سے خطاب کیا۔ (5) 25 مارچ تک ڈھاکہ شہر جلوسوں اور مظاہروں کی زد میں رہا۔ احتجاجی سرگرمیوں میں طلبہ پیش پیش تھے۔ ان میں EPSL سب سے زیادہ سرگرم تھی۔ تاہم EPSU بھی ان سے پیچھے نہیں تھی۔ طالب علموں کی نظر میں انتخابات کے نتائج کسی ایک پارٹی کی فتح کا اظہار کرنے کی بجائے بنگالی قوم پرستی کی فتح کی علامت تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود بڑ کا درخت جس کے نیچے عام طور پر جلسے منعقد ہوتے تھے تمام شر کے طلبہ کا مرکز ثقل بن گیا جس کی طرف وہ چاروں اطراف سے کھنچے آتے تھے۔ اخبارات پر سنسر شپ لاگو تھی مگر طلبہ شیخ مجیب کی تقاریر کو تمام شہر میں زبانی نشر کر دیتے تھے۔ قومی اسمبلی کے سیشن کے التوا کے فوراً بعد طالب علم رہنماؤں نے مجیب پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دے۔ دباؤ ڈالنے والوں میں اے ایس ایم عبد الرب، شاہجہان سراج، عبد القدوس مکھن اور نور عالم صدیقی شامل تھے جنہیں عرف عام میں چار خلیفے بھی کہا جاتا تھا۔ اب طالب علموں کے جلسوں میں بنگلہ دیش کا جھنڈا بھی بلند کیا جانے لگا تھا۔ (6) کئی ایک نوجوان مجیب کو آزادی کے سوال پر تذبذب کا شکار قرار دے کر ہدف تنقید بھی بنانے لگے تھے۔ طالب علموں میں یہ بحث عام ہوگئی کہ نئے حالات میں مشرقی پاکستان کے عوام کو خود مختاری کے لئے جدوجہد کرنا چاہیے یا مکمل آزادی کے لئے۔

فوجی حکمرانوں نے بھی بنگالی طالب علموں کو اپنا اولین نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ 25 مارچ کو ہونے والے فوجی ایکشن کا ایک اہم ہدف ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہاسٹل تھے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز اور ڈھاکہ ریزرو پولیس کو غیر مسلح کرنے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں موجود باغیوں سے نمٹنا ملٹری ایکشن کے اولین مقاصد میں شامل تھا۔ رات

2 بجے ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس میں جسے بنگالی تحریک مزاحمت کا مرکز سمجھا جاتا تھا فوجی کاروائی کا آغاز کیا گیا۔ یہ کاروائی صبح 5 بجے تک جاری رہی۔ یہاں اندھا دھند فائرنگ کے ذریعے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کئی طالب علم اور پروفیسر مار ڈالے گئے۔ اس کے باوجود وہ سولہ طلبہ جو مظاہروں کو منظّم کرنے میں پیش پیش تھے اور جن کی فہرست فوج کو مہیا کی گئی تھی ہاتھ نہ آسکے۔ (7) جب تک فوجی ایکشن کا آغاز نہیں ہوا تھا مشرقی پاکستان کے طلبہ کی اکثریت صوبے میں جاری احتجاجی تحریک میں نمایاں کردار ادا کر رہی تھی۔ فوجی ایکشن کے شروع ہوتے ہی بہت سے نوجوان گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کرنے کے لئے سرحد پار کر گئے۔ گوریلا تربیت کا ایک مرکز سرحد کے قریب اگرتلہ کے مقام پر قائم تھا۔ انہیں نظر آتا تھا کہ اگر وہ بارڈر پار نہ کر گئے تو برہنہ شمشیر مارشل لا کے نفاذ کے نتیجے میں فوج کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔

مشرقی پاکستان میں موجود بہاریوں کی وہ تنظیمیں جو تحریک آزادی کے حامیوں کی ٹوہ میں لگی رہتی تھیں۔ اس خوف میں اضافے کا باعث بنیں۔ فوجی ایکشن کے شروع ہوتے ہی بہت سے بہاریوں نے اس صورتحال سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کوشش۔ کئی لوگوں نے اپنے اردگرد رہنے والے بنگالیوں کو علیحدگی پسند قرار دے کر مارنا اور ان کی جائیداد پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک بنگالی کارکن نے حال ہی میں اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ”غیر بنگالی اپنے پر کئے گئے ظلم کا بدلہ لینے میں مصروف تھے۔ اب وہ بنگلہ بولنے والوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ اور اس عرصے میں بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر چکے تھے۔ میر پور اور محمد پور میں بنگالیوں کے لئے داخلہ قریب ناممکن تھا۔ اس طرح جہاں بھی پاک فوج کا قبضہ ہوا اور غیر بنگالیوں کو موقعہ ملا بنگلہ بولنے والوں کا اسی طرح قتل عام کیا گیا جس طرح ان کے ساتھ ہوا تھا۔ جئے بنگلہ سے انتقام کے نام پر اسلام دشمن غیر بنگالیوں (اردو دان طبقہ) کی طرف سے غریب کمزور بنگالیوں کا یہ قتل عام بھی انسانیت کی تاریخ میں ایک خونی باب کی حیثیت رکھتا ہے۔“ (8) یہ تبصرہ بعد کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اب جماعت اسلامی نے نہ صرف بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس کی بنگلہ دیش کی قیادت پاکستان کی فوج کی کاروائیوں کے نتیجہ میں پہنچنے

والے نقصانات کا معاوضہ طلب کرنے کی بھی بات کرتی ہے۔ 1971ء میں ان کی سوچ بالکل مختلف تھی۔

فوجی ایکشن کے آغاز کے فوراً بعد اسلامی جمیعت طلبہ نے البدر اور الشمّس کے نام سے دو تنظیمیں قائم کیں جنہیں فوج کی حمایت حاصل تھی اور ان کی ٹریننگ بھی فوج ہی نے کی تھی۔ (9) ان تنظیموں کے قیام میں جمعیت میں موجود بہاریوں نے اہم کردار ادا کیا۔ البدر کا قیام 23 مئی 1971ء کو عمل میں لایا گیا۔ فوج کی مزاحمت کرنے والے بنگالیوں کے خلاف لڑنے کے علاوہ البدر کا ایک اہم کام حکام کو فوج مخالف عناصر کے بارے میں مطلع رکھنا بھی تھا۔ جماعت اسلامی، جمیعت طلبہ، الشمّس اور البدر فوجی ایکشن کے بعد مارشل لاء حکام کے دست و بازو بنے رہے۔ اس کاروائی کا خمیازہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد بہاری آبادی کو بھگتنا پڑا۔

مارشل لاء اور مغربی پاکستان کے طلبہ

ایوب دور کے آخر میں مغربی پاکستان میں طلبہ کے اندر دو قسم کی سوچ نمایاں ہوئی۔ ایک طرف سندھی بلوچ اور پشتون طلبہ میں اپنے اپنے قومی مسائل کے حوالے سے جدوجہد کا سلسلہ شروع ہوا تو دوسری طرف سارے ملک میں سوشلزم کی حامی اور مخالف طلبہ تنظیموں میں محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ قوم پرست طلبہ کا ایک مقبول عام مطالبہ ون یونٹ کا خاتمہ تھا۔ اس سے پہلے ون یونٹ کی مخالفت ترقی پسند طلبہ کی ملک گیر تنظیمیں بھی کرتی تھیں۔ لیکن یہ مخالفت ٹیم دلانہ تھی۔ سندھی، بلوچ اور پشتون طالب علموں نے ون یونٹ کے خلاف ہونے والی جدوجہد میں پہلی مرتبہ زور دار انداز میں شرکت کی۔ ون یونٹ کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انہوں نے بنگالیوں نیز اپنے ساتھ ہونے والے نا برابری کے سلوک کو بھی ہدف تنقید بنایا 1966ء کے بعد ایسی طالب علم تنظیمیں وجود میں آنے لگیں جن کا مقصد ایک طرف تو اپنی اپنی قومیت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا خاتمہ تھا اور دوسری جانب مغربی پاکستان کے صوبوں کی بحالی۔ ملک میں جو بحث سوشلزم کے حوالے سے جاری تھی وہ ان تنظیموں میں بھی موجود تھی۔ کچھ تنظیموں نے قوم پرستی کو اپنا واحد منتہائے مقصود قرار دیا اور معاشی اور سیاسی نظام کی تبدیلی کو فوری ایجنڈے سے نکال دیا۔ جب کہ کچھ دوسری تنظیموں

نے انقلابی قوم پرستی کو بنیاد بناتے ہوئے قومی حقوق کی بازیابی کے ساتھ ساتھ سماج میں انقلابی تبدیلیوں کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنایا۔ اول الذکر تنظیمیں اپنی قومیت سے تعلق رکھنے والے جاگیرداروں اور سرداروں سے اتحاد کی حمایت کرتی تھیں۔ ان کے برعکس انقلابی قوم پرست پنجاب کے مظلوم عوام کے ساتھ اتحاد کے امکان کو رد نہیں کرتے تھے۔

بلوچستان اور سندھ

کراچی بلوچ طلبہ کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس شہر میں معقول تعداد میں بلوچ آبادی بھی تھی۔ خاص طور پر بلوچستان کے صوبہ مکران سے تعلق رکھنے والے بلوچ یہاں خاصی تعدا د میں مرتکز تھے۔ مگر ان میں سرداری نظام کمزور ہونے کے باعث نیز کراچی کے صنعتی اثرات کی وجہ سے کراچی کے بلوچ بہت ساری ایسی پابندیوں سے آزاد تھے۔ جو سرداری کلچر کی خصوصیت ہوتی ہیں۔ کراچی میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوان بھی زیر تعلیم تھے۔ پھر کراچی شروع ہی سے بلوچ قومی سیاست میں اہم کردار ادا کرتا چلا آ رہا تھا۔ 1933ء میں ''انجمن اتحاد بلوچاں'' نے کراچی سے رسالہ ''البلوچ'' نکالنا شروع کیا تھا۔ 1967ء میں یہیں پر ''بلوچ ایجوکیشن آرگنائزیشن'' کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کراچی میں لیاری کا علاقہ زیادہ تر ان بلوچوں پر مشتمل تھا جو کراچی میں بطور صنعتی مزدوروں کے کام کرتے تھے۔ یہاں تعلیم یافتہ بلوچوں میں سامراج کی مخالفت، قوم پرستی اور مارکسزم کا چرچا عام تھا۔ بلوچ ادبی تحریکیں بھی یہیں سے شروع ہوئیں۔ بلوچ زبان کی ترویج کے لئے ادارے قائم ہوئے، بلوچی رسم الخط وضع کیا گیا، بلوچی زبان سیکھنے کا پہلا قاعدہ تیار کیا گیا، ڈرامے لکھے اور سٹیج کئے گئے، بلوچی شاعری کے مجموعے شائع ہوئے۔ موسیقار گروپ بنے اور سیاسی شخصیات ابھریں۔ (10)

کراچی کے چند باشعور بلوچ طالب علموں نے جو جمہوری تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔ نومبر 1967ء میں سارے مغربی پاکستان سے بلوچ طلبہ کے نمائندوں کو اکٹھا کیا۔ کٹرک ہال میں ایک کھلے سیشن کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن حکومت نے جب شہر میں دفعہ 144 کے نفاذ کو بہانہ بناتے ہوئے ہال کو تالے لگا دیئے تو کنونیشن کے منتظمین کو یہ میٹنگ شہر میں کسی اور جگہ کرنا پڑی۔ میٹنگ کے اختتام پر بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن یا

BSO کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ تنظیم کے منشور میں ون یونٹ کا خاتمہ صوبوں کے لئے حق خود ارادیت، جاگیرداری اور قبائلی نظام کا خاتمہ، بلوچ طلبہ میں قومی تشخص اجاگر کرنا اور طلبہ کے مسائل کے حل کے لئے جدوجہد کرنا شامل تھے۔ (11) بی ایس او کی پہلی بڑی فتح یہ تھی کہ اس نے نیشنل اسمبلی کی سیٹ جیت لی۔ بلوچ علاقے میں بعد الباقی بلوچ کے بعد یہ درمیانے طبقے کے کسی دوسرے شخص کی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی اس لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم تھی کہ عبد الباقی بلوچ کا انتخاب بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت ہوا تھا اس لئے اس کا حلقہ و انتخاب محدود تھا۔ پھر عبد الباقی بلوچ کو اسٹیبلشمنٹ کی بعض اہم شخصیات کی پس پردہ حمایت حاصل بھی تھی جبکہ BSO کے صدر نے صرف درمیانہ طبقے اور طلبہ کی حمایت سے انتخاب جیتا تھا۔

BSO نے جلد ہی ملک کے کئی شہروں میں اپنی شاخیں قائم کیں۔ ابتدائی شاخیں ان تعلیمی اداروں میں بنیں جہاں بلوچ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ ان میں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی، ایگریکلچرل کالج (بعد میں یونیورسٹی) مندو جام، پشاور انجینئرنگ کالج اور ایگریکلچرل کالج شامل تھے۔ اگلے چند سالوں میں بی ایس او بلوچستان کے بلوچ طلبہ کی واحد نمائندہ تنظیم بن گئی۔ بہت عرصہ پہلے کوئٹہ میں بلوچ طلبہ نے ''ورنا واندہ گل'' کے نام سے اپنے آپ کو منظم کیا تھا۔ تاہم مقبولیت کے اعتبار سے نئی تنظیم اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ BSO سب سے بڑا کارنامہ بلوچ قومی تشخص کا فروغ تھا یہ ایک ایسا فریضہ تھا جس کی تکمیل کا بیڑہ اس سے پہلے میر عبد العزیز کرد اور یوسف علی مگسی نے اٹھایا لیکن وہ یہ مقصد اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکے تھے۔ بلوچ معاشرہ قبائل میں منقسم ہونے کی بناء پر چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں بٹا ہوا تھا۔ قبائل کے اندر رسوم و رواج کا اختلاف، باہمی مناقشات کی طویل تاریخ اور قبائلی سرداروں کی مخصوص مصلحتیں یہ سارے عوامل بلوچ قومیت کی تشکیل میں رکاوٹیں بنے ہوئے تھے۔ ان تمام تضادات کی موجودگی میں بلوچ قومی وحدت کا جذبہ پیدا کرنا انتہائی دشوار کام تھا۔ بی ایس او کے نوجوانوں نے یہ مشن وہیں سے شروع کیا جہاں اس صدی کی تیسری دہائی میں ''انجمن اتحاد بلوچیاں'' نے اسے چھوڑ دیا بلوچ اپنے نام کے ساتھ شناخت کے طور پر ہمیشہ قبیلے کا نام استعمال کرتے تھے۔ قبیلہ کی جگہ

صرف بلوچ لکھنا ایک جوہری تبدیلی تھی جو تنگ نظر قبائلی سوچ سے نجات حاصل کرنے کی علامت تھی۔ ملک میں سوشلسٹ نظریات کے فروغ کی وجہ سے بلوچ طلبہ کے ایک حصے میں قومی جدوجہد اور طبقاتی جدوجہد کو ملانے کی سوچ بھی پیدا ہوئی۔ ان طلبہ کی نظر میں انقلابی قوم پرستی کا تقاضا تھا کہ قوم حقوق کے جدوجہد کو سرداری نظام کی مخالفت کی جدوجہد سے ملا کر چلایا جائے۔ چنانچہ بی ایس او کے قیام کے ساتھ ہی اس سوال پر تنظیم کے دو حصے ہو گئے۔ دوسرا حصہ پہلے (BSO (Aniti=Sardar group کے نام سے معروف ہوا۔ بعد میں یہ عوامی بی ایس او کے نام سے کام کرتا رہا۔ اس کے رہنماؤں میں امان اللہ گچکی، فدا محمد، مولانا بشیر اور شمشاد بلوچ شامل تھے۔ ایوب مخالف جمہوری تحریک کے دوران پی ایس او مغربی پاکستان کی سطح پر منظم آل پارٹیز سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی میں شامل تھی۔ اس نے اس مشترکہ پلیٹ فارم سے بھی ایوب حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک میں حصہ لیا اور کوئٹہ، خضدار اور مستونگ میں مظاہروں کی قیادت کی ۔1973-77 کے دوران بلوچستان میں شروع ہونے والی گوریلا کاروائیوں میں بی ایس او کے کارکنوں نے بھی حصہ لیا۔

سلیگ ہیریسن نے اس دور میں بی ایس او کی تنظیمی طاقت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”بلوچستان میں لبریشن فرنٹ کے بعد سب سے زیادہ منظم اور متحرک سیاسی قوتیں بی ایس او اور اس سے علیحدہ ہونے والی جنگجو تنظیم بی ایس او (عوامی) ہیں۔ بلوچستان میں طالب علم تحریک جس کی بنیاد 1967ء میں ون یونٹ کے حوالے سے رکھی گئی تھی۔ بتدریج مضبوط ہوتی گئی ہے۔1973-77ء میں ہونے والی مسلح جدوجہد نے تنظیم کا شعور بلند کرنے میں مدد دی ہے۔“(12)سیلگ ہیریسن کا کہنا ہے کہ بی ایس او نے1967-81ء کے درمیانی سالوں میں پچیس ہزار کے قریب بلوچی طلبہ کی سیاسی تربیت کی ہے۔ بی ایس او کے دعوے کے مطابق 80 کی دہائی کے وسط میں اس کے ارکان کی تعداد4,300 تھی۔ یہ ارکان تنظیم کی 46 شاخوں کے ممبر تھے۔ ان میں سے کئی شاخیں بلوچستان سے باہر تھیں۔ مثلاً صوبہ سندھ میں بی ایس او کی 13 شاخیں تھیں۔ یہ ایک ماہوار خبر نامہ ”گیرخ“ ایک ماہوار رسالہ ”سنگت“ اور ایک ادبی مجلّہ ”بام“ نکالتی تھی۔

سندھ یونیورسٹی کے قیام کے بعد حیدر آباد سندھی طلبہ کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ یہیں

1966ء میں حیدر آباد سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی (صدر یوسف لغاری جنرل سیکرٹری جام ساقی)1967ء میں فیڈریشن نے سندھ کے اندر اردو زبان کی جگہ سندھی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تحریک شروع کی یہ تحریک مارچ کے مہینے میں چلی اور اسی کی یاد میں ذوالفقار علی بھٹو نے 4مارچ کا دن سندھ کا قومی دن قرار دیا اور اس دن صوبے بھر میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ تعطیل دو سال تک ہوتی رہی۔

سندھی طلبہ میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے ہلچل کا دوبارہ آغاز 1969ء میں ہوا۔ اس ہلچل کا مرکز ثقل حیدر آباد تھا۔ ون یونٹ کے دوران سندھی اساتذہ کے ساتھ انتظامیہ کا رویہ بالعموم متعصّبانہ اور تحقیر آمیز ہوا کرتا تھا۔ اس کے خلاف طلبہ میں پہلے ہی غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں کمشنر حیدر آباد مسرور حسن نے جس کا سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر حسن علی عبد الرحمٰن کے ساتھ کچھ معاملات پر اختلاف چل رہا تھا۔ سندھی وائس چانسلر کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا۔ واقعہ کا طلبہ پر شدید ردعمل ہوا۔ 6مارچ کو حیدر آباد یونیورسٹی اور ملحقہ اداروں کے طلبہ نے کمشنر کے خلاف جلوس نکالا۔ پولیس نے جب انہیں روکنے کی کوشش کی تو اس کا مظاہرین کے ساتھ تصادم ہوگیا۔ پولیس کے لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال کے نتیجے میں کئی طالب علم زخمی ہوئے۔ پولیس نے 207طلبہ کوحراست میں لے لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں یوسف لغاری صدر سندھ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین ، مسعود نورانی کامل راجپر اور لالہ قادر شامل تھے۔ ان طلبہ نے بعد میں سندھی قومی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔

نومبر 1969ء میں حیدر آباد سے تحریک کی ایک اور لہر اٹھی جس نے نہ صرف سارے سندھ کو متاثر کیا بلکہ اس کی گونج ملکی سیاست میں بھی سنائی دی۔ طلبہ کی اس تحریک نے سندھی آبادی میں اپنے حقوق کا شعور اجاگر کیا، سیاسی کارکنوں کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کرنے پر مجبور کیا اور سندھی اخبارات کی توجہ بعض ایسے مسائل کی طرف مبذول کرائی جنہیں وہ اب تک فراموش کئے ہوئے تھے۔ اس تحریک کا مرکزی کردار ایک سندھی طالب علم رہنما لالہ قادر بنا۔

7نومبر کو لالہ قادر نے تین مطالبات کے حق میں سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے

اندر بھول ہڑتال پر بیٹھنے کا اعلان کیا۔ یہ تین مطالبات مندرجہ ذیل تھے:

1- انتخابی فہرستیں اور ووٹر فارم سندھی میں چھاپے جائیں۔
2- ڈاکٹر افغان پرنسپل انجینئرنگ کالج کے خلاف کیس واپس لیا جائے۔
3- آپا شمس عباسی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج حیدر آباد کو کالج میں واپس لایا جائے۔

ان میں پہلے مطالبہ کا پس منظر کچھ اس طرح کا تھا۔ صوبے میں سندھی زبان شروع سے ذریعہ تعلیم تھی۔ دفاتر اور کچہریوں میں بھی سندھی زبان ہی مستعمل تھی۔ سندھی میں کئی ایک اخبارات چھپتے تھے اور کتابیں بھی لکھی جاتی تھی۔ اس لئے آبادی کا بیشتر حصہ اردو رسم الخط سے ناآشنا تھا۔ ان کے لئے اردو کی نستعلیق سکرپٹ میں انتخابی فہرستیں یا اردو زبان میں انتخابی قواعد وضوابط یقیناً مسئلہ پیدا کرتے تھے۔ ان فہرستوں کے سندھی میں چھاپنے سے انکار کو سندھی زبان کی مخالفت اور اردو کی حمایت میں جاری اس مہم کا حصہ بھی تصور کیا جاتا تھا جو گزشتہ دو دہائیوں سے جاری تھی۔ سندھ کی سیاسی جماعتوں کی سست رو قیادت اس مسئلے کو زور وشور سے نہ اٹھا سکی تو طلبہ نے اس پر تحریک شروع کر دی۔

دوسرے مطالبہ کا پس منظر یہ تھا کہ ڈاکٹر حسن علی عبد الرحمان کے بعد ایک دوسرے سندھی ماہر تعلیم ڈاکٹر افغان پرنسپل مہران انجینئرنگ کالج کو افسر شاہی نے نشانہ بنا لیا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ کسی بھی سندھی سکالر کو حیدر آباد کے کسی بھی اعلیٰ تعلیمی ادارہ میں ٹکنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ جیسا کہ اگلے سال سید غلام مصطفیٰ شاہ کے خلاف شروع ہونے والی گڑ بڑ نے ثابت کیا ان کارروائیوں کے پیچھے پنجابی مہاجر پٹھان اتحاد کے رہنماؤں کا بھی ہاتھ تھا۔

آپا شمس عباسی بھی ایک سندھی ماہر تعلیم تھیں اور ان کا تبادلہ کرانے میں بھی انہی متعصب لیڈروں کا ہاتھ تھا جو حیدر آباد کے کسی تعلیمی ادارے میں بھی سندھی اساتذہ کو بطور منتظم اعلیٰ کے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ 8 نومبر کو حیدر آباد میں طلبہ نے ان مطالبات کے حق میں جلوس نکالا، امتحانات کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ جلوس کے نعرے تھے۔ ''جئے سندھ''، سندھ کی جان، ڈاکٹر افغان، سندھ سے زیادتیاں ختم کرو، ڈاکٹر افغان کے خلاف کیس واپس لو، آپا شمس عباسی کو واپس لاؤ، ون یونٹ توڑ دو، مارشل لا ختم کرو۔ جلوس کا خاتمہ تلک چاڑی

میں ہوا جہاں ایک جلسہ عام میں طلبہ قائدین اقبال ترین اور مسعود نورانی نے مطالبات کے حق میں تقاریر کیں۔

طلبہ کی اس جدوجہد کی رہنمائی کے لئے حیدرآباد کی سطح پر ایک دس رکنی رہبر کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے ارکان یہ تھے۔ لالہ قادر، اقبال ترین، غلام نبی پلیجو، روشن پٹھور، خلیل بچانی، مسعود پیرزادہ، سلیم سنجرانی، آغا زاہد، رفیق صفی اور مختیار میمن۔

ایکشن کمیٹی نے وائس چانسلر اور کمشنر سے ملاقات کر کے انہیں اپنے مطالبات سے آگاہ کیا۔ وہ غور کرنے کا وعدہ کرتے رہے، مگر کیا کچھ نہیں۔ دن گزرتے رہے اور بھوک ہڑتالیوں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ اب کئی اور لوگ بھی مطالبات کی حمایت میں لالہ قادر کے ساتھ بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے تھے۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ 11 نومبر تک لالہ قادر کا وزن 12 پاؤنڈ کم ہو چکا تھا۔ 14 نومبر کو پاکستان عوامی لیگ کے نائب صدر اور سندھ کے معروف رہنما قاضی فیض محمد بھی بھول ہڑتالیوں میں شامل ہو گئے۔

طلبہ کی اس جدوجہد کے اثرات سندھ میں دور دور تک پہنچے۔ کراچی، ٹنڈو الہ یار، خیر پور، بدین نواب شاہ، میں بھی علامتی بھول ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ بلوچ سٹوڈنٹس فیڈریشن، فلسطینی طلبہ اور حیدرآباد میں زیر تعلیم بنگالی طلبہ کے وفود بھوک ہڑتالی کیمپ میں کارکنوں کی خیریت معلوم کرنے آئے۔ سندھی اخبارات نے روز بروز کارکنوں کی صحت کے بارے میں خبریں چھاپنا شروع کیں۔ اس دوران ذوالفقار علی بھٹو نے بھی سندھی میں فہرستیں چھپانے کے مطالبہ کو قومی اہمیت کا مسئلہ قرار دیتے ہوئے اس کی پرجوش حمایت کا اعلان کیا۔ بھٹو نے کہا کہ ''کئی علاقوں میں قومی زبانیں نہیں سمجھی جاتیں۔ اگر یوگوسلاویہ میں اس طرح کے فارم پانچ زبانوں میں چھپے ہیں تو پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا۔''

سندھی سیاست کی مخصوص مصلحتوں کی وجہ سے آپا شمس عباسی کی واپسی کا مسئلہ بالآخر مطالبات کی مشترکہ فہرست سے نکالنا پڑا۔ انتظامیہ نے یقین دہانی کرائی کہ ڈاکٹر افغان کے خلاف ملٹری کورٹ یا عام عدالت میں کیس نہیں بھیجا جائے گا بلکہ محکمانہ تحقیقات ہو گی۔ اس پر طلبہ نے امتحانات کا بائیکاٹ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سندھی میں فہرستیں چھاپنے

کا مطالبہ ابھی نہیں مانا جا رہا تھا اس لئے بھوک ہڑتال جاری رہی۔

17 نومبر کو انتظامیہ نے بھوک ہڑتالیوں سے سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ حیدر آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے شام کو معززین شہر سے خطاب کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ آج کے بعد کسی شخص کو بھی مارشل لا کے ضوابط کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دی جائے گی۔ رات کے اندھیرے میں پولیس پارٹی نے بھوک ہڑتالی کیمپوں پر ہلہ بول دیا اور بھوک ہڑتال کرنے والے کارکنوں کو گاڑی میں ڈال کر جیل پہنچا دیا۔ یہی عمل سندھ کے دوسرے شہروں میں دہرایا گیا۔ اس رات کل 32 طالب علم گرفتار ہوئے۔ اس دوران الیکشن کمیشن نے سندھی طلبہ کا مطالبہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کمیشن کی جانب سے کئے جانے والے اعلان میں کہا گیا کہ ''کمیشن نے فیصلہ کیا ہے کہ ووٹروں کی فہرستیں مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان میں اور مغربی پاکستان میں اردو میں چھاپی جائیں گی۔ اس انتظام میں موجودہ مرحلہ پر کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس سے مزید مسائل پیدا ہونے کے علاوہ عام انتخابات میں تاخیر ہونے کا امکان ہے۔''

اس طرح سے سندھی طلبہ کی یہ پر جوش تحریک اختتام کو پہنچی۔ اس کے نتیجے میں کوئی فوری کامیابی تو حاصل نہ ہوئی تاہم اس نے سندھی عوام میں اپنے حقوق کا شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ایوب خان کے جانے کے بعد اسٹیبلشمنٹ نے ملک میں ابھرنے والی عوامی قوتوں سے نبٹنے کے لئے ایک نئی منصوبہ بندی کی۔ اس منصوبہ بندی کے تحت سندھ میں ان قوتوں کے خلاف نسل پرست عناصر کو، جبکہ پنجاب میں تنگ نظر مذہبی عناصر کو، صف آرا کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ جنوری 1970ء میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ملتے ہی سندھ میں مہاجر تشخص کو اجاگر کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں اس کے ساتھ ہی ساتھ مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ نے سندھیوں کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کر دیا۔ 10 جنوری کو سکھر میں مہاجر کنونشن منعقد ہوا جس میں احمد ای ایچ جعفر نے تقریر کرتے ہوئے مہاجروں کے مطالبات پیش کئے۔ 19 جنوری کو مہاجر پنجابی پٹھان محاذ کے رہنما نواب مظفر حسین نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر غلام مصطفیٰ شاہ کے خلاف ایک بیان جاری کیا جس کا مقصد صوبے

میں رہنے والے غیر سندھیوں کو ان کے خلاف بھڑکانا تھا۔ کہا گیا کہ وائس چانسلر تمام غیر سندھیوں کے خلاف تعصب میں مبتلا ہیں۔ اس بیان کا وہی نتیجہ نکلا جو نسل پرست عناصر چاہتے تھے۔

مہاجر طلبہ میں سندھی وائس چانسلر کے خلاف مہم شروع ہوگئی اور ایک طالب علم نے یونیورسٹی کیمپس پر بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اس دوران سندھی آبادی کے خلاف نفرت کی مہم شروع کر دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سندھی طلبہ نے وائس چانسلر کی برطرفی کرنے والوں کی مذمت میں جلوس نکالا۔ اس جلوس کے نکالنے میں کئی سندھی تنظیمیں شامل تھیں۔ مثلاً جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ سٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن وغیرہ۔ جلوس کے ایک لیڈر لالہ قادر کے کہنے کے مطابق مظاہرین پرسٹی کالج کے اوپر سے فائرنگ کی گئی اور پھر جب وہ کلاتھ مارکیٹ کے سامنے سے گزرے تو یہاں بھی یہی کاروائی دہرائی گئی۔ اس کے نتیجے میں دوطرفہ لڑائی شروع ہوگئی۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق دوسینما ہال، تین ہوٹل چھ گاڑیاں اورAPP کا دفتر آتش زنی کا نشانہ بنے۔ یہ بات کی بھوک ہڑتال کرنے والے مہاجر طالب علم کی زندگی محفوظ رہی اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ سندھی طلبہ پرامن جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ حیدرآباد میں ہنگامے اگلے دن بھی جاری رہے۔ اس روز ایک اور ہوٹل کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی گئی اور سندھی اخبار ''ہلال پاکستان'' کے دفتر پر کا حملہ ہوا۔ شہر میں پہلے دن ہی فوج طلب کر لی گئی تھی اور کئی لوگ جو مظاہرے میں نمایاں تھے گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ان میں سے دس کو ایک فوجی عدالت نے 4فروری کو ایک ایک سال قید سخت کی سزا سنائی۔ ان طلبہ کے نام یہ تھے۔ ممتاز جنیدی، ایوب خلجی، سرور بھوبانی، محمد الیاس، رضا، یوسف تالپور، حسین شاہ بخاری، اقبال شرین، روشن پنور، لالہ قادر۔(13)

31مارچ1970ء کو یحییٰ خان نے ون یونٹ توڑنے کا اعلان جاری کیا۔ اس اعلان کے نتیجے میں سندھ سرحد اور بلوچستان کے صوبے از سرنو بحال ہو گئے۔ چونکہ سندھ کے عوام کا ایک دیرینہ مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا اس لئے سندھ میں وقتی طور پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تاہم ون یونٹ کے خاتمے کے بعد جلد ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ سندھ کے ساتھ

ہونے والی ناانصافیوں کا خاتمہ کرانے کے لئے ابھی بہت طویل جدوجہد کرنا پڑے گی۔ طلبہ کو فوری طور ر درپیش مسائل میں ایک مسئلہ ٹرانسپورٹ کا تھا۔ اسی طرح ان کا مطالبہ تھا کہ صوبے میں تعلیمی اداروں کی سطح بلند کرنے کی ضرورت کو پورا کیا جائے، کیڈٹ کالج پٹارو کے دروازے سندھی طلبہ کے لئے کھولے جائیں اور طلبہ کے ٹرانسپورٹ کے مسائل حل کئے جائیں۔ اس سٹرائیک کے نتیجے میں دسیوں طلبہ گرفتار ہوئے۔ ان میں سے 26 طلبہ کی رہائی 10 اپریل کو ہوئی جب انتظامیہ نے ان مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے نتیجے میں طلبہ نے سٹرائیک ختم کرنے کا اعلان کیا۔

پنجاب

پنجاب میں بائیں بازو کی تنظیمیں ویسے تو اس صدی کی تیسری دہائی سے کام کر رہی تھیں۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ کمزور ہوگئی تھیں۔ 1965ء کی جنگ کے بعد صوبے میں بائیں بازو کے نظریات وسیع پیمانے پر پھیلنے شروع ہوئے۔ امریکہ مخالف جذبات میں بھی شدت آ گئی۔ عوام میں یہ تصور عام تھا کہ منجملہ دیگر باتوں کے امریکہ نے پاکستان کو ضرورت کے وقت مدد دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چونکہ چین نے اس موقعہ پر پاکستان کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا تھا اس لئے صوبے میں ہر جگہ، حتیٰ کہ دور افتادہ دیہات تک، عوامی جمہوریہ چین کے لئے دوستانہ جذبات پیدا ہوئے تھے۔ جنگ کے چھ ماہ بعد پنجاب میں چینی رہنماؤں کا جو والہانہ استقبال ہوا وہ انہیں جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ 26 مارچ 1966ء کو جب چین کے صدر لیوشاؤ چی اور وزیر خارجہ چین یی پاکستان کے دورہ پر آئے تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر کشمیر کے بارے میں پاکستان کی پالیسی کی حمایت کا اعلان کیا۔ چینی صدر اس کے بعد جب لاہور پہنچے تو لاکھوں عوام کا جم غفیر ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ ایئرپورٹ سے گورنر ہاؤس تک تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پنجاب میں آج تک کسی غیر ملکی رہنما کا اتنے پر جوش انداز میں استقبال نہ ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ چین سے درآمد ہونے والا سوشلسٹ لٹریچر بھی صوبے میں عام ملنے لگا جب کہ روس سے آنے والے لٹریچر پر پہلے کی طرح پابندیاں عائد رہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کو بھی بوجوہ چین کا دوست اور امریکہ کا مخالف تصور کیا جاتا تھا اس لئے یہ عوامل بھی اس کی مقبولیت کے کسی حد تک ذمہ دار تھے۔ پیپلز پارٹی کے

روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے نیز سوشلزم نافذ کرنے اور زرعی اصلاحات روبعمل لانے کے دعوؤں نے بھی پنجاب میں اسے پھیلنے میں مدد دی۔ جوں جوں بھٹو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ''جیہڑا واہوے اوہو کھاوے، سوشلزم آوے ای آوے'' قسم کے نعرے میں پھیلتے گئے۔ اس صورت حال نے ایک طرف امریکی ایجنسیوں کو پریشان کیا اور دوسری جانب دائیں بازو کی جماعتوں خاص طور پر جماعت اسلامی کے کان کھڑے ہو گئے۔

اسی دور میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح پنجاب میں بھی صنعتی مزدوروں میں بڑے پیمانے پر جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ایوب دور میں سرمایہ دار طبقہ نے صنعتی مزدوروں کو طاقت کے بل پر دبا کے رکھا ہوا تھا۔ ایوب کے کمزور پڑتے ہی جابجا ٹریڈ یونینیں قائم ہونے لگیں اور مزدور اپنے مطالبات کے لئے ہڑتال پر جانے لگے۔ کئی جگہ کارخانوں کا گھیراؤ بھی ہوا۔ اس سے سرمایہ دار طبقے اور سرکاری حلقوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سرمایہ دار طبقے نے علما کی امداد حاصل کرنے کی غرض سے مذہبی جماعتوں کو مالی امداد فراہم کرنا شروع کیا۔ مذہبی جماعتوں کی نت نئی طلبہ تنظیمیں بھی پیدا ہونے لگیں۔ خود ایسٹیبلیشمنٹ بھی یہی چاہتی تھی کہ بائیں بازو کے نظریات کے فروغ کو روکنے کے لئے تنگ نظر مذہبی جماعتوں کا سہارا لیا جائے۔

جنوری 1970ء میں جب یحییٰ خان نے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی اور انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں تو پنجاب کے اندر دائیں اور بائیں بازو کا تضاد اور بھی تیز ہو گیا۔ جماعت اسلامی، پی ڈی پی اور مسلم لیگ نے پیپلز پارٹی کو اپنے خیال میں بدنام کرنے کے لئے سوشلزم کے حوالے سے ہدف تنقید بنایا۔ 113 علماء سے سوشلزم کے خلاف فتویٰ حاصل کیا گیا اور اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ مولانا مودودی نے یہ بھی اعلان کیا کہ پاکستان میں جو کوئی بھی سوشلزم کی بات کرے اس کی زبان گدی سے کھینچ لینی چاہیے۔ مارچ 1970ء میں پنجاب میں NAP کے مرکزی صدر مولانا بھاشانی کی آمد ہوئی۔ ان کی تقاریر نے جلتی پر کام کیا اور دائیں بازو کی جماعتوں کو یہ وہم ہو گیا کہ پاکستان میں موجود کمیونسٹ گوریلا جنگ کے ذریعے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ 23-24 مارچ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقام پر ہونے والی کسان کانفرنس نے دائیں بازو کی جماعتوں میں مزید

کھلبلی مچا دی۔ اس کانفرنس میں دو لاکھ کے قریب لوگ شامل ہوئے تھے۔ جن میں کسانوں، صنعتی مزدوروں اور دانشوروں کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ بھی شامل تھے۔ تاحد نظر سرخ پرچم لہرا رہے تھے اور ہزاروں لوگوں نے سرخ ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ یہاں فیض احمد فیض نے اپنی نظم ''پھر برق فروزاں ہے سر وادیٔ سینا'' سنا کر لگوں کو گرمایا۔ عوامی نیشنل پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسیح الرحمٰن پر جلسہ کے ماحول نے اتنا اثر کیا کہ انہوں نے برسر عام اعلان کیا ''یحییٰ خان غدار ہے، غدار ہے، غدار ہے'' رہی سہی کسر مولانا بھاشانی نے پوری کر دی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ملک میں اسلامی سوشلزم کے بارے میں ریفرنڈم کرایا جائے اور یہ کہ اگر عوام اسی طرح سے تنگ رہے تو وہ گوریلا جنگ کے ذریعے اس نظام کا تختہ الٹ دیں گے۔ (14) پنجاب میں 1970ء کا پورا سال نام نہاد نظریہ پاکستان کے علمبرداروں اور سوشلسٹ نظام کے حامیوں کے درمیان حالت جنگ میں گزرا۔ اس دور کے اخبارات کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ واضح کر دے گا کہ دائیں بازو کی جماعتیں سخت سراسیمگی کے عالم میں مبتلا تھیں اور وہ سمجھتی تھیں کہ یہ جنگ ان کی زندگی اور موت کی جنگ ہے۔

پس پردہ ایسی قوتیں بھی موجود تھیں جو ان جماعتوں کے خوف میں اضافہ کر کے اس جنگ میں شدت پیدا کرنے کی خواہاں تھیں۔ ان دنوں اخبارات میں اس قسم کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ چھپ رہے تھے۔ ''حکومت کو سوشلزم کے پرچار پر پابندی عائد کر دینی چاہیے۔'' سوشلزم ایوب آمریت سے بھی خطرناک ہوگا۔'' پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں سوشلزم کے نعرے پر پابندی لگانا ضروری ہے۔'' ''نظریاتی سرحدوں کا تحفظ ہر پاکستانی کا فرض ہے۔''، ''سوشلزم کی حامی جماعتوں کے خلاف مارشل لاء کے تحت کاروائی کی جائے'' اور'' اسلام پسند طاقتیں متحد ہو کر سوشلزم کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔'' سوشلزم کے خلاف جنگ میں جماعت اسلامی اور اس کے محاذ پیش پیش تھے۔ جمعیت اہل حدیث، جمعیت علمائے اسلام کا ایک دھڑا، پی ڈی پی، مجلس احرار اسلام اور کونسل مسلم لیگ بھی اس کام میں جماعت اسلامی کے ساتھ تھے۔ جماعت اسلامی نے ڈیموکریٹک یوتھ فورس کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بھی قائم کی تھی جسے عرف عام میں ڈنڈا فورس کہا جاتا تھا اور جس کا مقصد سوشلزم کی حمایت کرنے والوں کو طاقت کے زور پر خاموش کرانا

تھا۔ یہ بات کہ مارشل لاء حکومت کے وزیر اطلاعات ریٹائرڈ جنرل شیر علی خان بذات خود سوشلزم کی مخالفت اور نظریہ پاکستان کی حمایت میں ایک مہم جاری کئے ہوئے تھے ثابت کرتا ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں کے پیچھے اسٹیبلشمنٹ کا ہاتھ تھا۔ اسی دوران وزارت اطلاعات کی جانب سے یہ کوشش بھی کی گئی کہ قائداعظم کی ایک تقریر میں سے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح نکال دی جائے۔

اس دوران پنجاب یونیورسٹی ایک میدان کار زار کی شکل اختیار کر گئی جس میں ایک جانب روشن فکر کی حامی قوتیں اور دوسری طرف مذہبی تنگ نظری کے حامی صف آراء تھے۔ یہاں جماعت اسلامی نے طلبہ یونین کے انتخابات جیتنے پر اپنی تمام تنظیمیں قوت مرکوز کر دی تھی۔ جماعت کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں اسے اس لئے مذمت اٹھانا پڑی کہ تعلیمی ادارے اس کے اثر میں نہیں تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات نے اسلام اور کفر کی جنگ کی شکل اختیار لی تھی۔ جماعت اسلامی کی افرادی قوت اور وافر وسائل کا مقابلہ حال ہی میں وجود میں آنے والی طالب علم تنظیم نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (NSO) نے کیا۔ 26 جنوری 1970ء کو انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اختیارات میں ''اسلام دوست'' تنظیموں کے متحدہ محاذ کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ 5 جنوری کو انجمن طلبہ اسلام (ATI) کی طرف سے جاری ہونے والا یہ بیان اس ہیجان انگیزی کا اظہار کرتا ہے جو مذہبی جماعتیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''اس پر آشوب دور میں جب غیر اسلامی اور ملحد عناصر سر اٹھا رہے ہیں اور اپنی سرگرمیوں سے ملکی سالمیت، اتحاد اور نظریہ پاکستان کے لئے مستقل خطرہ بن رہے ہیں یہ امر ضروری ہے کہ تمام اداروں میں ایسے امیدواروں کو منتخب کیا جائے جو صرف اور صرف پاکستانی نقطہ نگاہ سے سوچیں۔ ''(15) اسلامی جمعیت طلبہ کے خلاف این ایس او کی قیادت میں بننے والے فرنٹ میں لبرل عناصر، مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ نیز فلسطینی طالب علم اور بنگالی طلبہ شامل تھے۔ اس دوران جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ نے یونیورسٹی میں نظریاتی اختلاف کو بنیاد بناتے ہوئے منافرت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اس نے وائس چانسلر کی مدد سے ایک ایسے شعبے کے دوسو سے زائد طلبہ کے ووٹ بھی بنوا لئے جس کا اس وقت

تک یونیورسٹی کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر این ایس او کی جانب سے کھڑے ہونے والے صدارتی امیدوار کے بہت سے ووٹ فنی اعتبار سے ناجائز قرار دے دیئے گئے۔ ان تمام کاروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعیت کا امیدوار 94 ووٹوں سے کامیاب ہو گیا۔ یہ انتخابات بڑی حد تک پر امن تھے اور ان کے دوران اسلحہ کا استعمال نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں آہستہ آہستہ تشدد کا عنصر شامل ہونے لگا۔ یہ فطری نتیجہ تھا انتخابات کو اسلام اور کفر کی جنگ بنانے کا...... دو سال بعد ہونے والے الیکشن میں جماعتی کارکنوں کی فائرنگ کے نتیجے میں NSO کا ایک کارکن برکات احمد ہلاک ہو گیا لاہور کے تعلیمی اداروں میں کسی طالب علم تنظیم کے ہاتھوں قتل کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

این ایس او کے تنظیمی یونٹ جلد ہی پنجاب کے قریباً تمام بڑے شہروں میں پھیل گئے۔ لاہور کے اکثر تعلیمی اداروں میں اس نے طلبہ یونین کے انتخابات جیتے اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں طلبہ کو انجینئرنگ سٹوڈنٹس فرنٹ کے نام سے منظّم کیا۔ نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے طلبہ اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی تعلیم کے لئے کئی ایک کتابچے شائع کئے۔ اسی طرح سے اس نے صنعتی مزدوروں کے اندر جمہوری آزادیوں، سماجی انصاف اور محنت کشوں کے حقوق کے بارے میں شعور پیدا کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر سٹڈی سرکل شروع کئے۔ بعد میں NSO کے کئی ارکان نے ٹریڈ یونین تحریک، بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور NGOs فعال کردار ادا کیا یا بطور ادیب یا صحافی شناخت پیدا کی۔

سرائیکی تحریک اور طلبہ

یحییٰ خان کے مارشل لا کے دوران جنوبی پنجاب میں ایک وسیع تر سرائیکی تشخص اجاگر نہیں ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سرائیکی تحریک کے ابتدائی قائدین قدامت پسند سیاست دان تھے۔ اور وہ لسانی بنیادوں پر قومیت کے تصور سے بھی اتفاق نہیں کرتے تھے۔

ابھی ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان نہیں ہوا تھا کہ پنجاب میں بہاولپور کو علیحدہ صوبہ بنانے کے سوال پر بحث کا آغاز ہو گیا۔ اس بحث نے تنازعے کی شکل اس وقت اختیار کر لی جب مسٹر بھٹو نے بہاولپور کو پنجاب کا حصہ قرار دیا۔ 4 جنوری 1970ء کو مولانا سراج احمد دین پوری نے اس بیان کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ بہاولپور چونکہ کبھی پنجاب کا حصہ

نہیں رہا اس لئے اس کی قسمت کا فیصلہ عوام کی مرضی سے ہونا چاہیے۔ اس کے اگلے دو ہفتوں میں خون پور اور رحیم یار خان میں بہاولپور صوبے کی حمایت میں جلوس نکلے جن میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی (16) ان جلوسوں میں بہاولپور سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی حصہ لیا۔ 7فروری کو بہاولپور متحدہ محاذ کے قیام کے بعد تحریک میں شدت آ گئی۔ 27فروری کو بہاولپور کو صوبائی درجہ دلوانے کے لئے احمد پور شرقیہ میں ''طلبہ مجلس عمل'' کا قیام عمل میں آیا جس میں دائیں بازو کی طلبہ تنظیمیں شامل تھیں۔ اپریل کے مہینے میں ایجی ٹیشن تیز ہوئی تو مارشل لا کے ضابطے اسے کچلنے کے لئے استعمال کئے گئے۔ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ 6اپریل کو جن سات افراد کو سمری ملٹری کورٹ بہاول پور نے قید اور کوڑوں کی سزا دی ان میں تین لڑکے بھی شامل تھے۔ (17)

سرائیکی علاقہ میں پنجاب سے علیحدہ تشخص کا احساس پہلے بہاولپور صوبہ تحریک کی شکل میں ہوا۔ تاہم یہ تشخص ابھی قومیتی نہیں بلکہ علاقائی حیثیت رکھتا تھا۔ بہاولپور صوبہ تحریک والے اپنے آپ کو پنجاب سے تو الگ قرار دیتے تھے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو باقی سرائیکی علاقہ کا حصہ قرار دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ اس مرحلے پر باقی سرائیکی علاقہ سے اگر کوئی تعلق محسوس کیا جاتا تھا تو وہ یہ تھا کہ اس کے بعض حصے تاریخ کے کسی مرحلہ پر ریاست بہاولپور کا حصہ رہے تھا۔ مثلاً صوبہ تحریک کے ایک اہم رہنما علامہ ارشد کا کہنا تھا کہ ''پنجاب میں سکھوں کے دارالحکومت سے قبل بہاولپور کی حدود پاکپتن، شجاع آباد اور ڈیرہ غازی خان تک پھیلی ہوئی تھی۔ (18) یہ ایک طرح سے سرائیکی تشخص کی مبہم سی شروعات تھیں۔

تاہم جلد ہی سرائیکی علاقہ میں ایک وسیع تر قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اس احساس کو عام کرنے میں ملتان کے دانشوروں اور سیاستدانوں نے رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ اسی سال 30جولائی کو سابق ایم پی اے غلام قاسم خان خاکوانی کی صدارت میں ملتان کی ادبی و ثقافتی تنظیموں کے مشترکہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ 14اگست کو سرائیکی زبان کے حق میں جلوس نکالا جائے گا اور ریڈیو پاکستان کے سامنے مظاہرہ کیا جائے گا۔ میٹنگ میں ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ ریڈیو پاکستان ملتان سرائیکی زبان و ثقافت کی ترویج کے لئے اپنی

نشریات کا نصف وقت وقف کرے اور سرائیکی علاقہ میں سرائیکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔(19)

سرائیکی دانشوروں نے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ سرائیکی زبان پنجابی ہی کی ایک بولی ہے۔ انہوں نے اس کے بر خلاف یہ تصور پیش کیا کہ سرائیکی ایک علیحدہ زبان ہے اور سرائیکی قومیت پنجاب قومیت سے مختلف ایک منفرد اکائی ہے۔ نیز یہ کہ پنجاب کے تقسیم کر کے ایک علیحدہ سرائیکی صوبہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

ضیا دور میں سرائیکی سوال شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سرائیکی سیاستدان مثلاً میاں ممتاز محمد خان دولتانہ مشتاق احمد گورمانی، امیر محمد خان آف کالا باغ اور غلام مصطفیٰ کھر ملکی سیاست میں نمایاں پوزیشن رکھتے تھے۔ سرائیکی علاقہ پاکستان بننے کے بعد سے مسلسل عدم توجہی کا شکار رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب یہاں درمیانہ طبقہ پھیلنا ہونا شروع ہوا تو دانشوروں اور سیاستدانوں کے ایک حصہ نے سرائیکی شناخت کو فوغ دینے کی کوشش کی۔ ضیا کے طویل مارشل لاء دور میں پنجاب کی بالا دستی کے خلاف باقی تمام صوبوں میں صدائے احتجاج زور کے ساتھ بلند کی گئی۔ اس دور میں ملتان میں قائم ہونے والی سرائیکی لوک سانجھ نے سرائیکی شناخت کے فروغ میں خاص طور پر اہم کردار ادا کیا۔ سرائیکی لوک سانجھ بنیادی طور پر سرائیکی دانشوروں اور ادیبوں کی تنظیم تھی لیکن اس میں بہت سے طالب علم بھی شامل تھے۔ اسی دور میں قائم ہونے والی سرائیکی شاگرد سانجھ اور سرائیکی شاگرد ستھ خالص طالب علم تنظیمیں تھیں۔

باب 7

بھٹو دور

ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستانی عوام سے تعارف ایوب حکومت کے وزیر خارجہ کے طور پر ہوا تھا۔ بھٹو کے کشمیر کے بارے میں مؤقف نیز پاک بھارت جنگ کے دوران اس کے بیانات نے خاص طور پر پنجاب میں اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا تھا۔ ملک بھر میں یہ تصور بھی موجود تھا کہ بطور وزیر خارجہ وہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ مضبوط روابط کا حامی اور تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم کرنے کا موید ہے۔ بھٹو کے پاس جب وزارت معدنیات تھی تو اس نے سوویت یونین کے ساتھ بھی راہ ورسم بڑھانے کی کوشش تھی جسے امریکی حلقوں نے ناپسند کیا تھا۔ اس سے اس کے امریکہ مخالف ہونے کا تاثر بھی پھیلا۔ پاکستان میں امریکی پالیسیاں چونکہ پہلے ہی غیر مقبول تھیں اس لئے ان تمام باتوں نے بھٹو کے لئے عوام کے ایک حصے میں جن میں طالب علم پیش پیش تھے نرم گوشہ پیدا کیا۔ تاشقند میں کئے جانے والے معاہدے کو بھٹو نے مہارت کے ساتھ ایوب خان کے خلاف اور اپنی حمایت میں اضافہ کے لئے استعمال کیا۔ ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت سے نکالا گیا تو وہ عوام میں بطور ایک ایسے رہنما کے متعارف ہو چکا تھا جو ملک کو سامراجی تسلط سے آزاد کرنے کا خواہاں ہے، ملکی آزادی اور خود مختاری کا علمبردار ہے اور جسے ایک غیر مقبول آمر نے انہیں تصورات کی بناء پر وزارت سے برطرف کر دیا ہے۔ جب بھٹو وزارت سے علیحدگی کے بعد جرمنی چلا گیا اور اس کی روانگی کو بعض حلقوں نے غلط فہمی کی بنا پر سیاسی جلاوطنی سے تعبیر کیا تو مشہور عوامی شاعر حبیب جالب نے اپنی ایک نظم ''اپنا وطن چھوڑ کے نہ جا'' میں بھٹو سے واپس آنے اور عوام کی قیادت کرنے کی

اپیل کی۔عوام کے ایک حصے میں بھٹو کی مقبولیت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے منشور کا اعلان کیا۔ اس منشور میں زرعی اور صنعتی اصلاحات کے ساتھ ساتھ آزاد اور خودمختار خارجہ پالیسی کا پروگرام بھی دیا گیا تھا۔ 1970ء کی انتخابی مہم کے دوران روٹی، کپڑا مکان اور سوشلزم کے نعرے بھٹو کی عوام کے اندر مزید مقبولیت کا سبب بنے۔ ان نعروں نے بالخصوص طلبہ پر برا اثر کیا اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے بہت سے سابق طالب علم رہنما پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بھٹو نے خاص طور پر پنجاب سندھ اور سرحد کے طالب علموں کو متاثر کیا۔ تاہم بلوچستان کے طلبہ نے اس سے چنداں اثر قبول نہ کیا۔

اقتدار میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک بھٹو کی مقبولیت طالب علموں میں قائم رہی۔ اس کی وجہ وہ اصلاحات تھیں جن کا اعلان اس نے حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد کیا تھا۔ ان میں زرعی اور صنعتی شعبے میں اقدامات کے ساتھ نجی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینا بھی شامل تھا۔ ان اداروں کو قومی تحویل میں لینے کا مطالبہ اساتذہ اور طلبہ کی تنظیمیں عرصہ دراز سے کرتی چلی آ رہی تھیں۔ بھٹو نے اشرافیہ کے لئے مخصوص تعلیمی اداروں کے دروازے عام طالب علموں کے لئے کھول دیے۔ طلب علم کا ایک پرانا مطالبہ یعنی ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں کمی بھی تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سینما گھروں کی ٹکٹوں میں بھی رعایت دینے کا اعلان کیا گیا۔ میٹرک تک تعلیم مفت کو دینے کا فیصلہ کیا گیا اور دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے طلبہ کو ٹیکنیکل اور اعلیٰ تعلیم مہیا کرنے کے لئے اوپن یونیورسٹی قائم کی گئی جس کا کام بذریعہ ٹیلی ویژن اور خط و کتابت یہ فریضہ سرانجام دینا ہے۔ بڑے صنعتی اداروں کو قومی تحویل میں لینے اور حکومت کی جانب سے سرکاری شعبے کی انڈسٹری کو وسعت دینے کے نتیجے میں سیکڑوں بیروزگار نوجوانوں کو ملازمتیں ملیں۔ قومی تحویل میں لئے جانے والے اداروں میں تنخواہیں بھی زیادہ تھیں اور ملازمت کا تحفظ بھی حاصل تھا۔ کئی جگہ ضرورت سے زیادہ ملازم بھی بھرتی کر لئے گئے جس سے بیروزگاری کم کرنے میں مدد ملی۔ آنے والے دنوں میں اس کے کچھ منفی اثرات بھی برآمد ہوئے۔ لیکن ان اقدامات کی وجہ سے وقتی طور پر حکومت طلبہ میں مقبول ہوئی۔

صوبہ سندھ میں بھٹو کا سحر نسبتاً زیادہ دیر تک قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ سے پہلی مرتبہ کوئی شخص وزیراعظم بنا تھا۔ بھٹو کے دور حکومت میں پہلی مرتبہ سندھی نوجوانوں کو ملازمتوں میں کچھ حصہ ملنے لگا تھا۔ گو یہ حصہ ان کی توقعات سے کم تھا لیکن انہیں امید تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ بھٹو کی اصلاحات سطحی نوعیت کی تھیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت معاشی وسماجی نظام کی بنیادوں میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکی تھی۔ اس لئے کچھ عرصے کے بعد طلبہ کو محسوس ہونے لگا کہ ان کے مسائل جن میں بے روزگاری سرفہرست تھے اسی طرح سے موجود ہیں۔ تاہم بھٹو دور میں سندھ اور پنجاب میں جہاں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ طلبہ کی سرگرمیوں نے ایک رخ اختیار کیا اور سرحد اور بلوچستان میں دوسرا۔

اس حقیقت کے مدنظر کہ پیپلز پارٹی کو صرف دو صوبوں میں اکثریت حاصل تھی۔ بھٹو کے لئے ضروری تھا کہ وہ نیپ اور جمعیت علمائے اسلام سے مفاہمت پیدا کرے کیونکہ یہی دو پارٹیاں سرحد اور بلوچستان میں حکومت قائم کرنے کی پوزیشن میں تھیں۔ یہ مفاہمت کئی اور وجوہات کی بناء پر بھی ضروری تھی۔ ابھی ملک کے لئے نئے دستور کے بارے میں قومی اتفاق رائے پیدا کرنا ضروری تھا۔ بھارت میں قید ہزاروں پاکستانی فوجیوں کی بازیابی کے لئے ملک کے اندر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں بھٹو کو بڑی طاقتوں اور بھارت سے گفت وشنید کرنا تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے اندرونی طور پر ہر طرف سے حمایت حاصل ہو۔ چنانچہ مارچ 1972ء میں بھٹو نے نیپ اور جمعیت کے ساتھ باہمی تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کو سارے ملک میں سراہا گیا۔ تاہم جلد ہی ایک جانب بھٹو اور دوسری طرف نیپ اور جمعیت میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ گو وقتی طور پر ان پر قابو پا لیا گیا مگر جن وجوہات کی بناء پر یہ وجود میں آئے تھے وہ برقرار ہیں۔ یہ وجوہات مندرجہ ذیل تھیں۔

1- بھٹو پنجاب اور سندھ میں مضبوط تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ سرحد اور بلوچستان میں کسی طرح سے نیپ اور جمعیت کے اثرات ختم کر کے ان صوبوں میں بھی اپنی حکومت قائم کرے۔

2- خان عبدالولی خان اور مفتی محمود پنجاب میں جو گزشتہ انتخابات کے بعد سے پیپلز پارٹی کا قلعہ بنا ہوا تھا اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتے تھے۔

3- مسلم لیگی ، رہنما خان عبد القویم خان ان دونوں دھڑوں کے اختلافات کو استعمال کر کے نیپ کو جو اس کی روایتی حریف تھی سرحد اور بلوچستان سے بے دخل کرنا چاہتا تھا۔

4- ایک طرف پیپلز پارٹی اور دوسری طرف نیپ اور جمعیت کے کارکنوں میں معاہدے کے بارے میں تحفظات موجود تھے۔ دونوں اطراف میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اس معاہدہ کو دوسرے فریق کی فتح اور اپنی شکست سے تعبیر کرتے تھے اور اسے ختم کرنے کے خواہاں تھے۔

معاہدہ کی سیاہی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ دونوں جانب سے ایک دوسرے کے خلاف بیانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھٹو کا پلہ بھاڑی تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک طرف مارشل لا کے وہ تمام تر اختیارات تھے جو اس نے یحیٰی خان سے اصل کئے تھے۔ دوسری جانب سرحد اور بلوچستان میں جو گورنر دسمبر 1971ء میں مقرر کئے گئے تھے یعنی حیات محمد خان شیر پاؤ اور غوث بخش ریئسانی ان کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ سرحد میں نیپ تھوڑا عرصہ پہلے طبقاتی بنیادوں پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ولی خان کے ساتھ صوبے کے خواتین یا بڑے زمیندار تھے اور افضل بنگش اور میجر (ریٹائرڈ) اسحاق محمد کی مزدور کسان پارٹی کے ساتھ بے زمین کسان اور کھیت مزدور، جلد ہی ولی خان کی جانب سے شکایات آنے لگیں کہ ایک طرف پیپلز پارٹی بے زمین کسانوں کو خوانین کے خلاف بھڑکا رہی ہے تو دوسری طرف عبدالقیوم خان انہیں اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پیپلز پارٹی کا گورنر صوبے کے عوام سے اس طرح کے وعدے کر رہا ہے جو کوئی بھی صوبائی حکومت اپنے وسائل کے ساتھ پورے نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہ ان وعدوں کا اصل مقصد نیپ اور جمعیت کی مستقبل کی حکومت کے لئے مسائل پیدا کرنا ہے۔

ولی خان کے لئے سردردی پیدا کرنے والوں میں دو سابق طالب علم رہنما پیش پیش تھے۔ یہ دونوں اب پیپلز پارٹی میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک جس کا تعلق کراچی

سے تھا بھٹو کا مشیر تھا۔ یہ رہنما ایک مشن کے تحت سرحد کے دیہاتی علاقوں میں کسانوں کے جلسوں میں خوانین کے خلاف تیز و تند تقاریر کر رہے تھے۔ انہیں اس سلسلے میں راولپنڈی سازش کیس میں شہرت حاصل کرنے والے سابق جنرل اکبر خان کی اشیر باد بھی حاصل تھی جو اس وقت بھٹو کے بہت نزدیک تھا۔

تاہم بھٹو کو ابھی نیپ اور جمعیت کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اس لئے اپریل کے آخر میں سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی جانب سے نامزد کئے جانے والے دونوں افراد کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ مئی میں ان دونوں صوبوں میں نیپ جمعیت وزارت نے حلف اٹھا لیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اختلاف کی بنیادیں ابھی موجود تھیں چنانچہ جلد ہی باہمی تنازعات شدت اختیار کر گئے۔ نیپ نے الزام لگایا کہ مرکزی حکومت سرحد کے کسانوں کو مسلح بغاوت پر اکسا رہی ہے۔ مرکزی حکومت نے اس بات پر اعتراض کیا کہ صوبہ میں سر پوشیوں پر لگائی جانے والی پابندی اٹھا لی گئی ہے۔ بلوچستان کی حکومت بارے پراپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ علیحدگی پسند عناصر کو شہ دے رہی ہے۔ اس پر صوبے کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے ایک تفصیلی بیان جاری کیا جس میں اس الزام کی تردید کی گئی تھی۔ اس بیان میں کہا گیا تھا ''ہم متحدہ پاکستان کے حامی ہیں۔ اس کی خاطر ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو تیار ہیں۔ اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں کہ صوبے میں کوئی علیحدگی پسند تحریک جاری ہے۔ اس طرح کے الزامات کا مقصد ہماری پارٹی کی حکومت کو بدنام کرنا ہے۔ اس وقت پاکستان اپنی تاریخ کے بہت ہی نازک موڑ سے گزر رہا ہے۔ ہمارا دشمن بھارت ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس لئے عین اپنی صفوں میں انتشار اور تفریق پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تا کہ ہمارے دشمن کو اپنے مکروہ عزائم پورا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ (1) اندازہ ہوتا تھا کہ مرکزی حکومت نیپ کی حکومتوں کو برطرف کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ وہ صرف مناسب حالات کی منتظر ہے اور اس دوران ایسے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے جنہیں برطرفی کا جواز بنایا جا سکے۔ شہنشاہ ایران بھی جس کے بھٹو سے گہرے مراسم تھے۔ بلوچستان کی حکومت کی برطرفی کا خواہاں تھا کیونکہ بلوچستان میں ایک ایسی پارٹی کی حکومت کا قیام جو بلوچ قوم پرستوں پر مشتمل ہو ایرانی بلوچستان میں اس کے لئے

اچھے جذبات پیدا کر سکتا تھا۔ شاہ ایران اپنے ملک میں ہر قسم کی قومیتی تحریک کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عراقی حکومت کردوں اور ایرانی عربوں کو شہنشاہ کے خلاف اکسا رہی ہے۔

بالآخر فروری 1973ء میں بھٹو نے بلوچستان میں نیپ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بلوچستان کے گورنر غوث بخش بزنجو اور وزیراعلیٰ عطاء اللہ مینگل پر آئینی اختیارات سے تجاوز کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ لوگ روس اور عراق کی شہہ پر پاکستان اور ایران کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں۔ بلوچستان کی حکومت کی برطرفی کے خلاف احتجاج کے طور پر صوبہ سرحد کی نیپ جمعیت مخلوط حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ بلوچوں نے اپنی منتخب حکومت کی بے جواز برطرفی کو قومی اہانت قرار دیتے ہوئے بلوچی رواج کے مطابق گوریلا جنگ کا اعلان کر دیا۔ یہ جنگ اگلے چار سالوں تک جاری رہی۔

بلوچستان میں ہونے والی گوریلا کاروائیوں میں طلبہ نے بھی حصہ لیا۔ باقی ملک میں احتجاج کی جو شکلیں مقبول تھیں ان کے مقابلے میں بلوچ طلبہ کا گوریلا جنگ میں شرکت کرنا ایک غیر معمولی ردعمل تھا۔ دوسرے صوبوں میں طلبہ مطالبات منوانے کے لئے جو معروف طریقے استعمال کرتے تھے ان میں ریزولیوشن پاس کرنا، بھوک ہڑتال کرنا، جلسوں کے ذریعے اپنے مطالبات حکومت تک پہنچانا اور مظاہرے کرنا شامل تھے۔ بعض اوقات طلبہ پولیس پر خشت باری بھی کر دیتے تھے، سرکاری املاک یا نجی گاڑیوں کو نقصان بھی پہنچاتے تھے۔ لیکن تشدد کا استعمال صرف اس وقت کیا جاتا تھا۔ جب وہ سخت اشتعال کی کیفیت سے دو چار ہو۔ یہ کیسے ہوا کہ بلوچ طلبہ نے پر امن احتجاج کے طریقے آزمائے بغیر ایکدم بندوق اٹھالی اور پہاڑوں کا رخ کیا؟

اس سوال کا جواب بلوچستان کے سیاسی ارتقا کی مخصوص سٹیج اور بلوچ روایات و ثقافت میں ملتا ہے۔ 1970ء سے قبل بلوچستان کو صوبائی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بلوچستان انتخابی عمل اور جمہوری اداروں سے پہلی دفعہ اسی سال روشناس ہوا تھا۔ بلوچستان میں جمہوری سیاست اور طرز احتجاج سے شناسائی، صرف آبادی، کے ایک مختصر حصے کو حاصل تھی۔ حکومت کی برطرفی کے بعد ان لوگوں نے اپنی شکایت کے ازالہ کے لئے تمام معروف طریقے استعمال کئے۔ نیپ نے مرکزی حکومت سے مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی کوشش

کی۔ سرحد اور بلوچستان دونوں جگہ کئی جلسے منعقد کئے اور بے شمار ریزولیوشن پاس کئے۔ یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کومتحرک کیا۔لیکن مرکزی حکومت کا کان پر جوں نہ رینگی۔ بلکہ دونوں صوبوں میں ڈرانے دھمکانے اور رشوت دینے کے طریقوں سے اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کر لی گئیں۔ اس دوران نیپ کے بیشتر سیاسی کارکن اور اس سے ہمدردی رکھنے والے بیشتر طلبہ گرفتار کر لئے گئے۔

بلوچ لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کی گرفتاری کے بعد تحریک کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جن پر قبائلی رسم و رواج کا گہرا اثر تھا۔ بلوچ کلچر میں دشمنیاں نپٹانے کے لئے جو طرز عمل صدیوں سے رائج تھا اس میں پر امن احتجاج کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ روایتی طریقہ کے مطابق دشمن کے خلاف مسلح جنگ لڑی جاتی تھی۔ اور اگر وہ زیادہ طاقتور ہوتا تو پہاڑوں کا رخ کیا جاتا اور وہاں سے کاروائی جاری رکھی جاتی۔ اس سے پہلے بھی بلوچ مرکزی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ لڑ چکے تھے۔

فوج کے خلاف گوریلا کاروائیوں میں بی ایس او کے دونوں دھڑوں نے حصہ لیا۔ بی ایس او کے صدر خیر جان نے خود ایک گوریلا گروپ تشکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی بی ایس او کے پانچ سابق لیڈروں نے بھی اپنے اپنے گوریلا گروپوں کے ساتھ جنگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ خیر جان بلوچ کا کہنا تھا کہ اسے کسی دشواری کے بغیر 300 لڑنے والے کارکن مل گئے تھے اور اگر اس کے پاس لوگوں کو دینے کے لئے بندوقیں ہوتیں تو وہ سینکڑوں مزید کارکن بھرتی کر سکتا تھا۔ (2) بی ایس او (عوامی) کے لیڈروں میں عبدالنبی اور قصبر نے گوریلا جنگ میں حصہ لینے کے لئے پہاڑوں کا رخ کیا۔

بلوچستان میں یہ تنقید عام تھی کہ مرکزی حکومت صوبے کی تعلیمی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس طرح کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے بھٹو نے ایک کریش پروگرام کا آغاز کیا جس کے تحت سیکنڈری اور ڈگری کی سطح کے 27 نئے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ (3) اس سکیم کا مقصد بلوچوں کو یقین دلانا تھا کہ مرکز ان کی تعلیمی ترقی کا خواہاں ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ صوبے میں تعلیم کا فروغ گوریلا جنگ لڑنے والوں کو امن کی طرف راغب کرے گا اور بندوقیں چھوڑ کر تعلیمی اداروں کا رخ کریں گے۔ مسلح کاروائیوں

کے خاتمے تک صوبے کے تعلیمی اداروں میں طلبہ یونینوں پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ تاہم نئے قائم ہونے والے تعلیمی ادارے چونکہ اکثر و بیشتر ضروری سہولتوں سے محروم تھے۔ اس لئے ان اداروں سے جو توقعات مرکزی حکومت نے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں بلکہ نتائج الٹ نکلے۔ نئے قائم ہونے والے کالجوں میں داخلہ لینے والے طلبہ میں احساس محرومی اور بھی شدید ہوا اور یہاں سے گوریلا جنگ لڑنے والوں کو مزید کارکن فراہم ہوئے۔

بلوچستان کی گوریلا جنگ میں جن طلبہ نے حصہ لیا وہ سبھی بلوچ تھے۔ پختون طلبہ اس میں شامل نہ ہوئے۔ اس کی ایک وجہ بھٹو کی بلوچوں اور پختونوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی پالیسی تھی۔ بلوچستان میں نیپ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بھٹو نے ولی خان کے مخالف دھڑے یعنی نیپ پختونواہ کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی۔ اس دھڑے کی قیادت عبد الصمد اچکزئی کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں ولی خان پر یہ اعتراض بھی تھا کہ اس نے بلوچستان میں پشتونوں کے مفاد بلوچوں کے لئے قربان کر دیئے ہیں۔ وہ یوں کہ بلوچستان میں نیپ جمعیت مخلوط حکومت قائم ہونے کے بعد گورنر اور وزیراعلیٰ دونوں کلیدی مناصب میں سے ایک پشتونوں کو دینے کی بجائے دونوں بلوچوں کو دے دیئے ہیں۔ چنانچہ اچکزئی اور پختونخواہ نیپ نے اس دوران پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ (4) دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بھٹو اچکزئی اتحاد اس وقت بھی قائم رہا جب پیپلز پارٹی نے بھی ان دونوں مناصب پر بلوچ مقرر کر دیئے۔ اپریل 1973ء کے آخر میں جب اکبر بگٹی صوبے کا گورنر تھا مرکز کی جانب سے جام غلام قادر کو وزارت اعلیٰ سپرد کر دی گئی۔ اچکزئی نے جو بلوچستان اسمبلی کا رکن تھا احتجاج کے طور پر جام کو ووٹ تو نہیں دیا مگر پیپلز پارٹی کی حمایت جاری رکھی اور کہا کہ قومی مفاد کی خاطر وہ صدر بھٹو کی غیر مشروط حمایت کرتے رہیں گے۔ (5) اگر بلوچستان میں مرکزی حکومت کو اچکزئی کی حمایت نہ حاصل ہوتی تو بھی پختون طلبہ کی جدوجہد کا طریقہ بلوچوں سے مختلف ہوتا۔

بلوچستان اور سرحد میں نیپ کے حامی پختون طلبہ نے گوریلا جنگ کا راستہ تو اختیار نہ کیا لیکن اس دوران دونوں صوبوں میں بم دھماکوں کے واقعات میں یکا یک اضافہ ہو گیا۔ ان کا نشانہ بالعموم سرکاری تنصیبات یا نیپ مخالف شخصیات تھیں۔ پشاور میں ریڈیو

پاکستان کی عمارت میں بم دھماکہ ہوا، بنوں میں ٹیلی فون ایکسچینج کی بلڈنگ سے بم برآمد ہوا اور صوبائی گورنر اسلم خٹک کے عزیز سینیٹر نعمت اللہ کے گھر پر کسی نے بم پھینکا۔ کوہاٹ میں صوبائی وزیر نوابزادہ عظمت علی خان کی رہائش گاہ کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ 3 دسمبر 1973ء کی رات پیپلز پارٹی کے اتحادی عبد الصمد خان اچکزئی کی گھر کے روشندان سے کسی نے اس طرح سے صحیح نشانہ لے کر بم پھینکے کہ وہ براہ راست ان کے اوپر آ کر پھٹے اور وہ موقعہ پر ہلاک ہو گئے۔ اس واردات میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان سب کا تعلق نیپ، پختون، زلیسی اور پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا۔

دہشت گردی کی وارداتیں اگلے دو سال تک جاری رہیں۔ اس دوران پاکستان اور حکومت افغانستان کے تعلقات بھی روز بروز کشیدہ ہوتے چلے گئے اور بھٹو اور وزیر داخلہ عبد القیوم خان ان وارداتوں کی ذمہ داری نیپ اور افغان حکومت پر ڈالتے رہے بلکہ بھٹو نے یونائیٹڈ نیشنز کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈ ہائیم کے نام افغان حکومت کی پاکستان کے داخلی امور میں مداخلت کے خلاف ایک مراسلہ بھی ارسال کیا جس میں اقوام متحدہ سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اسے روکنے کے لئے اقدامات عمل میں لائے۔ فروری 1975ء میں بھٹو حکومت نے پارلیمنٹ سے Suppression of terrorist activities Bill پاس کرایا۔ اس دوران ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل سپیشل کورٹ دہشت گردی کی کاروائیوں میں مبینہ طور پر ملوث افراد کو سزائیں بھی دیتے رہے۔ ان ملزموں میں سے اکثر کا تعلق نیپ سے تھا۔ نیپ سے تعلق رکھنے والے سرحد اسمبلی کے رکن حاجی تاج محمد سے بھی دھماکہ خیز مواد برآمد کر کے ان کا کیس سپیشل کورٹ کے پاس بھیج دیا گیا۔

3 فروری 1975ء کو حیات محمد خان شیر پاؤ پشاور میں بم دھماکے میں مارے گئے۔ اس وقت شیر پاؤ پیپلز پارٹی سرحد کے صدر اور صوبائی کابینہ میں سینئر وزیر تھے۔ وہ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کی طلبہ یونین کی تقریب حلف وفاداری کے سلسلے میں یونیورسٹی گئے تھے۔ وہ تقریر کرنے کے لئے اٹھے ہی تھے کہ پہلے سے نصب کیا گیا بم پھٹا اور وہ ہسپتال پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔ دھماکے میں 39 سامعین بھی زخمی ہوئے۔ جن میں نو لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اس واقعہ کا صوبہ میں بڑا شدید ردعمل ہوا۔ پیپلز

پارٹی کے کارکن کئی دن جلوس نکالتے رہے۔ اس کے بعد صوبے میں وسیع پیمانے پر نیپ کے لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ولی خان سمیت ملک بھر میں پارٹی کی تمام قیادت گرفتار کر لی گئی۔ 11 فروری کو نیپ پر پابندی لگانے اور دس دن کے اندر کے خلاف سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ فروری کے تیسرے ہفتے میں ملک بھر کے تعلیمی اداروں کے ہاسٹلوں پر ناجائز اسلحہ کی برآمدگی کے لئے چھاپے مارے گئے۔ پشاور یونیورسٹی میں ہاسٹل نمبر 9 پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں سے بہت سا اسلحہ برآمد کیا گیا۔ پشاور یونیورسٹی کے ہاسٹلوں سے 381 پستول اور ریوالور، 9 سٹین گنیں، 2 ہلکی سٹین گنیں، 2 ہینڈ گرینیڈ اور 3,000 کارتوس برآمد کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔

نیپ نے تشدد کی تمام وارداتوں کی ذمہ داری وزیر داخلہ قیوم خان پر ڈالی جو بقول نیپ انہیں بدنام کرنے کی خاطر یہ سب کچھ خود کرا رہا تھا۔ تاہم حکومت کا کہنا تھا کہ ان کاروائیوں میں پختون زلمے ملوث ہے جو نیپ سے ہمدردی رکھنے والے نوجوانوں کی تنظیم تھی۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ نیپ کے ایک رہنما جو لیاقت باغ فائرنگ کیس کے بعد افغانستان میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ ان کاروائیوں کے لئے اسلحہ اور ٹریننگ مہیا کر رہے تھے۔ شیر پاؤ کے قتل کے بعد نیپ سے ہمدردی رکھنے والے طلبہ کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ مزید وسیع ہو گیا۔ اگلے چند ماہ میں جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن اور پختون زلمے کے بہت سے لیڈر اور کارکن شامل تھے۔

سندھ میں بھٹو کو جی ایم سید کے حامی طلبہ کا مقابلہ کرنا پڑا جن کا اوڑھنا بچھونا انتہا پسندانہ نعرے تھے۔ بھٹو کی سیاست کی بنیاد متحدہ پاکستان تھا۔ اس کے برعکس جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن آزاد اور خود مختار سندھ کی بات کرتی تھی۔ بھٹو کے بعض اقدامات نے پیپلز پارٹی اور سندھ کی طلبہ تنظیموں کے درمیان اختلافات کی خلیج مزید گہری کر دی۔ بنگلہ دیش سے بہاریوں کو واپس لانے پر جب بھٹو نے رضا مندی کا اظہار کیا تو سندھی طلبہ میں اس کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے آنے سے سندھیوں کو خود اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا خدشہ تھا۔ ابھی بہاریوں کو لانے کی گفت وشنید

ابتدائی مراحل میں تھی کہ مرکزی وزیر تعلیم قانون و پارلیمانی امور عبد الحفیظ پیرزادہ پر سندھ یونیورسٹی میں حملہ ہوا۔

اس واقعہ کی تفصیلات اس طرح سے ہیں۔ حفیظ پیرزادہ کو یونیورسٹی کانووکیشن میں ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ وزیر موصوف جب کانووکیشن کے بعد گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو جیئے سندھ فیڈریشن کے ایک کارکن نے ان پر حملہ کر دیا۔ جائے وقوعہ پر موجود طلبہ نے اسے پکڑ لیا مگر جلد ہی جیئے سندھ والے پہنچ گئے۔ وہ بہاریوں کی واپسی کے خلاف اور سندھو دیش کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے انہوں نے اپنے کارکن کو چھڑانے کی کوشش میں پولیس پر ہلہ بول دیا۔ اس دوران دونوں جانب سے فائرنگ ہوئی جس سے ایک پولیس کانسٹیبل زخمی ہوا۔ ایس پی دادو پیر بخش بلوچ اس واقعہ کے صدمہ کی وجہ سے موقعہ پر ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔ (6) بالآخر 1974ء میں ڈھاکہ میں ہونے والی مجیب بھٹو ملاقات کے نتیجے میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پونے دو لاکھ اور غیر سرکاری اندازے کے مطابق 5 لاکھ بہاری پاکستان لا کر بسائے گئے۔ ان کے لئے ملک کے مختلف صوبوں میں کالونیاں تعمیر کی گئیں۔ لیکن بعد میں ان میں سے اکثر اپنی جائیداد فروخت کر کے کراچی جا کر آباد ہو گئے۔

سندھ میں جی ایم سید کی علیحدگی پسندانہ سوچ اور پیپلز پارٹی کی متحدہ پاکستان کی سوچ کی وجہ سے دونوں کی طلبہ تنظیموں میں فساد جاری رہا۔ 8 اپریل 1974ء کو نوشہرو فیروز میں سپاف کا کل سندھ کنونشن منعقد ہوا اس میں صدارتی تقریر سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی نے کی۔ اپنے خطاب میں جتوئی نے علیحدگی پسند عناصر کی مذمت کرتے ہوئے انہیں تنبیہہ کی۔ ’’ملک کی سالمین برقرار رکھنے کے لئے ہم اپنا خون دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اگر پاکستان نہ رہا تو سندھ بھی نہیں رہے گا۔ پاکستان کا وجود ہی سندھ کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ جیئے سندھ کا نعرہ صرف سندھ کے نوجوانوں ہی کا نعرہ نہیں بلکہ یہ پاکستان کے ہر محبِّ وطن شہری کا نعرہ ہے۔ یہ نعرہ بلند کئے بغیر کوئی شخص بھی اپنے آپ کو دھرتی کا بیٹا ثابت نہیں کر سکتا۔ ماضی میں اس نعرہ کا غلط استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے سندھو دیش کی حمایت کی جائے۔ یہ نعرہ فی الحقیقت سندھ کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس کا مطلب قطعاً سندھ کی علیحدگی نہیں ہے۔ ہم ان سندھی دیشیوں کی گردن مروڑ دیں گے جو سندھ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی بات کرتے ہیں۔'' (7)

بھٹو کو دوسرا چیلنج سندھ کی ترقی پسند تحریک سے ہوا۔ سندھ کے ترقی پسند پاکستان کی مظلوم قومیتوں کے مسائل حل کرانے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے جاگیرداروں کے وطن فروش کردار پر بھی تنقید کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہاریوں کی تنظیمیں بنانے پر بھی توجہ دی۔ ان میں سے جن لوگوں نے طلبہ کو منظم کرنے کا بیڑا اٹھایا ان میں رسول بخش پلیجو پیش پیش تھے۔ 1967ء میں رسول بخش پلیجو کے زیر اثر طلبہ نے سندھ سٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی تھی۔ 1977ء میں انہیں نے سندھی شاگرد تحریک (SST) قائم کی جس میں سندھ کی باقی تمام طالب علم تنظیموں سے زیادہ سنجیدہ اور نظریاتی اعتبار سے پختہ طالب علم شریک تھے۔ ان میں میڈیکل کالجوں کے طلبہ بڑی تعداد میں شامل تھے۔ سندھی شاگرد تحریک میں طالبات کی بھی معقول نمائندگی تھی۔ سندھی شاگرد تحریک سے منسلک کارکن مزدوروں اور کسانوں کے علاوہ سندھی عوامی تحریک میں بھی فعال کردار ادا کرتے تھے۔ جبکہ طالبات سندھی خواتین کی تنظیم سندھیانی تحریک کی تنظیم سازی میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ سندھی شاگرد تحریک کے خطوط پر سکون کے بچوں میں بھی تنظیم سازی کی گئی تھی۔ سندھی شاگرد تحریک قومی حقوق کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ قومی تعصب یا نسل پرستی کی بھی مخالفت کرتی تھی اور اس کے تمام ملک کی ترقی پسند طالب علم تنظیموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ اس کے کارکنوں میں جتنی وسیع النظری تھی اتنی ملک کی دیگر طلبہ تنظیموں میں کم ہی نظر آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اس تنظیم کو جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن اور نیو سندھی سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن (پی ایس ایف) کی بنیاد ی1973ء میں رکھی گئی تھی۔ اس تنظیم کی شاخیں جلد ہی سارے پاکستان میں قائم ہوگئیں۔ سندھ میں اس تنظیم کو سپاف یعنی سندھ پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا نام دیا گیا۔ حکومتی سرپرستی کی وجہ سے پی ایس ایف کو دوسروں کے مقابلے میں کئی فوائد حاصل تھے۔ لیکن برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ تعلق کی بناء پر

اسے عام طلبہ میں مقبول کرنا ایک دشوار کام بھی ثابت ہوا۔ سندھ میں سپاف کا قیام پارٹی کے صوبائی رہنماؤں کی کوششوں کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا اس لئے طلبہ تنظیم ان دھڑے بندیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جو صوبے کی پیپلز پارٹی کے اندر موجود تھیں۔ اس دور میں ہر نئے آنے والے وزیراعلیٰ نے اپنی مرضی سے سپاف کا صدر مقرر کیا۔ برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ قرب کی بناء پر سپاف کے کارکنوں میں ذاتی فوائد حاصل کرنے کے لئے دوڑ لگ گئی۔ اور یہ تنظیم بھٹو کے دور اقتدار میں کوئی بھی قد آور لیڈر پیدا نہ کرسکی۔

صوبہ سرحد میں پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن نیپ کا طالب علم فرنٹ تھی۔ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مقبولیت میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ پہلی یہ کہ صوبہ سرحد میں پختونوں کے علاوہ اور بھی کئی ذیلی قومیتیں آباد ہیں اور ان کی مجموعی تعداد پختون آبادی سے تھوڑی ہی کم ہے۔ چنانچہ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور چترال میں کبھی بھی مضبوط تنظیم نہ بن سکی۔ اس کا سارا زور پشاور کے اردگرد کے اضلاع تک محدود رہا۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں کسان تحریک اٹھنے کے بعد نیپ کو بالعموم خوانین کی پارٹی تصور کیا جانے لگا۔ اور وہ طلبہ جو ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ اس کے نیپ کے ساتھ تعلقات کی بناء پر اس کے بارہ میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے۔ ان تمام مسائل کے باوجود پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن نے صوبہ اپنے لئے ایک جگہ پیدا کر لی۔ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ترقی پسند لیڈروں میں سب سے معروف نام افراسیاب خٹک ہے۔ اسی دوران جاگیرداری نظام اور سامراج مخالف سوچ رکھنے والے طلبہ نے صوبہ سرحد میں پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہ تھا۔ لیکن مظلوم طبقات سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے اس تنظیم کے اکثر طلبہ مزدور کسان پارٹی کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انہی دنوں سرحد میں پی ایس ایف کا قیام بھی عمل میں آیا اور چونکہ پیپلز پارٹی کا مقابلہ نیپ سے تھا۔ جسے اس کے مخالفین خوانین کی پارٹی قرار دے رہے تھے اس لئے پی ایس ایف میں بھی بہت سے ایسے طلبہ اکٹھے ہو گئے جو ترقی پسند سوچ رکھتے تھے۔

پنجاب میں پیپلز پارٹی جوں جوں عوام میں غیر مقبول ہوتی گئی۔ دائیں بازو کی جماعتوں کو سوشلزم کے خلاف پراپیگنڈہ کا موقعہ فراہم ہوتا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیپلز

پارٹی کے مخالفین اس کی پالیسیوں کو سوشلسٹ پالیساں قرار دیتے تھے۔ بھٹو کی تمام کمزوریوں ، ناکامیوں اور غلط ترجیحات کو سوشلزم کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔ اس نے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تنظیموں کے لئے مسائل پیدا کئے۔

اس دور میں دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کی جانب سے حکومت کی مخالفت کے لئے جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ نعرے لگائے گئے۔ ایسے مطالبات پیش کئے گئے جن کا مقصد حکومت کو زچ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان مطالبات کو منوانے کے لئے طلبہ میں ہیجان پیدا کیا گیا۔ اس طرح کے مسئلے کھڑے کئے گئے جن سے قومی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ان دنوں حکومت پر بین الاقوامی دباؤ پڑ رہا تھا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے۔ بھارت میں قید پاکستانی فوجیوں کی واپسی کا مسئلہ بھی اس سے متعلق تھا۔ اس دوران دسمبر 1972ء میں اسلامی جمعیت طلبہ نے بنگلہ دیش نامنظور کے نعرہ کے تحت لاہور سے جلسوں اور مظاہروں کا آغاز کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے اور ملک کے مفادات میں ہے کہ اسے تسلیم کرلیا جائے۔ جمعیت نے عام طلبہ کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ جمعیت نے یوم سلیت پاکستان منانے کا اعلان کیا جس سے یہ تاثر دینا مطلوب تھا کہ حکومت کے برعکس جمعیت اب بھی بنگلہ دیش کو علیحدہ ملک ماننے کی بجائے پاکستان ہی کا حصہ تصور کرتی ہے اور یہ کہ اسے آزاد اور خودمختار ملک تسلیم کرنا قومی مفادات سے غداری ہے۔ جمعیت کی اس مہم کے دوران پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپ میں پولیس کی گولی لگنے سے ایک طالب علم جس کا نام عبدالوحید تھا ہلاک ہوگیا۔ فروری 1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر جمعیت نے پھر بنگلہ دیش نامنظور کے نعروں سے حکومت کے لئے خفت کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شیخ مجیب الرحمان کی گاڑی کے سامنے مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی جو پولیس نے ناکام بنادی۔ (8)

حکومت کو دفاعی پوزیشن میں لانے کے لئے دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے ایسے فرقہ وارانہ مسائل بھی اٹھائے جن کا مقصد قومی وحدت کو نقصان پہچانا تھا۔ طلبہ کے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے انہیں تشدد اور غاری گری پر اکسایا۔ مئی 1974ء میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی جو مہم چلائی گئی اس میں بھی اسلامی جمعیت طلبہ سب سے آگے تھے۔

اس دوران خونریزی کے واقعات اور فسادات بھی ہوئے اور گوجرانوالہ میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ حکومت نے تنگ آ کر جب تعلیمی ادارے بند کر دیئے تو جمعیت نے پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبات کی مساجد کو اس مہم میں استعمال کیا جہاں سے اشتعال انگیز تقاریر کی جاتی رہیں۔ دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے ایک طرف حکومت پر دباؤ ڈالا اور دوسری طرف مطالبہ تسلیم ہونے تک احمدی اساتذہ اور طلبہ کا تعلیمی اداروں میں داخلہ بند کر دیا۔ جمعیت کے مسلح کارکن ہاسٹلوں میں احمدی طلبہ کو تشدد کا نشانہ بناتے رہے اور ان کے کمروں میں لوٹ مار کرتے رہے۔ یہ سلسلہ اور اس وقت ختم ہوا جب ساڑھے تین ماہ بعد ستمبر میں قومی اسمبلی نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ (9)

بھٹو نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا فیصلہ دائیں بازو کی جماعتوں کے دباؤ میں آ کر کیا تھا۔ دراصل اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو کی پالیسیوں میں آمرانہ رجحانات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے یہ صرف بلوچستان کی منتخب حکومت ختم کی بلکہ صوبے میں فوجی ایکشن بھی شروع کیا۔ سرحد اسمبلی میں پیپلز پارٹی کا صرف ایک امیدوار جیتا تھا اس کے باوجود یہاں بھی نیپ جمعیت مخلوط حکومت کے استعفیٰ دینے کے بعد پیپلز پارٹی کی وزارت قائم کی گئی۔ ملک میں ایمرجنسی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز بھٹو دور میں آخر تک قائم رکھے گئے۔ نیپ پر پابندی عائد کر دی گئی خود پیپلز پارٹی کے اندر سے بائیں بازو کے بہت سے کارکنوں اور لیڈروں کو نکال دیا گیا۔ اور جاگیردار طبقہ کی گرفت پارٹی پر مضبوط کر دی گئی۔ اس طرح کے اقدامات کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی کا عوام سے تعلق کٹتا چلا گیا۔ اس دوران بھٹو نے ایسے اقدامات کا اعلان کیا جن کا مقصد مذہبی جماعتوں کو خوش کرنا تھا۔ ان میں شراب پر پابندی اور جمعہ کی تعطیل شامل تھے۔

بھٹو جوں جوں عوام سے کٹتا گیا دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کا خوف کم ہوتا گیا اور ان کی حکومت پر یلغار میں تیزی آتی گئی۔ بھٹو کے مخالفین اس اثنا میں اس کی تمام غیر مقبول پالیسیوں کو سوشلزم کا نام دے کر بدنام کرتے رہے۔ پنجاب میں بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کے لئے بھٹو کا آخری دور خاصہ پریشان کن تھا۔ انہیں پہلے بھی کسی سیاسی جماعت کی اعانت حاصل نہ تھی۔ اور ان کے کارکن بے وسائل ہونے کے باوجود اسلامی جمعیت طلبہ کا مقابلہ

کرتے تھے۔ جسے جماعت اسلامی کی مکمل افرادی اور مالی حمایت حاصل تھی۔ بائیں بازو کے طلبہ کو ایک طرف حکومت کی جانب سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو دوسری جانب جمعیت کے پیشہ ور کارکنوں کا جن کا مقصد تعلیم نہیں بلکہ طالب علم سیاست تھی۔ بھٹو کے آخری دور میں اہم تعلیمی اداروں پر جمعیت کا قبضہ ہونے لگا۔ کراچی یونیورسٹی میں1976ء کے انتخابات میں جمعیت کا پورا پینل جیت گیا اور دوسرے نمبر پر پاکستان لبرل سٹوڈنٹس والے آئے۔ اسی طرح سے پنجاب یونیورسٹی میں حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس کی وجہ سے لیفٹ کو انتخابات کا بائیکاٹ کرنا پڑا اور جمعیت جیت گئی۔

اب بھٹو حکومت کی اپنی کوتاہ اندیشیوں کے نتائج اس کے سامنے آنے لگے۔ مذہبی تنظیمیں پہلے ہی اس سے بیزار بیٹھی ہوئی تھیں۔ بائیں بازو کے برگشتہ ہونے کے بعد پیپلز پارٹی مکمل طور پر بے یارو مددگار ہو کر رہ گئی۔

اگلے سال دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں نے قومی اتحاد قائم کیا جس کا مقصد نظام مصطفٰی کا قیام بتایا گیا۔ ان پارٹیوں کو جب انتخابات میں شکست کا سامنا ہوا تو انہوں نے بھٹو پر ہیرا پھیری کا الزام لگایا اور فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت مخالف تحریک میں ان پارٹیوں کیز یر اثر طلبہ تنظیموں نے بھی حصہ لیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے اپنے پلیٹ فارم سے بھی اور پنجاب سٹوڈنٹس کاؤنسل کے پلیٹ فارم سے بھی طلبہ مظاہروں میں شرکت کی دعوت دی۔ اے ٹی آئی نے پاکستان طلبہ اتحاد کے نام سے سات طلبہ تنظیموں کو اکٹھا کیا جن میں جے ٹی آئی، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، کشمیر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، قومی تحریک طلبہ، اخوت طلبہ پاکستان، استقلال سٹوڈنٹس فیڈریشن اور خود اے ٹی آئی شریک تھیں۔ اے ٹی آئی کے صدر امجد علی چشت کو اس اتحد کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ان میں سے اکثر تنظیمیں محض کاغذی حیثیت رکھتی تھیں۔

بھٹو کے خلاف تحریک نے بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور طلبہ تنظیموں کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ یہ تحریک دائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے چلائی جا رہی تھی جو ہر طرح کی سماجی اصلاحات کی مخالف تھیں۔ جو طبقات اس تحریک کی پشت پناہی کر رہے تھے انہیں بایاں بازو رجعت پسند طبقات کا نام دے کر ہمیشہ رد کرتا رہا تھا۔ اس بات کے آثار بھی

موجود تھے۔ کہ بھٹو مالف ہلچل کو امریکہ کی اشیر باد حاصل ہے۔ یہ تحریک جن انتہا پسند جذباتی نعروں کے حوالے سے چالائی جا رہی تھی ان سے بھی بائیں بازو کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لئے ابتدا میں بائیں بازو کی اکثریت نے اس سے پہلو تہی کی۔ تاہم حکومت نے تحریک سے نمٹنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ بھی بائیں بازو کے لئے قابل قبول نہ تھے۔ بھٹو نے پہلے تو مولانا مودودی سے سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا۔ 15اپریل کو وزیراعظم نے مولانا سے ملاقات کی اور پتہ چلا کہ یہ گزشتہ چند سالوں میں تیسری ملاقات ہے۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ مولانا موصوف کی بعض تجاویز قوم کے اعلیٰ ترین مفاد میں ہیں اور ان پر غور کیا جا رہا ہے۔

ان ملاقاتوں نے بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کو بدظن تو کر دیا تاہم ان سے حکومت کو فائدہ کوئی نہ ہوا۔ جب یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تو حکومت نے تحریک کو دبانے کے لئے انتہائی سخت اقدامات کا سہارا لیا کالے قوانین مثلاً ڈی پی آر کا استعمال عام ہو گیا۔ قومی اتحاد کی خبریں نہ چھاپنے پر پابندی لگا دی گئی۔ سیاسی کارکنوں کی پکڑ دھکڑ عام ہو گئی۔ بھٹو نے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے سیاسی اقدامات اختیار کرنے کی بجائے افسر شاہی پر انحصار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس کی جانب سے کی جانے والی ظالمانہ کاروائیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ 19اپریل کو پولیس نے لاہور میں مظاہرین پر فائرنگ کی جس میں 18افراد مارے گئے۔ یہ کاروائیاں ایسی تھیں جن کی نہ تو حمایت کی جا سکتی تھی اور نہ ان پر خاموش رہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ بائیں بازو کی کئی سیاسی جماعتوں نے بھی بھٹو کی ان کاروائیوں کی مخالفت میں بیانات جاری کئے۔ یکم جون کو لاہور سے جاری ہونے والے ایک بیان میں پنجاب کی بائیں بازو کی چار جماعتوں نے لیفٹ یونٹی کے نام سے ایک نئی تنظیم کا اعلان کیا۔ اس اتحاد میں سوشلسٹ پارٹی، ورکرز پارٹی، متحدہ مزدور مجلس عمل اور نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (پراگریسو) شامل تھیں (10)اتحاد کا اعلان کرتے ہوئے ان پارٹیوں کے ترجمان جناب سی آر اسلم نے وضاحت کی کہ "حکومت کے خلاف موجودہ تحریک میں بائیں بازو کے نظریات کے حامل افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔" ظاہر ہے یہ وضاحت حرف بحرف درست نہ تھی بلکہ اس سے حکومت کی کاروائیوں کے خلاف ردعمل کا اظہار مقصود تھا۔

اس اخباری بیان سے پہلے ہی بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے حکومتی اقدامات کی مخالفت میں چھوٹے موٹے مظاہرے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ان مظاہروں میں جو نعرے لگائے جا رہے تھے وہ حکومتی جبر کے خلاف تھے۔ 17 اپریل کو لاہور کے ایک اخبار میں چھپنے والی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق این ایس او کے کارکنوں نے پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے حکومت کے فسطائی حربوں اور جبر و تشدد کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا جو شاہرہ قائداعظم سے ہوتا ہوا واپس لا کالج پہنچ کر منتشر ہوا۔ اس جلوس میں جو نعرے لگائے گئے وہ بھی بائیں بازو کے اس مخصمے کا اظہار تھے جس کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔ یہ نعرے تھے ''کون بچائے گا پاکستان، طلبہ، مزدور کسان'' ''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو'' اور ''بھٹو کا آئین کیا؟ ڈی پی آر، ڈی پی آر''۔(11)

باب 8

ضیاء الحق کا مارشل لا اور طلبہ میں تشدد کا فروغ

مارشل لا کے دوران ملک کے فوجی حکمرانوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت تعلیمی اداروں میں تشدد کو فروغ دیا۔ طلبہ کی مخصوص تنظیموں کو مسلح کیا گیا اور تعلیمی ادارے ان کے حوالے کر دیئے گئے۔ فوجی حکمرانوں کی منظور نظر تنظیموں کو قتل و غارت گری کی کھلی اجازت مل گئی۔ اگلے چند سالوں میں بیسیوں طلبہ قتل ہوئے۔ تعلیمی ادارے بیک وقت کئی کئی مہینے کے لئے بند کر دیئے گئے اور تعلیمی نظام برباد ہو کر رہ گیا۔ لاقانونیت کی یہ فضا مارشل لا ختم ہو جانے کے بعد بھی آٹھ دس سال جاری رہی اور ابھی تک اس پر مکمل قابو نہیں پایا جا سکا۔ طلبہ میں تشدد کے فروغ سے تعلیمی نظام کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔ اس سے تعلیمی اداروں میں پر امن بحث مباحثہ اور رواداری کی فضا ختم ہو کر رہ گئے ہیں، تعلیمی معیار گر گئے ہیں۔ تعلیمی ادارے بار بار بند ہونے کی وجہ سے طلبہ کے کئی ایک قیمتی سال ضائع ہوئے ہیں۔

ضیاء الحق کی جانب سے متشدد تنظیموں کو کھلی چھٹی دینے کی پالیسی کے نتیجہ میں طالب علم رہنماؤں کی ایسی نسل وجود میں آ گئی تھی جس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ کھیپ مکمل طور پر پیشہ ور لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ نام نہاد طالب علم رہنما کسی اعلیٰ آدرش کی خاطر طالب علم سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کو متحرک کرنے والا جذبہ ان کی کسی آئیڈیالوجی سے وابستگی نہ تھی اور نہ یہ کسی قسم کے قربانی کے تصور سے آشنا تھے۔ ان کا مطمح نظر مادی مفادات کا حصہ تھا۔ جس کے لئے وہ ہر طرح کے جرم کا ارتکاب کرنے کو تیار ہو جاتے تھے ان کی نظر میں طالب علم لیڈری ایک طرح کا پیشہ تھا بالکل اسی طرح جیسے کاروبار یا وکالت مختلف پیشے ہیں فرق صرف یہ تھا کہ لیڈری کے کاروبار میں نہ سرمایہ کاری کی ضرورت تھی، نہ ڈگریوں کے حصول کی۔ یہاں سرکاری سرپرستی اور طاقت کا استعمال بنیادی اہمیت رکھتے تھے اور ان کے ذریعے سے تھوڑے سے وقت میں کروڑوں روپے کی جائیداد

بنائی جا سکتی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹنے کے بعد جب ضیاء الحق نے اسے پھانسی چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو اسے یہ خوف من گیر ہوا کہ عوام میں اس کاروائی کا شدید ردعمل ہو سکتا ہے۔ سو طے کیا گیا کہ ایسی سیاسی پارٹیوں سے رابطہ کیا جائے جن سے تعاون کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مارشل لاء کی ایڈوائزری کمیٹی کو جو چند جرنیلوں اور دو سول افسروں پر مشتمل تھی جولائی 1978ء میں توسیع دی گئی۔ اس میں بعض سیاسی لیڈر بطور وزراء کے شامل کئے گئے اگلے ماہ مزید لوگ وزیر بنائے گئے۔ ان سیاستدانوں کا تعلق تین پارٹیوں سے تھا یعنی مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور پی ڈی پی۔ ان میں دو سابق طالب علم رہنما بھی شامل تھے۔ یعنی پروفیسر خورشید احمد جو 55-1953ء میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ رہ چکے تھے اور اس کے بعد سے جماعت اسلامی کے اہم رہنما شمار ہوتے تھے اور جاوید ہاشمی جو بھٹو کے دور حکومت میں 73-1972ء میں اسلامی جمعیت طلبہ کے پینل پر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس سے جماعت اسلامی اور جمعیت کے فوجی حکمرانوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق طالب علموں کی جانب سے خاص طور پر فکر مند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ہی سال پیشتر ایک اور فوجی حکمران یعنی ایوب خان کا تختہ الٹانے میں طلبہ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس لئے تعلیمی اداروں کے اندر ایسی طلبہ تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو مارشل لاء حکام کے اشارے پر جمہوری قوتوں کے خلاف استعمال ہونے کے لئے تیار ہوں۔ مختلف صوبوں میں ایسی تنظیمیں موجود تھیں جو بوجوہ ضیاء الحق کے ساتھ تعاون کے لئے تیار تھیں۔ ان میں اسلامی جمعیت طلبہ سرفہرست تھی جو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی صورت میں پنجاب کے علاوہ کراچی اور پشاور کے تعلیمی اداروں میں جمہوریت تحریک کی حمایت کرنے والے طلبہ کو دبانے میں مدد کر سکتی تھی۔ جن وجوہات کی بناء پر جماعت اسلامی مارشل لاء کے ساتھ تعاون کر رہی تھی انہی کی بناء پر جمعیت بھی ضیا کا دست و بازو بننے پر تیار تھی۔ پیپلز پارٹی دشمنی فوجی حکمرانوں اور جمعیت کے درمیان قدر مشترک تھی۔ ایک اور اہم وجہ سوشلزم اور جدید افکار کی مخالفت کا جذبہ تھا جو

جمعیت کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ جمعیت اور ضیاء الحق دونوں تعلیمی اداروں سے سوشلسٹ اثرات کے خاتمہ کے خواہاں تھے۔

اسی طرح سے جدید تعلیم کے نتیجے میں طالبات میں اٹھنے والے مطالبات کو جن میں خواتین کی آزادی، ان کے حقوق کا تحفظ اور مردوں کے ساتھ برابری شامل تھے۔ جمعیت انہیں اسلام کے منافی تصور کرتی تھی۔

ضیاء الحق کے اسلامی شریعت کے بارے میں تنگ نظر خیالات میں انہیں کشش نظر آتی تھی۔ اسی طرح جمعیت کا خیال تھا کہ ضیاء الحق کے دور میں اسے تعلیمی اداروں میں ثقافتی سرگرمیوں کو (جنہیں وہ بے حیائی کے مظاہر قرار دیتی تھی) طاقت کے زور پر ختم کرنے کی اجازت ہوگی۔ جمعیت کی نظر میں ضیاء الحق کا مارشل لاء اپنے ہی ایک نظریاتی ساتھی کی حکومت تھی۔ اس دور میں جمعیت طالب علموں کی سوچ اور عمل پر ایسی پابندیاں لگا سکتی تھی جن کی کوئی بھی جمہوری نظام اجازت نہیں دیتا۔ ضیاء الحق نے چونکہ اسلامی نظام نافذ کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا اس لئے جمعیت اس کے مارشل لائی نظام اور جمہوریت کش اقدامات کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کے لئے تیار تھی۔

ضیاء الحق نے جمعیت کی بھرپور سرپرستی شروع کی اور پنجاب اور کراچی کے تعلیمی اداروں میں مارشل لا مخالف طلبہ تنظیموں کی بیخ کنی کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ تعلیم اداروں سے سیاسی، حریفوں کے بزور نکال دیئے جانے کے بعد جوں جوں جمعیت کا ان اداروں پر قبضہ مضبوط ہوتا گیا اس کے مطالبات بڑھتے گئے اور اس کے قائدین کے لہجے میں سختی آتی گئی۔ دوسری جانب ضیاء حکومت کو احساس ہونے لگا کہ تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں ڈالنے سے نقصان کا احتمال ہوسکتا ہے۔ پنجاب میں جمعیت کی مسلسل ناز برداریوں سے تنگ آ کر کچھ دیر بعد ضیا حکومت نے ایم ایس ایف کی سرپرستی بھی کرنا شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں تنظیموں کے درمیان مسابقت کے ذریعے جمعیت کی اجارہ داری ختم کی جائے جو اس نے مارشل لاء کی سرپرستی میں قائم کر لی تھی۔ اب ان دونوں تنظیموں میں تعلیمی اداروں پر اپنا اپنا کنٹرول قائم کرنے کی دوڑ لگ گئی۔ کچھ دیر تک یہ مقابلہ پرامن انداز میں ہوتا رہا لیکن پھر لوہے نے لوہے کو کاٹنا شروع کر دیا۔

کراچی میں جمعیت کے مسلح کارکنوں کے ذریعے پی ایس ایف اور این ایس ایف کو تعلیمی اداروں سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ جب یہ کام کسی قدر مکمل ہوا اور جمعیت یونیورسٹی اور دیگر اداروں میں دندنانے لگی تو اس کے مطالبات میں ہر روز اضافہ ہونے لگا۔ یہاں جمعیت پر دباؤ ڈالنے کے لئے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن موجود نہیں تھی۔ اس لئے یہاں لسانی بنیادوں پر قائم ہونے والی تنظیموں کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔ ابتداء میں پنجابی سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن اور پنجابی میڈکوز کو جمعیت کے خلاف استعمال کیا گیا اور بالآخر آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO) کے سرپرست شفقت رکھا گیا۔ یہ تنظیم 1974ء میں وجود میں آنے والی فارمیسی ایکشن کمیٹی کی کوکھ میں سے برآمد ہوئی تھی۔ ایکشن کمیٹی کے قائم کرنے والوں میں الطاف حسین کے علاوہ عظیم احمد طارق، سلیم شہزاد اور زریں مجید شامل تھے۔ ضیاء الحق کی نظر کرم سے پہلے اے پی ایم ایس او برے حال میں تھی۔ تاہم جب مارشل لاء کے حکام نے اس کی سرپرستی شروع کی تو اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں بھی دونوں تنظیموں میں جنہیں ضیاء الحق کی سرپرستی حاصل تھی ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی جس نے سارے کراچی کے تعلیمی اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اندرون سندھ نہ اسلامی جمعیت طلبہ تھی نہ ایم ایس ایف اور نہ آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن۔ یہاں ایک طرف نیو سندھی سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (NSSO) موجود تھی اور دوسری طرف جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ ان دونوں سے پیپلز پارٹی کی حامی طلبہ تنظیم سپاف اور مختلف ترقی پسند اور قوم پرست طلبہ تنظیموں مثلاً سندھی شاگرد تحریک کو دبانے میں مدد لی گئی۔ نیو سندھی سٹوڈنٹس آرگنائزیشن تعلیمی اداروں میں سندھی طلبہ سے دست و گریبان تھی۔ جب مارشل لا لگا تو اس نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس تنظیم کے رہنماؤں کا یہ خیال تھا کہ چونکہ نئے حکمرانوں نے ایک سندھی لیڈر کو پھانسی پر لٹکایا ہے اور اس کاروائی کے خلاف سب سے زیادہ ردعمل سندھ میں ہو رہا ہے اس لئے مارشل لاء حکام کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان جیسی تنظیموں کی ضرورت پڑے گی جو پہلے ہی سے سندھیوں کے خلاف مورچہ لگا کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ NSSO پہلے بھی مسلح کاروائیوں میں ملوث تھی۔ اب قانون کے محافظوں کی جانب سے تحفظ ملنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے سندھی طلبہ کی

ان تنظیموں کے خلاف نڈر ہو کے مار دھاڑ شروع کر دی جو قوم پرست ہونے کے ساتھ ساتھ سوشلسٹ فکر بھی رکھتی تھیں۔

جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن جی ایم سید کے زیر اثر تھی۔ اس کا ہر اس تنظیم سے جھگڑا تھا جو کل پاکستان سیاسی کی حمایت اور سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کرتی تھی۔ سوشلسٹ نظریات رکھنے والی تنظیموں کے خلاف JSSF کو یہ بھی شکایت تھی کہ یہ جاگیرداری نظام کی مخالفت کر کے سندھی عوام کو خود اپنے ہم قوم جاگیرداروں کے خلاف کھڑا کر رہی تھیں۔ جب کہ اس کے خیال میں اصل ضرورت اس بات کی تھی کہ تمام سندھیوں کو بلا تفریق طبقہ پنجاب کے خلاف متحد کیا جائے۔ ایسی تمام تنظیموں کو جو پنجاب کے مظلوم طبقات کی بات کرتی تھیں۔ جی ایم سید پاکستانی ایجنٹ قرار دیتے تھے۔ جیئے سندھ والے پیپلز پارٹی کے بھی جانی دشمن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو کو پھانسی لگا کر ضیاء نے سندھ کی علیحدگی چاہنے والوں کے ساتھ احسان کیا ہے۔ بھٹو متحدہ پاکستان کا حامی اور سندھ کی آزادی کا مخالف تھا۔ اس نے سندھ میں جی ایم سید کی سیاست ختم کر کے رکھ دی تھی۔ ضیاء الحق نے چونکہ اس کانٹے کو راستہ سے ہٹا دیا تھا اس لئے جیئے سندھ والے اس کے ممنون تھے۔

جی ایم سید کی نظر میں ضیاء کے خلاف چلنے والی جمہوری تحریک کی مخالفت اس لئے بھی ضروری تھی کہ مارشل لاء لگا رہنے کی صورت میں سندھ کے عوام کے اندر پنجاب کے خلاف نفرت پیدا کرنا آسان تھا۔ جب کہ جمہوری نظام آ جانے کے نتیجے میں سندھی عوام میں یہ توقع پیدا ہونے کا خدشہ تھا کہ ان کے مسائل متحدہ پاکستان کے اندر حل ہو سکتے ہیں۔ ضیاء کے مارشل کے جاری رہنے سے جیئے سندھ والوں کا کام آسان ہوتا تھا۔ اسی لئے جب 1983 میں سارا سندھ ایم آر ڈی کی کال پر جمہوری جدوجہد میں شامل ہوا، جیئے سندھ والے اس کی مخالفت کرتے رہے۔ ضیاء الحق خود جیئے سندھ کے اس رول سے مطمئن تھے۔ چنانچہ جہاں ملٹری عدالتیں جمہوری تحریک میں شامل سیاسی کارکنوں کو معمولی نعرے لگانے پر کوڑوں اور قید کی سزائیں دے رہی تھیں وہاں یہی عدالتیں جی ایم سید کی انتہا پسندانہ اور اشتعال انگیز تقریروں اور بیانات سے صرف نظر کر رہی تھیں اور جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے تعلیمی اداروں میں کھلم کھلا علیحدگی کے پرچار کا بھی کوئی

نوٹس نہیں لیتی تھیں۔ ضیاء کا خیال تھا کہ سندھ دیشیوں کے اس طرح کے بیانات سے اسے پنجاب میں تقویت ملتی ہے۔ وہ پنجاب میں سندھ کی ایک ایسی تصویر پیش کرنا چاہتا جس سے اہل پنجاب خوفزدہ ہوں اور اس کے نتیجے میں اس کی ان تمام کاروائیوں کو جائز قرار دیں جو وہ پیپلز پارٹی کو کچلنے اور سندھ کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو دبانے کے لئے کر رہا تھا۔ مقصد یہ باور کرانا تھا کہ سارے سندھی ملک دشمن اور علیحدگی پسند ہیں۔ جن کا صرف ایک نمونہ جی ایم سید ہے۔ جئے سندھ اور ضیاء دونوں کا مفاد اس میں تھا کہ سندھ کے اندر محبّ وطن ترقی چند قوتوں اور پیپلز پارٹی کے حامیوں کو طاقت کے بل پر تعلیمی اداروں سے نکال دیا جائے۔1983ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کی سندھ میں بے مثال کامیابی کے بعد ضیاء حکومت کی پریشانی میں بہت اضافہ ہوگیا اور اس نے ان چاروں تنظیموں یعنی اسلامی جمعیت طلبہAPMSO, NSSOاورJSSF کو جمہوری قوتوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اور بھی زیادہ توجہ دینا شروع کر دیا۔

ضیاء الحق نے برسر اقتدار آتے ہی اسلام آباد میں ایک تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں اسلامی جمعیت طلبہ خصوصی طور پر مدعو کی گئی تھی۔ یہاں جمعیت کی یہ تجویز کہ ایک قومی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے فوری طور پر تسلیم کر لی گئی۔ دوسری تجویز یعنی خواتین یونیورسٹی کی تاسیس پر غور کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ جمعیت نے اظہار تشکر کے طور پر ضیاء الحق کو پنجاب یونیورسٹی کی کانووکیشن میں جو تیرہ سال بعد منعقد ہو رہی تھی مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ اگلے کچھ عرصے میں ضیاء نے اسلامی جمعیت طلبہ اور دیگر مذہبی تنظیموں کی دلجوئی کی خاطر کئی ایک اقدامات کا اعلان کیا۔ مثلاً بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ تعلیمی اداروں میں نماز ظہر اور درس قرآن لازمی قرار دے دیے گئے، عربی زبان چھٹی جماعت کے بعد لازمی مضمون بنا دی گئی۔ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو بھی لازمی مضامین کی فہرست میں شامل کر لیا گیا، تعلیمی اداروں میں مخلوط تقاریب پر پابندی لگا دی گئی اور اسلام آباد میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز قائم کی گئی جس میں جماعت اسلامی اور جمعیت سے تعلق رکھنے والے کئی افراد ملازم رکھے گئے۔

جمعیت طلبہ نے ہی تسلیم کر لینے کے بعد کہ مارشل لاء کا مکمل تعاون اسے حاصل

ہے پنجاب اور کراچی کے تعلیمی اداروں میں مخالفین کے خلاف بڑے پیمانے پر آپریشن کا آغاز کیا۔ مخالف تنظیموں کے طلبہ کو اغوا کیا جانے لگا، طلبہ کو کلاس روموں، امتحانی مراکز اور ہاسٹلوں سے باہر لے جا کر ٹارچر کیا گیا۔ ہاسٹلوں میں گھس کر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مخالفین کے کمروں میں بزور داخل ہو کر توڑ پھوڑ کی گئی۔ دوسری تنظیموں کی جانب سے لگائے جانے والے پوسٹر پھاڑ دیئے جاتے، پوسٹر لگانے والوں کو مارا پیٹا جاتا۔ اس دوران تعلیمی اداروں کے اندر دوسری تنظیموں کو جلسہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان لبرل طلبہ کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جن کا تعلق کسی تنظیم سے نہیں تھا۔ ثقافتی سرگرمیوں کو طاقت کے زور پر بند کیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں اکٹھے پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے آپس میں گفتگو کرنے پر پابندی لگا دی گئی اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر ماریٹ کی جانے لگی۔ اس طرح سے اسلامی جمعیت طلبہ نے تعلیمی اداروں میں دہشت گردی کی فضا قائم کر دی اب جمعیت اسلحہ کا آزادانہ استعمال کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے مخالفین کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ان کے خلاف مارشل لاء کی قائم کردہ انتظامی مشینری فوری طور پر عمل میں آجاتی تھی۔

اس تمام دہشت گردی کے باوجود پنجاب یونیورسٹی اور صوبے کے دیگر تعلیمی اداروں میں لبرل اور بائیں بازو کی تنظیمیں جمعیت کا مقابلہ کرتی رہی۔ ضیا دور میں لاہور کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جمعیت کے تشدد کا مقابلہ کرنے والوں میں پانچ تنظیمیں پیش پیش تھیں یعنی این ایس او، این ایس ایف، پی ایس ایف، کیو ایس ایف اور بلیک ایگلز۔ ان میں QSF انجینئرنگ یونیورسٹی اور ایم اے او کالج میں اور بلیک ایگلز گورنمنٹ سپیئریر سائنس کالج میں جمعیت کے لئے چیلنج بنی ہوئی تھیں۔

1972ء اور 1973ء میں لاہور میں دو طالب علم قتل ہوئے تھے۔ ایک برکات احمد اور دوسرا حنیف برکت۔ ان دونوں کے قتل میں جو لوگ نامزد کئے گئے تھے وہ جمعیت کے جانے پہچانے کارکن تھے۔ اس سے پہلے پنجاب میں طلبہ تنظیموں کی باہمی رقابت کے نتیجہ میں کبھی قتل کی نوبت نہ آئی تھی۔ صوبے میں طلبہ کے اندر قتل و غارت گری کی بنیاد جمعیت نے رکھی۔ ضیاء دور میں جب جمعیت کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو مخالف کیمپ کے مزید لوگ نشانہ بنے۔ 1980ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے انتخابات کے دوران

QSF کا ایک ورکر جمعیت کی جانب سے کی جانے والی فائرنگ میں مارا گیا۔ اگلے سال زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں دو طلبہ قتل ہوئے اور اس کیس میں بھی جمعیت کے کارکن نامزد کیئے گئے۔ اسلامی جمعیت طلبہ اسلحہ رکھنے کی اس قدر عادی ہوگئی تھی کہ 1982ء میں اس کے ناظم اعلیٰ کے بریف کیس سے پستول اس وقت برآمد ہوا جب وہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے والے تھے۔ بقول جمعیت یہ لائسنس شدہ پستول تھا۔ اس واقعہ کی خبر چھپنے پر جمعیت آپے سے باہر گئی۔ یہ تنظیم گزشتہ چھ سال میں تنقید کا جواب تشدد سے دینے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی اور اسے فوجی حکومت کی سرپرستی کا اتنا مان تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ اس خبر کی تائید کرتی اس کے کارکنوں نے روزنامہ جنگ اور نوائے وقت کے دفاتر پر حملہ کر دیا، مختلف شعبوں میں توڑ پھوڑ کی اور ریکارڈ کو نقصان پہنچایا۔ اس واقعہ کے بعد جمعیت اور اخبارات کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا۔ اب رفتہ رفتہ حکومت بھی اپنے ساختہ پر داختہ عناصر کی چیرہ دستیوں سے تنگ آنے لگی تھی۔ چنانچہ جمعیت کے کئی لیڈر اور کارکن گرفتار کر لئے گئے اور کچھ کو فوجی عدالت نے قید اور جرمانے کی سزائیں بھی سنائیں۔ مقصد یہ پیغام پہنچانا تھا کہ اپنی حدود میں رہو۔

ضیاء دور میں تعلیمی اداروں میں جمہوریت سوچ کے دروازے بند کرنے اور اپنی ہم خیال طلبہ تنظیموں کو مضبوط کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کیئے گئے ان میں ان اساتذہ کو ڈرانا دھمکانا اور ان کی بے عزتی کرنا بھی شامل تھا جو جمعیت کے ناجائز مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ تعلیمی اداروں سے ایسے اساتذہ کا اخراج یا تبادلہ بھی کرایا گیا جو نظریاتی اعتبار سے جمعیت کو پسند نہ تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے نصف درجن اساتذہ نکال دیئے گئے یا ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ جون 1978ء میں پنجاب کے مختلف کالجوں سے چالیس کے قریب اساتذہ کا تبادلہ کیا گیا۔ 1981ء میں یہی عمل پھر دہرایا گیا۔ ان میں سے اکثر لوگ یا تو کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کے عہدے دار اور فعال کارکن تھے یا ترقی پسند نقطہ نظر کے حامی تصور کیئے جاتے تھے۔ صرف لاہور ہی سے پانچ کالجوں کے پرنسپل تبدیل کر کے باہر بھیج دیئے گئے۔ جن میں پروفیسر منظور احمد شاہ (شاہ حسین کالج)، پروفیسر منیر احمد خان (دیال سنگھ کالج، پروفیسر ظفر علی خان (جناح کالج آف کامرس) پروفیسر ایس اے

رشید (اسلامیہ کالج) ، اور پروفیسر ایس اے حامد (ایم اے او کالج) شامل تھے۔ اسی طرح سے پروفیسر خواجہ مسعود (پرنسپل گارڈن کالج راولپنڈی) کا بھی تبادلہ کر دیا گیا۔ ان اساتذہ کا تبادلہ ان دور دراز علاقوں میں کیا گیا جہاں طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی۔ مقصد نہ صرف سزا دینا تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ ان اساتذہ کا رابطہ طلبہ کی کم سے کم تعداد سے رہے۔ بعض اساتذہ کو بار بار تبدیل کیا گیا۔ مثلاً پروفیسر ظفر علی خان کے نو سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ مختلف شہروں میں متعین کیا گیا۔ سزا دینے کے لئے مختلف شہروں کے تعلیمی اداروں سے جس طرح سے اساتذہ کا انتخاب کیا گیا اس سے واضح تھا کہ ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والوکو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ 1981ء میں PIA کے طیارہ کے اغواء کے بعد جن لوگوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کیئے گئے ان میں بھی بائیں بازو کے کئی اساتذہ شامل تھے۔

مارشل لاء کی پشت پناہی سے جمعیت نے پنجاب کے اکثر تعلیمی اداروں میں داخلوں کے اصول وضوابط کو پامال کرتے ہوئے اپنی پسند کے بے شمار طلبہ داخل کرائے۔ یہ عمل کئی سال تک جاری رہا۔ اس طرح سے داخل کرائے جانے والے طلبہ بالعموم پروفیشنل طالب علم ہوتے تھے۔ انہیں ہاسٹلوں پر قبضہ کرنے، انتخابات کے موقع پر مخالف فریق کو ہراساں کرنے، دوسری تنظیموں کے کارکنوں کو اغواء کرنے اور بوقت ضرورت لڑائی، مار کٹائی میں استعمال کرنا مطلوب تھا۔ بائیں بازو کے طلبہ یا عام لبرل طلبہ سنجیدگی سے پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر ضروری لڑائیوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ عدالتوں کے چکر لگانے سے پڑھائی کا حرج ہوتا تھا۔ اس کے برعکس جمعیت کے پروفیشنل طلبہ کے لئے تعلیم ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ انہیں طویل مقدمہ بازی سے بھی کوئی خوف نہ تھا۔ ان کے مقدمات کی بلا معاوضہ پیروی کرنے کے لئے جماعت اسلامی کے وکیل موجود تھے۔ تعلیمی اداروں سے ڈگری حاصل کیئے بغیر بھی انہیں سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں ملازمتیں ملنے کا یقین تھا۔

مارشل لا کے قیام کے چھ سال تک ضیاء جمعیت ذہنی مون جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں جمعیت کو دیر تک یہ وہم رہا کہ ضیاء الحق ملک میں واقعی اسلامی نظام تعلیم نافذ کرنے کا خواہشمند ہے اور چونکہ وہ یہ کام ان کی حمایت کے بغیر نہیں کر سکتا اس لئے جمعیت

کی ناز برداری جاری رکھنا اس کی کمزوری بن چکا ہے۔ مارشل لاء لگنے کے بعد جب جمعیت کے کارکنوں ''روشنیوں کا سفر'' شروع کیا تھا تو انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ آمریت کی قوتوں کی ان میں دلچسپی صرف اس حد تک ہے جس حد تک جمعیت ان کے ایجنڈے کی تکمیل میں سازگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اپنی حیثیت کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ تصورات کی بناء پر جمعیت کے مطالبات میں اضافہ ہوتا گیا اور ان کے پورا نہ ہونے پر ان کے لہجے میں سختی آتی گئی۔ 1982ء میں جمعیت نے خواتین یونیورسٹی کے قیام کے لئے مہم کا آغاز کیا۔ انہیں امید تھی کہ مطالبہ منظور ہو جائے گا اور جمعیت اسے طلبہ یونینوں کے اگلے انتخابات میں اپنی ''ایک اور کامیابی'' کے طور پر پیش کر سکے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ضیاء تو خواتین یونیورسٹی کے قیام کا حامی ہے۔ رکاوٹ اصل میں افسر شاہی کی جانب سے ہے۔ جس میں موجود لبرل عناصر تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جمعیت کی جانب سے چھوٹی سی ہلچل انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہو گی۔

جنوری کے آخر میں جمعیت کے زیر اثر پنجاب یونیورسٹی کی طالبات نے اسمبلی ہال کے سامنے خواتین یونیورسٹی کے حق میں مظاہرہ کیا۔ فروری کے آغاز میں جمعیت نے پنجاب یونیورسٹی میں ''خواتین یونیورسٹی کانفرنس'' بلائی جس میں یونیورسٹی کے قیام کے حق میں پر زور تقاریر کی گئیں۔ جب ان کاروائیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو پنجاب یونیورسٹی یونین کے صدر نے جن کا تعلق جمعیت سے تھا ضیاء الحق کے نام ایک خط میں اسے خواتین یونیورسٹی کے بارے میں کئے گئے وعدے کی یاد دہانی کرائی اور اس بات کا خاص طور پر تذکرہ کیا کہ اسلام وعدہ ایفا کرنے پر کتنا زیادہ زور دیتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جمعیت کو اچانک یہ انکشاف ہوا تھا کہ اسلام میں وعدہ پورا کرنے کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ جب کہ اس نے بھی اور اس کی سرپرست جماعت اسلامی نے بھی ملک میں انتخاباب کرانے کے وعدہ سے پھر جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا کیونکہ ضیاء الحق کا ملک میں انتخابات نہ کرانا ان کے اپنے مفاد میں تھا۔ ضیاء کے نام خط میں یونین کے صدر نے بعض چبھتے ہوئے فقرے بھی استعمال کئے تھے۔ مثال کے طور پر خط میں کہا گیا تھا:

''آپ نے 1977ء سے لے کر اب تک تسلسل کے ساتھ خواتین یونیورسٹی کے

قیام کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ وعدہ پوری قوم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کروڑوں افراد کے سامنے کیا ہے اور بار بار کیا ہے۔ لیکن آج 1982ء تک اس میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ جس کے نتیجے میں مایوسی، نفرت اور بے چینی کے جذبات پیدا ہونا فطری امر ہے۔ اس طرز عمل سے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے اور وعدے کا تقدس پامال ہوا ہے۔ اسلام میں وعدے کی کیا اہمیت ہے آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ محض یاد دہانی کے لئے چار احادیث پیش کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جس میں عہد کی پابندی نہیں وہ ہم میں سے نہیں'' پھر ایک شخص نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ مسلمان بخیل ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہوسکتا ہے۔'' پھر پوچھا کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے۔ فرمایا ''نہیں'' ایک موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر نہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا کہ بندے کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے۔'' خط کے آخر میں دھمکی کی زبان بھی استعمال کی گئی تھی:

''محترمی! ہم نے اس مطالبہ کے لئے انتہائی پرامن راستہ اختیار کیا ہے۔ جس میں یادداشتیں دی گئی ہیں، ملاقاتیں ہوئی ہیں، خاموش مظاہرے ہوئے باقاعدہ دستاویزات تیار کرکے فراہم کی گئیں۔ لیکن قوت نافذہ پرامن ذرائع کو شاید کمزوری پر محمول کرتی ہے۔ اگر یہ سوچ ہے تو نہایت غیر دانشمندانہ ہے۔ جس کی اصلاح کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ جناب عالی! وعدے کے باوجود عمل ناپید یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ شاید منتخب ہو کر نہیں آئے۔ اس لئے محض وقت گزارنے والی کیفیت ہے اور عملدرآمد کا سلسلہ سست ہے۔ (1)

دباؤ ڈالنے کی اس طرح کی کوششوں نے ضیاء الحق کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ چونکہ اب اپنی ہی بلی نے مالک کو بھی میاؤں کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ اس کی گردن بھی ذرا سی مروڑ دی جائے۔ چنانچہ اب جمعیت کے Predator کی تلاش شروع کی گئی۔ اس میں کچھ دیر لگنا فطری بات تھی۔ ضیاء حکومت بائیں بازو کی مارشل لاء مخالف طلبہ تنظیموں سے بالخصوص چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والی تنظیموں سے بھی تنگ آئی ہوئی تھی۔ اس لئے فروری 1984ء میں تعلیمی اداروں میں یونینوں پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا گیا۔ تاہم جمعیت کو پھر بھی اس بات کی اجازت دی

گئی کہ وہ جہاں قابض ہے اپنا قبضہ برقرار رکھے۔ چنانچہ یونین پر پابندی کے باوجود جمعیت پنجاب یونیورسٹی کی بسیں استعمال کرتی رہی اور ان تمام مراعات سے جو پابندی لگنے سے پہلے یونین کو حاصل تھیں حسب سابق مستفید ہوتی رہی۔ چھوٹے صوبوں میں یونینوں پر پابندی کی مخالفت بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے کی۔ کراچی میں NSF اور PSF اس میں پیش پیش تھے۔ جمعیت بھی ان کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہوگئی۔ پنجاب میں پہلے جمعیت نے اکیلے تحریک چلانے کا اعلان کیا لیکن جلد ہی اسے بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کی مدد کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ جمعیت کا ماضی کا کردار تھا۔ بقول امیر العظیم ''جمعیت کی اس طلبہ تحریک میں دوسری تنظیموں کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے وہ باہمی اختلافات تھے جو مارشل لاء حکومت نے بڑی چابکدستی سے ہر طبقہ فکر میں پیدا کر کے Divide and rule کے اصول کو اپنا رکھا تھا۔ (2) چھ سال تک ضیاء الحق کے ساتھ جمعیت نے جو قلبی تعلق استوار کئے رکھا تھا اس کی وجہ سے بھی بہت سے لوگوں کے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ جمعیت واقعی حکومت کی مخالفت کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ امیر العظیم ہی کے بقول ''کچھ حلقوں کی رائے تھی کہ یہ نورا کشتی ہے۔''(3) طلبہ یونینوں پر پابندی کے خلاف تحریک فروری اور مارچ کے دو ماہ بعد تک چلتی رہی اور اس دوران پنجاب، سندھ اور سرحد میں کئی طلبہ گرفتار ہوئے۔ کئی تعلیمی اداروں سے نکال دیئے گئے اور کچھ کو فوجی عدالتوں نے سزائیں دیں۔ طلبہ یونینوں پر پابندی کے بعد پہلی مرتبہ ضیاء کے بارے میں جمعیت طلبہ میں مالفانہ جذبات پیدا ہونے لگے اور اس خیال نے جنم لیا کہ انہیں ضیاء اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا رہا تھا۔ تاہم یہ سوچ کوئی بنیادی فکری تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔

1985ء کے شروع ہونے تک ضیاء الحق نے جمعیت کی ضد تلاش کر لی تھی۔ پنجاب میں کام MSF سے لیا جانا تھا اور کراچی میں مختلف لسانی تنظیموں سے۔ منصوبہ یہ تھا کہ تعلیمی اداروں میں اجارہ داری کی بجائے مسابقت کا اصول اپنایا جائے۔ جمعیت بھی کام کرے اور یہ دونوں تنظیمیں بھی اور حکمران انہیں مقررہ حدود میں رکھنے کے لئے حسب ضرورت کبھی ایک کی پیٹھ ٹھونکیں اور کبھی دوسری کی۔ اس طرح سے اگر تعلیمی اداروں کا ڈسپلن

تباہ ہوتا ہے تو ہو، طلبہ کی آپس کی خانہ جنگی کم از کم انہیں آپس میں الجھا کر حکومت کی مخالفت سے تو باز رکھے گی۔ اس سال غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں مرکز اور صوبوں میں مسلم لیگ کی حکومتیں قائم ہوگئی تھی۔ پنجاب حکومت نے MSF اور سندھ نے کراچی میں APMSO اور اندرون سندھ جئے سندھ اور NSSO کی سرپرستی کا آغاز کیا۔

پنجاب کی طرح کراچی میں بھی جمعیت نے پرشدد سیاست کی تیاری 1972ء میں شروع کر دی تھی۔ اس سال جمعیت نے ایک ''تھنڈر سکواڈ'' قائم کیا تھا جس کا مقصد مخالفین سے طاقت کے زور پر نبٹنا تھا۔ اس سال کراچی یونیورسٹی کی کانووکیشن کے موقع پر ''تھنڈر سکواڈ'' کو استعمال کیا گیا۔ یہ کانووکیشن جس میں مہمان خصوصی اس وقت کے پیپلز پارٹی کے گورنر رسول بخش تالپور تھے۔ ہنگامہ کی نظر ہوگیا۔ تاہم اسلامی جمعیت طلبہ کی تشدد کی مشینری پوری طرح حرکت میں اس وقت آئی جب مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ کراچی یونیورسٹی یونین کے انتخابات جمعیت نے جیتے تھے۔ 12 اگست 1979ء کو یونین کے عہدے داروں کی حلف وفاداری کی تقریب کے موقعے پر جمعیت کے مخالفین نے مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرہ کو منتشر کرنے کے لئے جمعیت کے سٹین گن بردار کارکن میدان میں آگئے۔ ان کی جانب سے ہونے والی فائرنگ سے 16 طلبہ اور 2 طالبات زخمی ہوئیں۔ اس طرح سے کراچی کے تعلیمی اداروں میں جدید اسلحہ کے استعمال کی بنیاد اسلامی جمعیت طلبہ نے رکھی (4) اس سے قبل کبھی بھی بات چاقو اور پستول سے آگے نہیں گئی تھی۔

جمعیت کے مارشل لاء سے انتہائی قریبی تعلقات تھے۔ فروری 1981ء میں پی ایس ایف کے ایک طالب علم نے ایک فوجی جیپ کو آگ لگانے کی کوشش کی تو جمعیت کے کارکنوں نے اسے پکڑ کر متعلقہ اہلکاروں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح کی کاروائیاں اس دور میں جمعیت کا معمول تھیں۔ تاہم اگلے ہی دن 26 فروری کو اس کے ردعمل میں کراچی میں جمعیت کا ایک کارکن مارا گیا۔ کہا گیا کہ اسے سلام الدین عرف ٹیپو نے (جو بعد میں پی آئی اے کے جہاز کے اغواء میں مشہور ہوا) قتل کیا ہے۔ اس پر جمعیت نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں تمام جمعیت مخالف طلبہ کا داخلہ طاقت کے زور پر بند کر دیا گیا۔ جمعیت کے علاوہ کسی بھی دوسری طالب علم تنظیم کا بیج لگانے والے کو یونیورسٹی کی حدود میں

داخلہ کی اجازت نہ تھی۔

فروری سے نومبر تک جمعیت کی دہشت گردی کو کسی حلقے سے چیلنج درپیش نہ ہوا۔ اسی دوران پنجابی طالب علموں کا ایک گروپ جو پہلے جمعیت میں شامل تھا اب اس سے علیحدہ ہو گیا۔ اس گروپ کی قیادت ایک طالب علم شوکت چیمہ کر رہا تھا۔ ترقی پسند طالب علم تنظیمیں اس موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہوں نے فوراً یونائیٹڈ سٹوڈنٹس موومنٹ کے نام سے ایک متحدہ محاذ کی بنیاد رکھ دی جس میں چیمہ کا گروپ بھی شامل ہو گیا۔ اب جمعیت کو پہلی دفعہ مضبوط مخالفین کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دوران کراچی یونیورسٹی یونین کے الیکشن ہوئے ووٹوں کی گنتی کے دوران جمعیت اور اس کے مخالفین میں جھگڑا ہو گیا۔ اور جمعیت کی فائرنگ سے شوکت چیمہ زخمی ہو گیا۔ یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ تیسرے دن چیمہ ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہوا۔ اسی فائرنگ میں زخمی ہونے والا جمعیت کا ایک کارکن بھی بعد میں ہلاک ہوا۔ اگلے سال یونائیٹڈ سٹوڈنٹس موومنٹ کا ایک کارکن جمعیت کے ہاتھوں مارا گیا۔

1985ء کے سال میں پنجاب اور سندھ دونوں صوبوں میں طلبہ تنظیموں کے درمیان خانہ جنگی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس سال حکومت کی پروردہ طالب علم تنظیموں نے تشدد کی کارروئیوں کا بنیادی طریقہ واردات طے کر لیا اور بعد میں کئی سال اس پر فوجی ڈرل کی طرح عملدرآمد ہوتا رہا۔ دونوں صوبوں میں عملاً ایک ہی طرح سے مخالفین سے نبٹنا جاتا رہا۔ اس طریقہ واردات کا خاکہ یہ تھا۔ تعلیمی اداروں پر قبضہ کر کے ان میں مخالف طلبہ کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ انہیں امتحانی مراکز سے باہر نکال کر زدوکوب کیا جائے۔ ہاسٹلوں پر قبضہ کر کے یہاں سے بھی مخالفین کو طاقت کے بل پر نکال دیا جائے۔ ان ہاسٹلوں کو اسلحہ سٹور کرنے نیز اغواء کر کے لائے گئے۔ مخالفین کو ٹارچر کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اساتذہ کو تعاون پر مجبور کیا جائے۔ جو تیار نہوں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔

سندھ کی صوبائی حکومت کی شہ پر جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن سارا سال صوبہ کے اندرونی علاقوں میں قتل و غارت گری میں مصروف رہی۔ اس کے چار نشانے تھے۔ پیپلز پارٹی کی حامی سپاف سے تعلق رکھنے والے طالب علم، ترقی پسند سندھی طلبہ تنظیموں کے

ارکان، جئے سندھ فیڈریشن آرگنائزنگ کمیٹی کے کارکن اور غیر سندھی طلبہ۔ اندرون سندھ تشدد کی وارداتیں سب سے زیادہ اسی تنظیم نے کیں۔ سندھ یونیورسٹی، سندھ میڈیکل کالج، چانڈ کا ڈگری کالج اور میڈیکل کالج، شاہ لطیف کالج خیر پور میں اسلحہ کے زور پر اس نے اپنے مخالفین کا جینا محال کر دیا۔ ہاسٹلوں پر طاقت کے بل پر قبضہ کیا اور مخالفین کو نشانہ بنایا۔ چونکہ جئے سندھ کی ان سرگرمیوں کا مخالفین نے مقابلہ کیا اس لئے اس کے کارکن بھی گولیوں کا نشانہ بنے۔

پنجاب میں جمعیت اور MSF کے درمیان جو رقابت کی لڑائی شروع ہوئی اس میں دونوں اطراف پوری طرح مسلح تھیں۔ ایم ایس ایف میں جو لوگ بھرتی ہوئے تھے ان کا نہ کوئی نظریہ تھا اور نہ سیاسی سوچ ان کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد یا آدرش بھی نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر مجرمانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ ان کے لئے کسی شخص کو زندگی سے محروم کر دینا معمولی بات تھی۔ اوپر سے ان لوگوں کو صوبائی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ جمعیت کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا سامنا ایک ایسی مخلوق سے ہے جس سے وہ اب تک نا آشنا تھے اور یہ جنگ بائیں بازو یا پی ایس ایف کے نہتے طلبہ کے ساتھ لڑائی سے مختلف ہے۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں ایم ایس ایف کے علاوہ کچھ مقامی تنظیموں نے بھی جمعیت کے تشدد کا جواب اسی قسم کی زبان میں دیا۔ ان میں لاہور میں دو تنظیمیں قابل ذکر ہیں یعنی QSF اور بلیک ایگلز۔ ان تنظیموں کا تعلق چونکہ بائیں بازو سے نہ تھا اس لئے حکومت ان کے اور جمعیت کے درمیان جاری خونریزی میں غیر جانبدار رہی۔ اب پہلی دفعہ جمعیت کے کارکن طلبہ کی لڑائیوں میں گولی کا نشانہ بننے لگے۔ سول حکومت کے قیام کے پہلے سال لاہور میں جمعیت کے دو کارکن ایم ایس ایف کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ایک کو دیال سنگھ کالج کے اندر مارا گیا اور دوسرے کو اسلامیہ کالج سول لائنز میں۔ پنجاب میں جمعیت نے آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کی پالیسی پر عمل کیا۔ اگلے سال ایم ایس ایف کے دو طلبہ اس کی فائرنگ کا نشانہ بنے۔ جمعیت نے انجینئرنگ یونیورسٹی سے ایم ایس ایف کا قبضہ ختم کرانے کے لئے سارا سال جنگ لڑی۔ قبضہ ختم کرانے اور اسے جاری رکھنے کی خاطر لڑی جانے والی اس بے مقصد جنگ میں دونوں اطراف نے اپنے اپنے زیر قبضہ

ہاسٹلوں میں اسلحہ خانے قائم کر لئے۔ ایک ہاسٹل میں بم بنانے کی کوشش میں مصروف دو طلبہ کے پرخچے اڑ گئے۔ ہر رات ایک دوسرے پر ہاسٹلوں سے فائرنگ کی جانے لگی۔ ان دو تنظیموں کی روز روز کی وحشیانہ لڑائی کے نتیجے میں یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیاں عملاً ختم ہو کے رہ گئیں۔ اکتوبر میں پولیس کی شاہین فورس کی ایک جیپ یونیورسٹی کے باہر کھڑی دیکھ کر جمعیت کے لڑکوں نے اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ پولیس بھی موقعہ کی منتظر تھی چنانچہ اس نے طلبہ کو کسی اور طریقہ سے روکنے کی بجائے سیدھا نشانہ لے کر فائرنگ کی اور جمعیت کے دو کارکنوں کو موقعے پر ہلاک کر دیا۔ اگلے دن نکلنے والے جمعیت کے جلوس نے پنجاب اسمبلی پر حملہ کر دیا۔ پھر یونیورسٹی کے انتظامی بلاک کو آگ لگا دی۔

تعلیمی اداروں پر قبضہ کرنے کا جو جنون جمعیت میں مارشل لا دور میں پیدا کیا گیا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ جب بلیک ایگلز نے لاہور کے سپیریر سائنس کالج میں نومبر کے مہینے میں ایک ریلی کی تو جمعیت نے اسے منتشر کرنے کی خاطر اس پر حملہ کر دیا۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ کسی ایسے تعلیمی ادارے پر جو اس کی نیو کیمپس کی سلطنت کی بغل میں واقع ہو کوئی اور تنظیم قبضہ کر لے؟ یہاں پھر جمعیت نے مخالفین کی قوت کا غلط اندازہ لگایا۔ اس واقعہ کے بعد ہونے والی تین روزہ جنگ میں جمعیت کا نقصان زیادہ ہوا اور آخری دن اسی کا ایک کارکن فریق مخالف کی گولی کا نشانہ بنا۔

1986 میں کراچی میں ڈاؤ میڈیکل کالج ، سندھ میڈیکل کالج اور کراچی یونیورسٹی شہر کے سب سے بڑے میدان جنگ بنے۔ یہاں جمعیت کا ٹارگٹ پی ایس ایف کے کارکنوں کا داخلہ بند کرانا تھا۔ ان کیخلاف پہلے پراپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ سب کے سب الذوالفقار سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کلاشنکوفوں کے بل پر انہیں تعلیمی اداروں سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے دو قتل پی ایس ایف کے ہوئے، پھر دو جمعیت کے دوسرا قتل فروری کے آخر میں ہوا۔ جمعیت نے علامہ اقبال ہاسٹل پر رات کو حملہ کر دیا۔ کراچی یونیورسٹی بھی پانچ گھنٹے تک فائرنگ کے بعد بند کر دی گئی۔ جمعیت کے طلبہ کے ایک جلوس نے سات بسیں نذر آتش کرنے کے علاوہ ریلوے کی پٹڑی کو بھی نقصان پہنچایا۔

جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن تین دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ یعنی جئے سندھ

سٹوڈنٹس فیڈریشن، جئے سندھ آرگنائزنگ کمیٹی (لیڈر، حیدر شاہ) اور پروگریسو جئے سندھ (ڈاکٹر ارباب کھاوڑ کی وطن دوست انقلابی پارٹی کا بازو) ان میں سے پہلے دو دھڑوں کے درمیان1980 کی دہائی میں خونریز جنگیں ہوئی۔ ان لڑائیوں میں متحارب فریق جدید اسلحہ کا بے دریغ استعمال کرتے رہے۔ ہاسٹلوں میں ایک دوسرے کے کارکنوں پر تشدد، کمروں کو آگ لگانا، اور اغواء معمول کی کاروائی بن گئے۔ اول الذکر تنظیم نے آرگنائزنگ کمیٹی پر الزام لگایا کہ یہ سندھ کے خلاف تیار کی گئی خوفناک سازش کا حصہ ہے۔ اور اس کا کام این ایس ایس او کے سات گٹھ جوڑ کے ذریعے اس کے کارکنوں کو قتل کرنا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے اکثر ارکان غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ کہا گیا کہ اس کا ایک لیڈر 1987ء میں ٹھٹھہ ضلع سے ڈاٹسن کار چھیننے کے مقدمہ میں مطلوب ہے۔ ایک اور نے 1979ء میں سکرنڈ میں پٹرول پمپ لوٹنے کی کاروائی کی تھی اور 1980ء میں ایک سرکاری محکمہ کے کیشیئر سے رقم چھینی تھی۔ جبکہ ایک اور رہنما کے خلاف سندھ کرائمز کنٹرول ایکٹ کے تحت کاروائی ہوئی تھی۔ اور کسی دوسرے نے1979ء میں ایک پولیس افسر کی موٹر سائیکل چوری کی تھی۔ جس پر اسے فوجی عدالت نے سزا دی تھی۔ اسی طرح کے الزامات دوسری جانب سے جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے خلاف بھی لگائے جاتے رہے۔

1986ء میں نیو سندھی سٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے بھی مار دھاڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اپنے کارکن بھی مارے گئے۔ پھر مارچ کے مہینے میں جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن اور آرگنائزنگ کمیٹی میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس میں اول الذکر تنظیم کا ایک طالب علم مارا گیا۔ اپریل میں LMC میں جئے سندھ نے سپاف کے خلاف مسلح آپریشن شروع کیا۔ پھر نیو سندھی سٹوڈنٹس آرگنائزیشن والے بھی میدان کارزار میں داخلہ ہو گئے جس کے نتیجے میں تعلیمی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ جولائی میں خیر پور اور اگست میں لاڑکانہ میں دو دو طالب علم تشدد کی سیاست کی بھینٹ چڑھے۔ حکومت یہ تمام خونریزی کے مناظر خاموشی سے دیکھی رہی۔ جب تشدد حد سے بڑھ جاتا تو تعلیمی ادارے بند کر دیئے جاتے۔ اس بات کی کسی کو فکر نہیں تھی کہ اس سے طلبہ کو کتنا نقصان ہوتا ہے۔ حکومت کے بار بار تعلیمی اداروں کو بند کرنے کی پالیسی کی قومی پریس نے کئی مرتبہ مذمت کی۔

اسی طرح سندھ کے تعلیمی اداروں کے ہاسٹلوں میں اسلحہ کی ریل پیل اور غیر طالب علم غنڈہ عناصر کی بھرمار کے خلاف جب اخبارات کی تنقید میں اضافہ ہو گیا تو حکومت نے ہاسٹلوں کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک سپیشل فورس کے قیام کا عندیہ دیا۔ اس پر روزنامہ ڈان نے اپنے ادارتی تبصرہ میں لکھا:

''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مملکت کے مفادات سخت اقدامات کا تقاضا کرتے ہیں۔ گروہی رجحانات کے آزادانہ اظہار، خاص طور پر اس کے سب سے نئے رخ، یعنی لسانی خطوط پر محاذ آرائی، اور اس کے نتیجے میں تشدد کے عام استعمال نے طلبہ ہاسٹلوں کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ہاسٹل ایسی جگہیں بن گئے ہیں جہاں ذاتی اور گروہی جھگڑے خنجروں اور آٹو میٹک ہتھیاروں سے حل کئے جاتے ہیں۔ کئی ہاسٹل اسلحہ خانے بن گئے ہیں اور یہاں سے لڑائیوں کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ کاروائی وہ ناپسندیدہ عناصر کرتے ہیں جن کی تعلیم میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس صورت حال کو جاری رہنے کی اجازت دی گئی تو اس کے تعلیمی عمل پر مہلک اثرات مرتب ہوں گے۔ (5)

نومبر کے مہینے میں ایم ایس ایف نے بلوچستان میں اسلحہ کے زور پر گھسنے کی کوشش کی۔ ایم ایس ایف کا یہاں پر مقابلہ پی ایس او سے ہوا۔ لیکن بلوچستان کا صوبہ ایم ایس ایف کے لئے بھاری پتھر ثابت ہوا۔ ایک ہی لڑائی کے بعد اس نے ہمت ہار دی۔

اسلامی جمعیت طلبہ میں مار دھاڑ کی سوچ اتنی سرایت کر چکی تھی۔ کہ اس کا آسانی سے ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کا اندازہ روزنامہ ''جسارت'' میں چھپنے والے مضمون '' ایک کارکن کے تاثرات'' سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں جمعیت کی جانب سے تشدد کے استعمال کی توجیہہ اس طرح سے کی گئی ہے۔

''ایک پر تشدد معاشرے میں جہاں اسلحہ اور تخریب کاری کی ریل پیل ہو، جہاں در انصاف کمزوروں پر بند ہو، وہاں اس سے امن پسندی، صلح جوئی اور رواداری و برداشت کا مظاہرہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بڑھا دینے کا فلسفہ شریعت محمدی میں موجود نہیں ہے...... اگر معاشرہ کے صالح عنصر نے جمعیت کی پشت پناہی نہ کی اور خدانخواستہ یہاں بدکاروں، بداطواروں، تشدد پیشہ اور تخریب کاروں کا زور بڑھتا چلا

گیا تو ہماری درس گاہیں امن و شرافت کو ترسیں گی۔ شیطان یہاں ننگا ناچے گا۔'' (6)

ان دنوں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ تشدد کی کاروائیوں کا تعلق طلبہ یونینوں پر پابندی سے ہے اور اگر یہ پابندی اٹھالی جائے تو تشدد میں کمی واقع ہو جائے گی۔ مظہر عباس نے کراچی کے انگریزی مجلّہ Herald میں لکھا کہ 1984ء میں یونینوں پر لگنے والی پابندی تعلیمی اداروں کے اندر تشدد کے واقعات میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ مظہر عباس کا کہنا تھا کہ جولائی 1977ء اور اگست 1988ء کے درمیان قتل ہونے والے طلبہ کی کل تعداد 80 تھی۔ ان میں سے 60 یعنی بڑی اکثریت پابندی لگنے کے بعد مارے گئے تھے۔ اسی طرح سے 84-1977ء کے درمیان یعنی پابندی سے پہلے تشدد کی وارداتوں میں زخمی ہونے والے طلبہ کی کل تعداد 300 تھی۔ جبکہ پابندی کے بعد کے چار سالوں میں یہی تعداد 700 ہو گئی۔ (7) خود اسلامی جمعیت طلبہ کے بعض قائدین کا بھی یہی خیال تھا کہ تشدد کی کاروائیاں طلبہ یونینوں پر پابندی کا نتیجہ ہیں۔ لیاقت بلوچ نے روزنامہ جسارت کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہا '' طلبہ یونینوں پر پابندی مارشل لاء کا کالا قانون ہے۔ چونکہ طلبہ کی منتخب قیادت موجود نہیں اس لئے جو شخص زور بازو رکھتا ہے وہ لیڈر بننا چاہتا ہے۔ ایک طرف یہ قانون ہے کہ طالب علم تنظیمیں تعلیمی اداروں میں اپنے گروہ منظّم نہیں کر سکتیں دوسری طرف حکومت کے وفاقی و صوبائی وزراء اور ان کے متعلقین واضح طور پر ایک تنظیم کی سرپرستی کر رہے ہیں، سرمایہ مہیا کر رہے ہیں، براہ راست تھانوں میں پہنچتے ہیں اور عدالتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔'' (8)

1988ء میں طلبہ تنظیموں پر عائد پابندیاں اٹھالی گئیں۔ خیال یہ تھا کہ اس سے تعلیمی اداروں میں امن و امان بحال کرنے میں مدد ملے گی۔ تاہم یہ امیدیں درست ثابت نہ ہوئیں۔ مار دھاڑ حسب سابق جاری رہی۔

1988ء تک کراچی میں جمعیت کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ چنانچہ غوث علی شاہ کی حکومت نے اب APMSO کو آگے کیا۔ فروری کے مہینے میں جمعیت اور مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے درمیان اردو کالج، داؤد کالج آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی اور اسلامیہ کالج میں کئی خونریز جنگیں ہوئیں۔ بالآخر جمعیت کراچی میں پسپائی پر مجبور ہو گئی۔ اور

APMSO کو سرکار کی جانب سے حکومت مخالف قوتوں کو کچلنے کا مینڈیٹ مل گیا۔ مارچ کے مہینے میں کراچی پی ایس ایف کے صدر سید نجیب احمد کو پولیس مقابلے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور مئی کے مہینے میں سپاف کے مرکزی صدر فقیر اقبال ہسبانی کو پولیس نے جعلی مقابلے میں قتل کر دیا۔

پنجاب میں مسلم لیگ کی صوبائی حکومت کی سرپرستی میں MSF نے بالآخر کئی تعلیمی اداروں میں اپنے پنجے گاڑ لئے۔ تعلیمی اداروں کے سربراہوں پر واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ حکومت کے اپنے لوگ ہیں اور انہیں من مانی کرنے دی جائے۔ ایم ایس ایف اور جمعیت کی باہمی جنگ آزمائی نے تعلیمی اداروں کا امن و امان بالکل غارت کر دیا۔ جب ایک طرف اسلحہ کی ریل پیل ہوگئی اور دوسری جانب حکومت کی طرف سے ان کی ہر حرکت سے صرف نظر کیا جانے لگا تو ایم ایس ایف کے کارکن جمعیت کے ساتھ مسابقت کرنے کے ساتھ ساتھ مجرمانہ کارروائیوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ تنظیم کے لئے فنڈ حاصل کرنے کے نام پر تعلیمی اداروں کے اردگرد کے دکانداروں سے بھتہ وصول کیا جانے لگا۔ سالانہ امتحانات کے موقعے پر ایم ایس ایف کے کارکنوں کی سفارش پر نگران مقرر کئے جانے لگے جن کی مدد سے مال کمانے کا دھندا ترقی کر گیا اور اس سے پورا امتحانی نظام کرپشن کا شکار ہوا۔ شہر میں چلنے والی ویگنوں کو روک کر ڈرائیوروں سے زبردستی غنڈہ ٹیکس لیا جانے لگا۔ مارچ 1986ء میں ایک ویگن ڈرائیور کو بمع کیش کے ایم ایس ایف کے کارکنوں نے اس لئے اغواء کر لیا کہ اس نے مطلوبہ رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ 11 مارچ کو ویگنوں اور بسوں کے مالکان نے اس غنڈہ گردی کے خلاف لاہور کی سڑکوں پر مظاہرہ کیا۔ (9)

ایم ایس ایف کے لیڈر اور کارکن رفتہ رفتہ مکمل طور پر جرائم کی دنیا میں داخل ہوتے چلے گئے۔ چھوٹے جرائم سے انہوں نے بڑے جرائم کا رخ کیا۔ رہزنی اور ڈکیتی سے ہوتے ہوئے وہ مالی طور پر زیادہ منفعت بخش جرائم میں ملوث ہو گئے۔ یہ لوگ ناجائز اسلحہ کی فروخت اور منشیات کے کاروبار میں گئے۔ کئی ایک نے قبضہ گروپ تشکیل دئے اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے کروڑوں کی جائیداد کے مالک بن گئے۔ کچھ لوگ طاقت اور غنڈہ گردی کے بل پر ٹرانسپورٹر بنے۔ کچھ نے امتحانی مراکز ٹھیکے پر لینے دینے شروع کر دیئے اور

امتحانی نظام میں بڑے پیمانے پر ناجائز ذرائع کو فروغ دے کر مال کمایا۔ بالآخر ایم ایس ایف کے کئی صوبائی رہنماؤں کے خلاف کئی کئی مقدمات درج ہو گئے۔ اور وہ گرفتاری سے صرف اس لئے محفوظ رہے کہ حکومت کو ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔ انگریزی روزنامہ The News میں چھپنے والی ایک رپورٹ میں ایم ایس ایف کے چند معروف لیڈروں کے کردار پر تبصرہ نیز ان کے خلاف مقدمات کی تفصیلات اس طرح سے دی گئی ہیں:

1- عاطف چودھری ڈکیتی کی 36 وارداتوں میں مطلوب لاہور کے جواء خانوں کا بادشاہ۔

2- اکرم گجر۔ مختلف تھانوں میں 27 کیس۔ لاہور کی جرائم کی دنیا کا ایک اہم کردار۔

3- ارشد امین۔ ڈکیتی، ناجائز قبضہ اور بہت سے دیگر جرائم میں نامزد۔

ان تینوں رہنماؤں کو دیر تک مسلم لیگ کے صوبائی وزراء کی اشیر باد حاصل رہی جس کی بناء پر یہ بلا خوف وخطر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے۔ بالآخر یہ تینوں طالب علم رہنما گولی کا نشانہ بنے۔

پہلے ارشد امین اور عابد چودھری میں جو ایک زمانے میں گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔ چودھراہٹ کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ جون 1991ء میں عابد چودھری جو قتل و غارت گری کے ایک مقدمے کے سلسلے میں انسداد دہشت گردی کے سامنے پیش ہو کر واپس آ رہا تھا راستے میں ارشد امین اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد عاطف چودھری ارشد چودھری اور پولیس کی ملی بھگت سے پولیس حراست میں مارا گیا۔ پھر خود ارشد امین کی باری آئی۔ اس کی موت ان جرائم پیشہ عناصر کے ہاتھوں ہوئی جن کے ساتھ مل کر وہ دھندہ کرتا تھا۔ ان نام نہاد طالب علم رہنماؤں کے علاوہ ایم ایس ایف کے کئی اور اسی طرح کے رہنما جو جرائم میں ملوث تھے بالآخر یا تو پولیس کے ہاتھوں مارے گئے یا ان جرائم پیشہ گروہوں کے ہاتھوں قتل ہوئے جن کے ساتھ ان کی کاروباری رقابت تھی۔ ایم ایس ایف کا مرکزی رہنما عبد الجبار عید کے دن اپنے ہی پرانے شناساؤں کے ہاتھوں جو پہلے اس کے ساتھ جرائم میں شریک ہوا کرتے تھے مارا گیا۔ سابق صوبائی وزیر اور ایم ایس

ایف کے سابق مرکزی صدر ریاض فتیانہ کے بقول95-1985ء کے درمیانی عرصے میں ساٹھ سے ستر طلبہ قتل ہوئے۔(10) ان میں سے نصف درجن کے قریب وہ طلبہ تھے جن کا تعلق جمعیت یا ایم ایس ایف سے نہ تھا۔ بلکہ جو ان دونوں تنظیموں میں سے کسی ایک کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ تاہم جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ہلاک ہونے والوں کی اکثریت ایم ایس ایف اور جمعیت طلبہ سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ ان تنظیموں کے باہمی جھگڑوں میں مارے گئے۔ باقی ماندہ جرائم کی دنیا میں داخل ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ضیا دور میں حکومت اور ریاستی ایجنسیوں کے ذریعہ طلبہ میں تشدد کے رجحانات کی حوصلہ افزائی کے نتائج ملک اب تک بھگت رہا ہے۔

پاکستان میں فوجی حکمرانوں اور ضیا کی باقیات نے جس طریقے سے طالب علم تحریک میں جرائم پیشہ عناصر کو داخل کیا کچھ اسی طرح کی کاروائی بنگلہ دیش میں بھی ہوئی۔ بنگلہ دیش کے تعلیمی اداروں میں بھی ویسے ہی منفی نتائج پیدا ہوئے جیسے پاکستان میں ہوئے تھے۔ بنگلہ دیش کی عظیم الشان طالب علم تحریک جس کی طویل تاریخ بھی تھی۔ جرائم پیشہ بندوق برداروں کے کنٹرول میں جا کر برباد ہوگئی۔ معروف بنگلہ دیشی دانشور رحمان سبحان نے ماضی کے طالب علموں کے پر شکوہ کارناموں اور وطن کی خاطر سرفروشی کا ان کی موجودہ صورت حال سے مقابلہ کرتے ہوئے فکر انگیز تبصرہ کیا ہے:

''طالب علموں کا ایکٹوازم جس طرح سیاسی مشن سے ہٹ کر پیشہ کی شکل اختیار کر گیا ہے اس نے تعلیمی نظام پر اعتماد کو مزید دھچکا پہنچایا ہے۔ بنگلہ دیش کی طالب علم تحریک ایک زمانے میں بنگالیوں کے جمہوری حقوق کی جدوجہد کے ہراول دستہ کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ یہ طلبہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بنگال میں تحریک پاکستان کا بنیادی جزو بنے رہے۔1952ء میں زبان کی تحریک میں آگے آئے۔1954ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی انتخابی شکست میں مدد گار بنے، 1960ء کی دہائی کی ابتداء میں ایوب آمریت کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور 1969ء میں اس کی شکست کا موجب بنے۔ 1970ء کے چناؤ میں انہیں نے بنگلہ بندھو (شیخ مجیب) اور عوامی لیگ کو کامیابی سے ہمکنار کرایا اور 1971ء میں آزادی کی جنگ لڑی۔ انہوں نے اس روایت کو1980ء کی دہائی

میں ہونے والی آمریت مخالف تحریک کے دوران بھی قائم رکھا۔ جس کے نتیجے میں ارشاد حکومت دسمبر 1990ء میں ختم ہوئی۔

'' ایوب خان کی جانب سے مقرر کردہ صوبائی حکمران گورنر منعم خان نے اس وقت کے مشرقی پاکستان کی طالب علم سیاست میں پیشہ ور غنڈوں کو داخل کیا۔ یہ غنڈے 1960ء کی دہائی میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ بنے جو اس وقت طالب علم سیاست میں حکومت کا بازوئے شمشیر زن بنی ہوئی تھی۔ 1966ء کے موسم بہار میں ان کرائے کے قاتلوں کی جانب سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے ریڈیکل چیئرمین مرحوم ڈاکٹر ابومحمود پر قاتلانہ حملہ طالب علم سیاست میں مسلح پیشہ ور مجرموں کی آمد کی ابتداء ثابت ہوا۔ 1960ء کی دہائی میں عوامی لیگ اور بائیں بازو کی طالب علم تنظیمیں بھی این ایس ایف کے غنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اسی طرح کے مشٹنڈوں کی تلاش کرنے لگیں۔ تعلیمی اداروں پر قابض غنڈوں نے حکومتی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی کاروبار کو ترقی دی۔

'' جمہوری تحریک میں آگے آنے والے جسمانی طور پر مضبوط طالب علموں نے طاقت کے استعمال کی روایت کو جنگ آزادی میں آگے بڑھایا۔ یہاں طاقت کا استعمال اس جنگ کو جیتنے میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔ تاہم جب یہ روایت آزادی کے بعد بھی قائم رہی تو جمہوری عمل کے لئے زہر قاتل بن گئی۔ اسلحہ امتحانوں کے دوران نگرانی کرنے والوں کو دھمکانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ انتخابات کے دوران بیلٹ بکس طاقت کے بل پر اٹھائے جانے لگے۔ طالب علم رہنما کاروبار کرنے لگے اور اس دوران پیدا ہونے والے جھگڑے بندوق سے طے کئے جانے لگے۔

''مسلح کاروباری طالب علموں کی اس نئی پود نے جب اپنی خدمات فروخت کرنی شروع کیں تو انہیں جو خریدار فوری طور پر ملا وہ حکومت کی خفیہ ایجنسیاں تھیں۔ ان ایجنسیوں نے بنگلہ دیش نیشلسٹ پارٹی کے لئے ایک طالب علم ونگ قائم کر دیا جو ان خریدے ہوئے طالب علم کارکنوں پر مشتمل تھا جو کبھی اقتدار سے محروم کی جانے والی پارٹی میں ہوا کرتے تھے یہ کوئی عجب بات نہ تھی کہ انہی خفیہ ایجنسیوں نے ارشاد حکومت کو بھی طالب علموں کی کھیپ

مہیا کی۔ یا یہ کہ انہوں نے فساد پسند پیشہ ور طالب علموں کو پیسہ کے بل پر یا سمجھا بجھا کر طلبہ کو اکسانے کے لئے استعمال کیا تا کہ جمہوری تحریک کے طالب علم ہر اول دستے میں پھوٹ ڈلوائی جائے اور اس کی قوت ختم کر دی جائے...... آج کیمپس ایسے میدان جنگ بن چکے ہیں جہاں مسلح بندوق بردار شکاگو کے بدمعاشوں کے طرح سے علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے یا حال ہی میں رواج پانے والی اصطلاح میں ''چار دخل'' کی جنگ لڑتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے طغیانی ختم ہونے کے بعد دریا میں پیدا ہونے والی ڈیلٹا کی زمین پر قبضہ کرنے کی جنگ لڑی جا رہی ہو۔ ان مسلح طالب علموں کا دفاع حکومت بھی کرتی ہے اور حزب اختلاف بھی۔ تاہم یہ خود عوام کی لوٹ پر گزارا کرتے ہیں۔ اپنی خدمات فروخت کرتے ہیں طاقت کے بل پر اراضی حاصل کرتے ہیں۔ ٹھیکے لیتے ہیں، بھتہ وصول کرتے ہیں اور بالآخر یا ناجائز طریقے سے کام کرنے والے کاروباری افراد کے حصہ دار بن جاتے ہیں۔

''ان طالب علموں کی اکثریت سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے کام نہیں کرتی۔ وہ قرون وسطی کے جنگی سرداروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کی وفاداریاں اپنے آقاؤں کے ساتھ ہوتی ہیں جو انہیں اس لئے تنخواہ دیتے ہیں کہ یہ ان کے سیاسی دبدبہ کو قائم رکھیں۔ آج سو سے زیادہ تعلیمی ادارے ان لوگوں کی باہمی ''گینگ وار'' کی وجہ سے بند پڑے ہیں جس نے درسگاہوں میں زندگی غیر محفوظ بنا دی ہے۔ طالب علم کی شہرت بطور غنڈے کے ہو گئی ہے۔ تعلیمی اداروں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور جمہوریت تحریک بذات خود خطرات میں گھر گئی۔'' (11)

جولائی 1992ء میں پاکستان سپریم کورٹ نے تعلیمی اداروں میں سیاست پر پابندی لگا دی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے ان جرائم پیشہ طالب علم لیڈروں کی کاروائیوں پر کنٹرول کرنا ممکن ہو گا۔ روزنامہ ڈان کا اس فیصلہ پر تحریر کیا گیا ایڈیٹوریل اسی امید کی نشاندہی کرتا تھا۔ اخبار نے لکھا تھا:

''نام نہاد لبرل عناصر خواہ احتجاج ہی کیوں نہ کریں، سپریم کورٹ کی جانب سے تعلیمی اداروں میں سیاست پر پابندی کے اس فیصلے کی عمومی طور پر تائید کی جائے گی۔

پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کو تباہ کرنے میں جن دو عوامل نے کردار کیا ہے ان میں طالب علموں میں موجود انتہائی نقصان دہ قسم کا ایکٹیوازم اور ڈسپلن کا فقدان شامل ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں پیدا ہونے والی صورتحال کے مد نظر تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ جو اکثریت میں ہیں اس بات پر اطمینان کا اظہار کریں گے کہ انہیں سیاسی مقاصد رکھنے والے طلبہ گروپوں اور ان کی غیر ذمہ دار قیادت کے ظلم اور بلیک میلنگ سے نجات مل گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں جاری سیاسی سرگرمی کا ملب یہ نہ تھا کہ مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے آپس میں پرجوش اور متحرک مسابقت کریں اور اس طرح طلبہ کو اپنی طرف کھنچیں۔ اگر ایسا کیا جا رہا ہوتا تو کسی کو بھی تعلیمی اداروں کے اندر تعلیمی عمل میں رکاوٹ ڈالے بغیر بحث مباحثوں کی شکل میں، طلبہ کے تھوڑی سی سیاست میں دلچسپی لینے پر اعتراض نہ ہوتا۔'' (12)

لیکن جیسا کہ رحمان سبحان نے بنگلہ دیش کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔ برسر اقتدار سیاسی جماعت اور حزب اختلاف دونوں کی جانب سے ان عناصر کی حوصلہ افزائی جاری رہی۔ تعلیمی ادارے حسب سابق میدان جنگ بنے رہے اور ان کے ہاسٹل جرائم پیشہ افراد کی آماج گاہ کی شکل اختیار کیے رہے۔ اگلے ہی سال پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد ایم ایس ایف اور اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان میدان کارزار کی شکل اختیار کر گیا۔ جب کالج انتظامیہ کی درخواست پر پولیس نے ہاسٹلوں پر چھاپہ مارا تو اخباری رپورٹوں کے مطابق یہاں سے ایک کلاشنکوف، ایک سٹین گین، ایک سیون ایم ایم رائفل، 18 بندوقیں، شراب کی بوتلیں، فحش فلمیں اور بہت سے مسروقہ موٹر سائیکلیں برآمد ہوئیں۔ اس ضمن میں مستقبل کے 36 ڈاکٹر حراست میں لئے گئے۔ (13)

باب 9

طلبہ اور مذہبی تنظیمیں

پاکستان میں مختلف مذہبی جماعتوں اور فرقہ وارانہ گروہوں نے اپنی اپنی طلبہ تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ اس وقت ان کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔ ان میں سے تین معروف تنظیموں کے پروگرام اور ان کے پچھلے چند سالوں کی کاروائیوں کا مختصر جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔ اس سے اس طرز کی باقی تنظیموں کی سوچ کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان تنظیموں نے جس طرح کی منفی سیاست کو فروغ دیا ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

مذہبی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری
ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے نام پر حریت فکر کی مخالفت
عورتوں اور اقلیتوں کے بارے میں تعصّبات کا فروغ
ثقافتی سرگرمیوں اور فنون لطیفہ کے ارتقا کو روکنا
جمہوری عمل کے ارتقا میں مزاحمت

سرد جنگ کے دوران ان تنظیموں کو امریکہ نے طلبہ کمیونٹی میں سوشلزم کے پھیلاؤ کے آگے بند باندھنے کے لئے استعمال کیا۔ مذہبی جماعتوں نے انہیں طلبہ کے اندر سیکولر جمہوری تحریکیوں کے مقابلے میں مذہبی متبادل کے طور پر پیش کیا۔ ان طلبہ تنظیموں نے تعلیم یافتہ لوگوں میں دیگر مذاہب کے خلاف تعصّبات کو فروغ دیا۔ بلکہ بعض اوقات مسلمانوں میں موجود فرقوں کے درمیان بھی منافرت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نظریہ پاکستان کے نام پر ملک کو ایک بنیاد پرست ریاست بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے غیر مسلم ملکوں کے خلاف پراپیگنڈہ کیا اور ان کے ساتھ اختلافی معاملات کو پر امن طریقہ سے حل کرنے کی بجائے جہاد کے نام پر جنگی جنون کی تبلیغ کی۔ اپنے تنگ نظر فلسفہ کی بناء پر یہ تنظیمیں اکثر و بیشتر آمروں کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہی ہیں۔ ذیل میں ہم ان میں سے اہم تنظیموں کی کارکردگی

کا جائزہ لیں گے۔

اسلامی جمعیت طلبہ (IJT)

قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے جماعت اسلامی نے اپنا علیحدہ طلبہ محاذ قائم کیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے نام سے تشکیل دی جانے والی اس تنظیم کا مقصد تعلیمی اداروں سے جماعت اسلامی کے لئے کارکنوں کی کھیپ حاصل کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جمعیت کے اہداف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اس نے بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کی طرح طلبہ یونینوں کے انتخابات میں حصہ لینا اور ایجی ٹیشن کی سیاست کرنا شروع کر دیا۔

اسلامی جمعیت طلبہ کا قیام 21 دسمبر 1947ء کو لاہور میں عمل میں آیا۔ اس کے پہلے ناظم اعلیٰ ظفر اللہ خان کا خاندان جماعت اسلامی کے ساتھ منسلک تھا۔ باوجود یکہ ظفر اللہ خان 1940ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے جو مسلم سٹوڈنٹس کے عروج کا زمانہ تھا لیکن وہ اس تنظیم سے یا مسلم لیگ کی تحریک سے لاتعلق رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جماعت اسلامی مسلم لیگ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی قیادت کر سکے۔ ظفر اللہ خان کے بقول اس دور کی اسلامی جمعیت طلبہ ایک دعوتی تحریک تھی جس کا مقصد لٹریچر کے مطالعہ اور تربیتی پروگرام کے ذریعے کارکن تیار کرنا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ''طلبہ کی ایک ایسی سوسائٹی تیار کی جائے جو طالب علمی کے دور سے گزرنے کے بعد جب عملی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھے تو قومی زندگی کا کوئی بھی میدان ایسا نہ رہے جہاں اس صالح سوسائٹی کے آدمی نہ ہوں۔''(1)

جمعیت کے دوسرے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد نسیم کے زمانے میں بھی جمعیت یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بجائے صرف کارکنوں کی نظریاتی تربیت پر زور دیتی تھی۔ بقول ڈاکٹر نسیم ''یونین میں ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی نہ تھا۔'' اس کی کل سرگرمیاں ہفتہ وار اجتماع اور اجتماعی طور پر قرآن و حدیث کے مطالعہ تک محدود تھیں۔'' میرا خیال تھا کہ عام حالات میں طلبہ کو قومی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ ان کو حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے، اپنی رائے بنانی چاہیے اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوں تو سیاسی اور معاشرتی پہلو سے اپنی صوابدید کے مطابق جو نہج وہ اختیار کرنا چاہیں

کریں۔'' (2)۔1951-52ء میں خرم جاہ مراد کے ناظم اعلیٰ بننے تک ''جمعیت نے ابھی چلنا شروع کیا تھا۔'' یہ وہ زمانہ تھا جب جمعیت کو پہلی مرتبہ کراچی میں بائیں بازو کا سامنا کرنا پڑا اور اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔'' ڈی ایس ایف بائیں بازو کے عناصر پر مشتمل تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہم سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور منظّم تھے۔ طلبہ اور اساتذہ میں ان کے اثرات تھے۔ ہندوستان ہی سے ان کی جڑیں گہری تھیں...... دوسری جگہوں میں بھی یہ جمعیت سے آگے تھے۔ جمعیت کو ان کے اثرات وخطرات کا شروع میں پورا احساس نہ تھا۔ لیکن کراچی میں طلبہ پر فائرنگ کے واقعہ (جنوری1953) کے بعد یہ کھل کر سامنے آگئے اور جمعیت نے کامیابی سے ان کا مقابلہ کیا۔'' (3)

کراچی کی1953ء کی تحریک پر بائیں بازو کے اثرات نے جمعیت کی سوچ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جمعیت ابھی چھوٹی سی تنظیم تھی جس کے اثرات زیادہ تر پنجاب تک محدود تھے۔ جمعیت کے اس دور کے دو ناظمین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جمعیت میں تحریکیت پہلی مرتبہ اسی دور میں یعنی کراچی کے واقعات کے بعد پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا ہے کہ جمعیت اس سے پہلے '' ایک انجمن یا ایسوسی ایشن قسم کی چیز تھی جس میں کچھ نیک طبع لوگ، نیک سیرت نوجوان جو ایک طرح کا مزاج رکھتے ہوں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔'' (4) بقول حسین خان '' اس زمانے میں اشتراکیت پسند طلبہ تنظیموں نے کراچی کے مختلف کالجز کی یونینوں پر مشتمل انٹر کالجیٹ باڈی بنائی تھی۔ اس کے تحت انہوں نے زبردست ہڑتالیں اور مہمات وغیرہ چلائیں اور اپنی قوت کو منوایا۔ اس وقت یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ اگر ہم کالجوں میں یونین انتخابات میں پوری دلچسپی نہیں لیں گے تو اشتراکیت پسند طلبہ پوری طرح چھا جائیں گے اور پھر انہیں اکھاڑنا بہت مشکل ہو جائے گا۔'' (5) حسین خان کا کہنا ہے کہ جمعیت کو تعلیمی اداروں میں دو طرح کے عناصر سے چیلنج کا سامنا تھا۔ اول اشتراکی ذہن رکھنے والی تنظیمیں اور دوسرے مغربی کلچر سے متاثر لوگ جو زیادہ تر '' ناچ گانے اور لہولعب کی محفلیں، منعقد کراتے تھے اور اس طرح سے طلبہ کا اخلاق بگاڑنے کی کوشش کرتے تھے۔'' (6)

جمعیت میں تحریکیت پیدا ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے ایک طرف قومی و بین

الاقوامی سیاست بارے پبلک میں اپنے موقف کا اظہار کرنا شروع کیا اور دوسری جانب طلبہ یونینوں کے انتخابات میں حصہ لینے کا آغاز کیا۔ جمعیت نے قومی و بین الاقوامی معاملات پر وہی موقف اختیار کیا جو جماعت اسلامی کا تھا۔ یعنی ملک میں اسلامی نظام حکومت کا قیام، بلا سود معیشت کی حمایت، عورتوں کے لئے پردہ، غیر مسلموں کے لئے دوسرے درجہ کے شہری کا مقام، قوم پرستی اور سوشلزم کی مخالفت۔

جماعت اسلامی اور جمعیت کے بین الاقوامی موقف اور امریکی عالمی پالیسی میں بڑی حد تک ہم آہنگی تھی۔ عرب قوم پرست جن کی قیادت مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی۔ مشرق وسطیٰ سے امریکی سیاسی اثرات اور معاشی غلبہ ختم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ جماعت اسلامی کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کی جانب سے عرب قوم پرستی کی مخالفت کو امریکی مفادات کی حمایت قرار دیا گیا۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اخوان المسلمین کے قائدین کو جب تختہ دار پر چڑھایا تو اسلامی جمعیت طلبہ نے ناصر کی مخالفت میں مہم چلائی۔ اسے فرعون مصر کا نام دیا اور قوم پرستی کے فلسفے کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا۔ اسی طرح سرد جنگ کے زمانے میں جیسے جیسے امریکہ کی جانب سے سوشلزم کی مخالفت میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ہی جمعیت نے بھی اپنے تمام تر قوت اس کی مخالفت میں جھونک دی۔

جمعیت نے اول دن سے تعلیمی اداروں میں فنون لطیفہ اور جدید ثقافت کی مخالفت کی۔ اس کی نظر میں تمام فون لطیفہ ماسوائے خطاطی کے لہو و لعب کی ذیل میں آتے ہیں۔ جس کی اسلام میں ممانعت کی گئی ہے۔ جمعیت کے لئے جہاں بھی ممکن ہوا اس نے ثقافتی سرگرمیوں کو طاقت کے زور پر بند کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مودودی نے جمعیت کے 1975ء کے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر جو تقریر کی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جمعیت کی سوچ عہد حاضر کے تقاضوں سے کس حد تک مختلف ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے جدید سائنس، فلسفہ، نظام معیشت، اور سیاست ہر ایک کو رد کیا ہے۔ جدید سائنس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس نے ''جتنا انسان کی بھلائی کے لئے کام کیا ہے اس سے بہت زیادہ اس کی خرابی اور اس کی تباہی کا کام کیا ہے۔'' (7) ان کی نظر میں ڈارون کے نظریہ ارتقا نے

اہل مغرب کا اخلاق تباہ کر دیا ہے۔'' اب جو انسان اپنے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ میرے باپ داد بندر یا گوریلے تھے اور آج ارتقا کی بدولت میں انسانیت کے مقام پر پہنچا ہوں، وہ لا محالہ اپنی زندگی کا پروگرام جانوروں ہی کی زندگی میں تلاش کرے گا...... اپنے آپ کو جانور سمجھنے والے بالکل جانوروں کی طرح سے علی الاعلان جنسی اختلاط کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک مرد و عورت کے تعلق میں حلال و حرام کے امتیاز کی کوئی وجہ نہیں۔ مرد بیٹا ہو اور عورت ماں، خواہ مرد بھائی ہو اور عورت بہن، خواہ مرد باپ ہو اور عورت بیٹی، بہن اور بھائی، چچا اور بھتیجی، ماموں اور بھانجی کے جنسی تعلقات تو اب اس معاشرے میں بڑی کثرت سے رائج ہو رہے ہیں۔'' بقول مولانا ''اتنی ذلیل سطح تک انسان کو گرا دیا گیا ہے جس کا تصور کرنا کسی شریف آدمی کے لئے ممکن نہ تھا اور افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اب وہ لوگ سر اٹھا رہے ہیں جو اس ناپاک تہذیب کو یہاں درآمد کرنا چاہتے ہیں...... اگر اس رفتار کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی اور اس الاقی تصور کو بدلا نہ گیا تو کچھ بعید نہیں کہ آپ اپنی آنکھوں سے اس ملک میں بھی حیوان صفت لوگوں کو وہی حرکتیں کرتے دیکھ لیں جو یورپ اور امریکہ میں آج ہو رہی ہیں۔''(8) مولانا مودودی کے ان تصورات کا اثر یہ ہوا کہ جمعیت نے اپنے زیر اثر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ اور طالبات کے آپس میں میل جول حتیٰ کہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے تک پر پابندی لگا دی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو برسر عام زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔

مولانا نے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ مغربی جمہوریت دراصل آمریت ہی کا ایک بھیس ہے۔'' یہ حقیقت میں فرعون اور نمرود کے دور کی طرف واپسی ہے۔ البتہ اس دور جدید کی ترقی یہ ہے۔ کہ آج کے جمہوری صدر یا وزیراعظم یا قائدعوام آمریت کے جو ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں وہ کسی فرعون اور نمرود کے خیال و خواب میں بھی نہ آئے۔'' (9) ظاہر ہے کہ جن طلبہ کی ذہنی پرورش مولانا کے اس قسم کے ارشادات سے ہوئی ہو ان کے لئے ضیاء کی آمریت سے مصالحت کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔

سوشلزم کی مخالفت اور ثقافی سرگرمیوں پر پابندی جمعیت کے پروگرام کا اس وقت سے بنیادی نقطہ ہے۔ جب سے اس نے طلبہ کی انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا

ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے شروع کا ذکر کرتے ہوئے جمعیت کے اس دور کے ناظم اعلیٰ سید منور حسن لکھتے ہیں'' اس وقت ہر کالج میں عموماً ایک سالانہ فنکشن ہوتا تھا۔ یونین کے سال بھر کے کام کا محور یہی فنکشن تھا۔ اس میں رقص و موسیقی پروگرام کا لازمی حصہ ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح ڈرامے اور فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ ہم نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ احتجاج اور مظاہرے کے طریقے سے بھی اور یونین کے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے بھی۔ بہت سی جگہوں میں ہنگامے بھی ہوئے۔ تاہم رفتہ رفتہ ہم ان غیر اخلاقی گرمیوں کو بند کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ''(10)

1958ء تک کراچی کے چند ایک کالجوں میں جمعیت کے پینل انتخاب جیتنا شروع ہو گئے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کراچی کی آئی سی بی جو بائیں بازو کے اثر میں ہوا کرتی تھی۔ جمعیت کے کنٹرول میں چلی گئی۔ ایوب خان کا مارشل لاء لگنے کے بعد طلبہ تنظیموں پر پابندی لگا گئیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان جمعیت کو ہوا۔ کیونکہ بائیں بازو کے برعکس اس کے پاس اس وقت تک زیر زمین کام کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ 1962ء میں طلبہ تنظیموں کی بحالی کے بعد جب اس نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا تو دیر تک اس کی پوزیشن کمزور رہی۔ بقول سید منور حسن'' جو مخالف نظریاتی تنظیمیں تھیں جمعیت پر پابندی کا یہ عرصہ ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا ان کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ سیاسی شخصیتوں سے ان کے مضبوط روابط تھے۔ اور یہ مسلسل فیلڈ میں کام کرتی رہیں اور زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ جمعیت کا بحیثیت مجموعی ایسا امیج نہ بن سکا کہ وہ طالبہ پر اپنی دسترس رکھتی اور طلبہ کی ایک مقبول پارٹی کی حیثیت سے متعارف اور معروف ہوا۔ اس لئے کہ انتخابات میں بھی جمعیت کو بہت نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ پھر اجتماعی سیاست میں بائیں بازو کی تنظیمیں ہی نمایا تھیں اور ان کے افراد جیلیں کاٹنے پر اور سختیاں جھیلنے کے باعث معروف ہوئے تھے اور ان کی اک مصنوعی لیڈر شپ ان کے ساتھ (11)

طلبہ تنظیموں پر پابندی اٹھنے کے بعد جمعیت نے پورے ملک میں اپنی سرگرمیوں شروع کر دیں۔ مختصر عرصے کے لئے اس نے بلوچستان، سرحد اور اندرون سندھ کے بعض تعلیمی اداروں میں بھی وینٹ قائم کیے لیکن کراچی شہر کو چھوڑ کر اسے ان تین صوبوں کی منی

راس نہ آئی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود 1967ء تک جمعیت سارے صوبہ سرحد میں قاضی حسین احمد سمیت صرف تین چار ارکان ہی پیدا کرسکی۔ البتہ کراچی اور پنجاب کے کئی تعلیمی اداروں میں جمعیت کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان مقامات پر جماعت اسلامی کی شکل میں ایک مختصر مگر منظّم اور با وسائل پارٹی اس کی پشت پر موجود تھی جو جمعیت کو اپنی سب سے قیمتی سیاسی متاع تصور کرتے ہوئے اسے طلبہ یونینوں کے انتخابات جتوانے کے لئے اپنی تمام افرادی قوت اور مالی وسائل استعمال کرنے کے لئے تیار تھی۔ بلوچستان، سندھ اور سرحد میں جماعت کی کمزوری جمعیت کی بے بضاعتی میں منعکس ہوتی تھی۔ جمعیت کو دیر تک ان صوبوں سے کارکنوں کی کوئی بڑی کھیپ دستیاب نہ ہوئی۔ اس کا ایک اظہار جمعیت کی قیادت کے مخصوص لسانی پس منظر میں بھی ہوتا ہے۔ جمعیت کے قائدین کی بہت بڑی اکثریت اردو بولنے والے مہاجروں پر مشتمل رہی ہے۔ یہ بات بلاوجہ نہیں کہ اس کے پہلے 13 ناظمین اعلیٰ میں سے کوئی بھی سندھی یا بلوچ نہ تھا۔ پنجابی بولنے والا صرف ایک تھا۔ دو پٹھان اور ایک بنگالی تھے۔ باقی نو اردو بولنے والے مہاجر تھے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی اور جمعیت دونوں کا اثر و رسوخ زیادہ تر پنجاب اور کراچی ہی میں رہا ہے۔

سرد جنگ کے دوران چونکہ امریکہ سوشلزم کی مخالفت کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے وہ ایسی تمام تنظیموں کی دامے درمے سخنے امداد کرنے کو تیار تھا جو اس کام میں اس کی مدد کرسکیں۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا ایک حصہ جو امریکہ کے زیر اثر تھا جماعت اسلامی کی سرپرستی کرتا رہا۔ بھٹو دور کے آخر تک یہ سرپرستی در پردہ انداز میں جاری رہی۔ تاہم جمعیت کی کھلی اعانت ضیا دور میں شروع ہوئی۔

جمعیت نے احتجاجی سیاست بائیں بازو کی تنظیموں کی دیکھا دیکھی اور ان کی ضد میں اپنے قیام کے کئی سال بعد شروع کی تھی۔ اس نے اپنی تنظیمی زندگی کا پہلا جلوس حیدر آباد میں سالانہ اجتماع کے موقعہ پر 1968ء میں نکالا تھا۔ طلبہ کو اپنے موقف کے بارے میں دلیل سے مطمئن کرنا جمعیت کے سٹائل کا حصہ نہ تھا۔ جماعت اسلامی کی طرح جمعیت نے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ عوام سے بلند اور خدا کی طرف سے منتخب کئے گئے صالحین کا ایک

گروہ تصور کیا ہے جس کا کام ان تمام باتوں کو جنہیں وہ خدائی احکامات تصور کرتی ہے۔ طلبہ تک پہنچانا اور انہیں تسلیم کرنے سے انکار کرنے والوں پر قوت کے بل پر نافذ کرنا ہے۔ وہ تمام چیزیں جو اس کی نظر میں منکرات یعنی اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں انہیں قوت بازو سے ختم کرنا ہی قوت ایمانی کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ چنانچہ تعلیمی اداروں میں اپنی بات منوانے اور مخالفوں کا قلع قمع کرنے کے لئے طاقت کا استعمال جمعیت کی نظر میں اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ جمعیت کی نظر میں کسی بھی اسلامی ملک میں اس قسم کے پلورل ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں جسے دور حاضر میں جمہوریت کا حصہ تصور کیا جاتا ہے اور جس میں مختلف نظریات اور سیاسی پروگرام رکھنے والی تنظیموں کو اپنی سرگرمیاں پرامن طریقے سے جاری رکھنے، ہر ایک شخص تک اپنا موقف پہنچانے اور اسے اپنے نقطہ نظر پر قائل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ جس طرح سے جماعت اسلامی کی نظر میں مرتد کی سزا موت ہے اسی طرح سے جمعیت کی نظر میں غیر اسلامی تصورات اختیار کرنے والے جن میں سوشلسٹ اور مغربی کلچر کے دلدادہ سبھی شامل ہیں برداشت نہیں کئے جاسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جمعیت نے بھٹو دور کے آخر میں اور ضیا مارشل لا کے سارے عرصے میں اسلحہ سے لیس ہو کر جذبہ ایمانی کے ساتھ دوسری تنظیموں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور تعلیمی اداروں کے امن و امان کو تہس نہس کر دیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے مختلف اوقات پر جو مسائل احتجاج کے لئے منتخب کئے وہ یہ تھے:

خواتین یونیورسٹی کا قیام

احمدیوں کو اقلیت دینے کا مطالبہ

بنگلہ دیش کو حکومتی سطح پر تسلیم کرنے کی مخالفت

تعلیمی اداروں میں یونینوں پر پابندی کی مخالفت

پاک بھارت تعلقات بہتر کرنے کی کوششوں کی مخالفت

اس کے برعکس وہ مسائل جنہیں عوام اور طلبہ اپنی زندگی میں بہت اہمیت دیتے ہیں جمعیت کے لئے دلچسپی کا سبب نہ بن سکے۔ امریکی سامراج کے خلاف اور ناصر کی حمایت میں یا بعد میں الفتح کی حمایت میں نکلنے والے مظاہروں کی اس نے مذمت کی۔

جمعیت نے یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دوران مشرقی پاکستان میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف ایک حرف تک نہ کہا بلکہ اس کی مشرقی پاکستان کی شاخ نے فوجی ایکشن کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس دوران ہونے والی مظالم سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود خاموشی سے ان کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ تعاون کیا۔ اسی طرح سے اس نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کو وش آمدید کہا اور اس کا طویل عرصے تک ساتھ دیا۔ تعلیمی اداروں میں تشدد کا استعمال جمعیت نے شروع کیا نیز جدید اسلحہ کو بھی یہی تنظیم پہلی مرتبہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لے آئی۔

امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن(ISO)

ایرانی انقلاب سے پہلے اور رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایرانی حکومت امریکی اثرات کے تابع تھی ور امریکہ شہنشاہ کو خلیج کے علاقے میں امریکی مفادات کا محافظ بنانے کا خواہش مند تھا۔ امریکی سی آئی اے ایران کے اردگرد کے مما لک سے جن میں پاکستان بھی شامل تھا۔ کمیونسٹ اثرات ختم کرنے کے درپے تھی۔ اور اس کا ایک بڑا مرکز ایران میں اس کام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل تھا۔ ایران چونکہ پاکستان میں موجود شیعہ فرقے کے ماننے والوں کی عقیدت کا منبع تھا اس لئے شہنشاہ ایران کو پاکستان کے شیعہ انتہائی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایرانی بادشاہت کے نشان شیر و خورشید اکثر شیعہ گھرانوں میں سجائے ہوئے نظر آئے تھے۔ سی آئی اے اس حوالے کو بھی کمیونزم کی مخالفت میں استعمال کرنے کے درپے تھی۔ شاہ ایران جو خود ایران میں کمیونسٹ عناصر اور جمہوریت پسندوں کے خلاف جنگ آزما تھا، پاکستان کی شیعہ کمیونٹی میں بھی ان کے اثرات ختم کرنے کا خواہشمند تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب 1972ء میں امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن وجود میں آئی تو اس کا مقصد بھی شیعہ کمیونٹی کے نوجوانوں میں جمہوری، سیکولر اور اشتراکی نظریات کا پھیلاؤ روکنا تھا۔

امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی تخلیق کے بارے میں ارشاد حسن ناصر کا کہنا ہے کہ ''1972ء میں جب اشتراکی نظریات کالجز اور یونیورسٹیوں کے طلبہ پر غالب آنے لگے جس کے نتیجہ میں اسلامی فکر و تشخص اور پاکستان کے اساسی نظریات موہوم ہونے لگے تو

انجینئرنگ یونیورسٹی اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے باعلم اور باتقویٰ نوجوانوں نے اس محدود حلقے میں نوجوانوں کی اسلامی تربیت اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔''(12)

آئی ایس او کا مرکزی کنونشن ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مرکزی صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس تنظیم کے ہمدردوں کا کہنا ہے کہ یہ کسی سیاسی جماعت کی تخلیق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ پاکستان میں شیعوں کی سیاسی تنظیم تحریک جعفریہ سے کئی سال پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ آئی ایس او میں چھٹی سے لے کر دسویں جماعت کے طلبہ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ایک ماہ کے لئے کارکنوں کی ورکشاپ کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ جس میں اندرون و بیرون ملک سے علماء اور دانشور اسلام کے مسائل اور امت مسلمہ کو درپیش چیلنج کے بارے میں لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ آئی ایس او ایک ماہنامہ العارف کے نام سے نکالتی ہے اس کی سرگرمیوں میں غریب شیعہ طلبہ کی مالی اعانت کرنا بھی شامل ہے۔ 1998ء کے مالی سال میں تنظیم نے اس ضمن میں 20 لاکھ روپے کی خطیر رقم خرچ کی۔ (13)

شروع کے دور میں ISO کا کام شیعہ طلبہ میں وہی فریضہ سرانجام دینا تھا جس کا بیڑہ اسلامی جمعیت طلبہ نے بھی اٹھایا ہوا تھا۔ یعنی اشتراکی نظریات کی مالفت۔ یہ صورتحال انقلاب ایران کے بعد تک برقرار رہی۔ شہنشاہ ایران کا تختہ الٹائے جانے کے بعد آیت اللہ خمینی کی جو حکومت برسراقتدار آئی اس نے کمیونسٹوں کو جو شاہ کے خلاف جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے مکمل طور پر کچل دیا۔ تاہم جلد ہی خمینی کو اندازہ ہوا کہ اصل دشمن امریکہ ہے نہ کہ روس۔ تاہم روس کے خلاف ایرانی علماء اتنا پراپیگنڈہ کر چکے تھے۔ کہ اس سے مکمل طور صرف نظر کرنا ممکن نہ تھا۔ اس صورتحال سے نکلنے کے لئے آیت اللہ خمینی نے امریکہ کے لئے شیطان اول کی اصطلاح وضع کی جس کے بعد روس سے جسے شیطان دوم قرار دیا گیا رفتہ رفتہ ایرانی علماء کی توجہ ہٹ گئی۔

ایرانی انقلاب کے بعد پاکستان کی شیعہ کمیونٹی کی توجہ کا مرکز آیت اللہ خمینی کی ذات بن گئی۔ شیعہ گھروں میں شیر و خورشید کے نشان کی جگہ اللہ کے اس مخصوص نشان نے لے لی جو انقلاب حکومت کا سرکاری نشان تھا۔ جس طرح انقلاب ایران سے پہلے کمیونزم

اور سوشلسٹ ملکوں کی مخالفت ISO کا جزو ایمان تھی تو اب وہی پوزیشن امریکہ کی مخالفت نے حاصل کر لی۔ کمیونزم دشمنی ختم تو نہ ہوئی لیکن پس منظر میں چلی گئی۔ عراق ایران جنگ کے دوران امریکہ مخالف جذبات شیعہ کمیونٹی اور اس کی طلبہ تنظیم امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں عروج پر پہنچ گئے۔ یہ تصور عام تھا کہ امریکہ عراق کی حکومت کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اس دوران پاکستان بھر میں اس تنظیم نے بھرپور انداز میں امریکی سامراج کو تنقید کا حوالہ بنایا۔ امریکہ کے خلاف مظاہرے کئے گئے اور لاہور میں امریکی سنٹر پر حملہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عراق کی حکومت بھی شیعہ کمیونٹی کی مخالفت کا ہدف بنی اور خلیج کی ریاستیں بھی جو اسے مالی امداد فراہم کر رہی تھیں۔ ان سارے واقعات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ISO جو اپنی تخلیق کے وقت ایک قدامت پسند تنظیم تھی ایک جنگجو امریکہ مخالف، ملوکیت مخالف تنظیم میں تبدیل ہو گئی۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک اور تبدیلی وجود میں آئی۔ عراقی حکومت نے جوابی کاروائی کے طور پر پاکستان میں فرقہ وارانہ عناصر کو شہ دینا شروع کر دیا۔ تا کہ شیعہ کمیونٹی کو جو ایران کی مکمل حمایت کر رہی تھی فرقہ وارانہ جنگ میں الجھا دیا جائے۔ بعد میں اس کاروائی میں خلیج کی بعض اور حکومتیں بھی شامل ہو گئیں۔ جو بوجوہ ایرانی انقلاب سے خوفزدہ تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کو فروغ دینے میں جس کا مقصد ایران کو تنہا کرنا تھا امریکی سی آئی اے کا بھی ہاتھ ہو۔ اس طرح سے جو جنگ خلیج میں جاری تھی آئی ایس او اور اس کے مخالفین اسے پاکستان میں لے آئے۔

ISO جو پاکستان کی شیعہ کمیونٹی میں کمیونسٹ اثرات روکنے کے لئے وجود میں آئی تھی، پہلے ایک پرعزم اور متحرک امریکہ مخالف اور ملوکیت دشمن تنظیم میں تبدیل ہوئی اور پھر حالات کے جبر کے تحت ایک فرقہ وارانہ تنظیم کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ دہشت گردی میں آئی ایس او کے کئی کارکن اور قائدین بھی مارے گئے۔ اسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے آئی ایس او کے ایک لیڈر نے کہا ”فرقہ واریت نے ہماری تبلیغ کے کام کو روک دیا۔ ہمارے نوجوانوں نے انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا۔ اللہ کرے حالات جلد ٹھیک ہو جائیں تا کہ نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرانے کا کام دوبارہ شروع ہو

سکے۔''(14)

لیکن حالات ٹھیک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس کام کو آئی ایس او والے اسلامی تعلیمات کہتے تھے ان کے مخالف فرقہ پرست انہی کو اسلام مخالف تعلیمات کا نام دیتے تھے۔

ISO شیعہ طلبہ کی تنظیم ہے۔ اس کی رکنیت کے دروازے سنی طلبہ کے لئے بند ہیں۔ اس کی سرگرمیوں میں اپنے مخصوص فرقہ کی مذہبی تقریبات کا انعقاد کرنا بھی شامل ہے۔ وہ یہ تقریبات تعلیمی اداروں میں بھی منعقد کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ ان تقریبات میں مجالس بھی شامل ہیں۔ چنانچہ جب اس نے 1994ء میں فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں محرم کے اوائل میں یوم حسین منانے کی درخواست دی تو مخالف فرقہ کی ایک تنظیم نے یونیورسٹی انتظامیہ سے ناموس صحابہ کے لئے جلسہ منعقد کرنے کی اجازت مانگ لی۔ پہلے فیصلہ آباد میں دونوں میں لڑائی ہوئی جس میں کئی طلبہ زخمی ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے جب دونوں تنظیموں کو جلسہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو ISO نے اپنی تقریب یونیورسٹی کے علاقے سے تھوڑا باہر منعقد کرنے کی کوشش کی۔ فریقہ مخالف کے روکنے پر جو لڑائی ہوئی اس میں گیارہ افراد زخمی ہوئے اور تین مارے گئے۔ مرنے والوں کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ سے تھا۔ اگلے دن جمعیت کے ناظم اعلیٰ نے پریس کانفرنس میں کہا:

''علما اور عام شہریوں کے قتل عام کے بعد اب فرقہ وارانہ دہشت گردی کرنے والے معصوم طلبہ کی جانوں سے کھیلنے کے درپے ہیں۔ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ نام نہاد طالب علم تنظیم آئی ایس او اس دہشت گردی کی لہر میں شامل ہوگئی ہے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران بہت سے علما اور بے گناہ شہری شہر کے مختلف حصوں میں قتل کئے گئے ہیں۔ جبکہ قاتلوں کا تعلق ISO سے تھا۔''(15)

آئی ایس او پر ایرانی اثرات واضح ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا کہنا ہے کہ یہ دنیا بر کی مجاہد تنظیموں سے تعاون کرتی ہے۔ یہاں پھر فرقہ واریت موجود ہے۔ مجاہد تنظیموں سے مراد وہ تنظیمیں ہیں جو ایرانی حکومت کے زیر اثر ہیں۔ یعنی حزب اللہ مجاہد تنظیم ہے مگر طالبان مجاہد تنظیم نہیں۔ اسی طرح سے آئی ایس او کے مرکزی کنونشن میں بعض اوقات ایرانی وفد بھی

شرکت کرتے ہیں۔

انجمن طلبہ اسلام(ATI)

انجمن طلبہ اسلام بھی آئی ایس او کی طرح کی فرقہ وارانہ طلبہ تنظیم ہے۔ یہ تنظیم جمعیت علمائے پاکستان (نورانی) کا طلبہ محاذ ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے لئے جمعیت علمائے پاکستان(JUP) کو سمجھنا ضروری ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان سنی مسلمانوں کے بریلوی فرقہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ جے یو پی وجود میں تو1948ء میں آ گئی تھی لیکن اس نے1970ء کے بعد ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ایوب خان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے یہ مسلم لیگ کی حمایت کرتی تھی۔ اس کی دلچسپیاں صرف مذہبی امور اور وہ بھی اس کے مخصوص عقائد کے پھیلاؤ تک محدود تھیں۔ اس سے پہلے اگر اس نے کبھی کوئی سیاسی مطالبہ کیا بھی تو وہ مذہبی امور کی علیحدہ وزارت کے قیام اور اسلامی نظام کے نفاذ تک محدود ہوتا تھا۔ مذہبی امور کی علیحدہ وزارت کے مطالبہ کا مقصد مساجد اور اولیاء اللہ کے مزاروں کی بہتر دیکھ بھال تھا بریلوی فرقہ مزاروں کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس کے خیال میں پیروں فقیروں کو ماننا اور ان کے مقبروں پر چڑھاوے چڑھانا اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ بریلوی علماء کا یہیں سے جھگڑا اہل حدیث فرقہ یا وہابیوں سے شروع ہوتا ہے جو ان تمام کاروائیوں کو بدعت اور شرک قرار دے کر ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

ایوب مارشل لاء کے خلاف جمعیت علمائے پاکستان نے کبھی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ نہ اس نے ماشل لاء کے دوران ہونے والی شہری حقوق کی خلاف ورزیوں کا کوئی نوٹس لیا۔ اس نے اس دور میں بے روزگاری یا مہنگائی پر بھی کسی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ ایوب کی حمایت کے لئے ان کی نظر میں یہ بات کافی تھی کہ وہ ملک کے معروف روحانی پیوشا پیر صاحب دیول شریف کا ارادت مند تھا۔ اور مشرقی پاکستان میں پیر صاحب سرسینہ شریف کے آستانے پر حاضری دیتا تھا۔ اس دور میں جمعیت کی زیادہ تر دلچسپی حکمرانوں کے مذہبی عقیدہ میں ہوتی تھی اور ان کی سیاست میں کم۔ جمعیت کا اس لحاظ سے ایوب حکومت سے تعلق بھی تھا کہ اس کے مرکزی صدر مولانا عبدالحامد بدایونی کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کے رکن تھے۔ اور سرکاری خزانے سے تنخواہ پاتے تھے۔ اس دور میں ایوب خان کے ساتھ

اچھے تعلقات کا ایک فائدہ جے یو پی نے یہ اٹھایا کہ اس نے سرکاری مساجد پر بریلوی فرقہ کا کنٹرول مستحکم کرلیا۔

ایوب خان سے مختلف فوائد حاصل کرنے کی قیمت بھی جے یوی کو چکانا پڑی۔ 1965ء کے انتخابات کے موقعہ پر اس نے ایوب خان کی حمایت کا اعلان کیا۔ پارٹی کی دلیل یہ تھی کہ محترمہ فاطمہ جناح خاتون ہونے کے ناطے ایک مسلمان ملک کی سربراہ نہیں ہو سکتیں۔ انتخابات میں ایوب کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جے یو پی نے لاہور میں ایک کل پاکستان سنی کانفرنس منعقد کی۔ یہاں پر 650علماء کی جانب سے معروف بریلوی عالم دین مولانا ابوالبرکات سید احمد کے اس فتوے کی توثیق کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ کسی بھی عورت کو ملکی صدارت سونپنا اسلام کی نظر میں ایک حرام فعل ہے۔ جمعیت المشائخ نے بھی جو جے یو پی کے زیر اثر تھی انتخابات کے موقعہ پر ایوب خان کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ (16)

ایوب کے آری زمانے میں کہیں جا کر جے یو پی کی آنکھیں کھلیں اور اس نے حکومت مخالف پارٹیوں سے اتحاد کی بات چیت شروع کی۔ 1970ء کے انتخابات میں اس نے چند ایک امیدوار بھی کھڑے کئے۔ ان میں علماء اور گدی نشین بھی تھے اور رفیق سہگل جیسا معروف صنعتکار بھی۔ پارٹی کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی سے انتخاب جیتا۔

جے یو پی کی سوچ میں جو تنگ نظری اور فرقہ واریت موجود تھی وہی اے ٹی آئی میں منعکس ہوئی۔ اے ٹی آئی کے پاس کوئی سیاسی، معاشی یا معاشرتی اصلاح کا پروگرام نہیں تھا۔ نہ بین الاقوامی معاملات کے بارے میں اس کے پاس کوئی واضح پالیسی تھی۔ اس کے باوجود یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسی جماعت جو دم درود، نذر نیاز اور اولیاء کی کرامات کے تذکرہ سے آگے کوئی سوچ نہیں رکھتی تھی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یونٹ قائم کرنے لگی اور بعض اوقات طلبہ یونینوں کے انتخابات میں بھی حصہ لینے لگی۔ اے ٹی آئی کی فکری تنگ دامانی کا اندازہ اس کے پروگرام سے ہوتا ہے جس کی وضاحت اس کے ایک ہمدرد نے یوں کی ہے۔ ''اے ٹی آئی کے قیام سے قبل درسگاہوں میں تلاوت قرآن کے بعد نعت

حضورﷺ پر نور کا رواج نہ تھا۔ اسلام کے نام پر طلبہ تنظیمیں تو موجود تھیں مگر ان کے لٹریچر میں حب رسول کا لفظ تک موجود نہ تھا۔ نصابی کتب صوفیائے کرام کی خدمات سے تہی دامن اور تاریخ پاکستان اولیائے کرام کے روشن کارناموں سے خالی تھی۔ نظام مصطفیٰ کے قیام کا عزم، عشق رسول کا فروغ ، مقام مصطفیٰ کا تحفظ، صحابہ کرام اور اہل بیت اظہار کی عظمت، اولیائے کرام، صوفیے عظام اور علمائے حق اہل سنت سے عقید و محبت کے جذبات اے ٹی آئی کا سامان سفر ہیں۔"(17)

اے ٹی آئی کی طرح کی تنگ نظر تنظیموں کا تعلیمی اداروں میں قیام دراصل اس فرقہ وارانہ سوچ کے فروغ کا نتیجہ تھا جس کو عام کرنے میں ضیاء الحق کی پالیسیوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ جے یو پی کی طرح اے ٹی آئی کو بھی حکومتوں کی پالیسیوں سے غرض نہ تھی۔ ظالم سے ظالم حکمران بھی اگر ان کے مخصوص عقائد کا حامی ہوتا تو وہ اس کی حمایت کے لئے تیار تھے۔

انجمن طلبہ اسلام 19 جنوری 1968ء میں کراچی میں قائم ہوئی۔ اس کا پہلا صدر حاجی محمد حنیف طیب کو مقرر کیا گیا۔ یہ دراصل نتیجہ تھی دو ہم خیال جماعتوں یعنی انجمن محبان اسلام (قیام1962) اور جمعیت طلبہ اہل سنت و جماعت (قیام1966) کے باہمی ادغام کا اے ٹی آئی کے قیام کا جو مقصد بیان کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسلام کی اصلی روحانی تعلیمات کا تحفظ کیا جائے اور اس اجارہ داری کو توڑا جائے جو اسلام کے نام پر بعض دائیں بازو کی طالب علم تنظیموں نے حاصل کی ہوئی ہے۔ (18) بالفظ دیگر اے ٹی آئی کا قیام اسلامی جمعیت طلبہ قسم کی جماعتوں کے خلاف تھا جو اے ٹی آئی کے قائم کرنے والوں کی نظر میں بدعقیدہ لوگوں کی تنظیمیں تھیں۔ اے ٹی آئی چونکہ ایک سیاسی پارٹی کا بازو تھی اس لئے جہاں جہاں اس کی مادر پارٹی موجود تھی۔ وہاں اس کی شاخیں بھی جلد ہی قائم ہوگئیں۔ 1959ء تک سندھ اور پنجاب کے 26 شہروں میں اس نے یونٹ قائم کر لئے۔ سرحد اور بلوچستان میں چونکہ دیو بندی مضبوط تھے اس لئے اسے وہاں کام پھیلانے میں دقت ہوئی۔ 1970ء کے انتخابات میں اس نے جے یو پی کے امیدواروں کے حق میں کام کیا۔

اے ٹی آئی کا جنم ملک میں شدید سیاسی ہلچل کے دوران ہوا تھا۔ 1968ء کا

سال ایوب خان کے خلاف طالب علم تحریک کے آغاز کا سال تھا۔ تاہم یہ بات دلچسپ ہے کہ اے ٹی آئی اس ساری جدوجہد سے لاتعلق رہی۔ اگلے چند سالوں میں اے ٹی آئی نے اپنی مخصوص فرقہ وارانہ سوچ کے باوجود مختلف ملکی مسائل پر دائیں بازو کی دوسری طلبہ تنظیموں کے ساتھ ہم آہنگ نقطہ نظر اختیار کیا۔ چار مسائل جن پر اس کا باقیوں سے اتفاق تھا مندرجہ ذیل تھے:

-1 پہلے اے ٹی آئی نے جنگی قیدیوں کی رہائی کا ہفتہ منایا جس کا مقصد نہ صرف ان خاندانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔ جن کے افراد بھارت کی قید میں تھے۔ بلکہ بھٹو حکومت کو بھی ان کی مسلسل اسیری کے لئے موردالزام قرار دینا تھا۔ جب حکومت نے ان قیدیوں کی رہائی کے لئے بھارت اور بنگلہ دیش کی طرف سے پیش کردہ تجویز یعنی بنگلہ دیش کی منظوری پر غور کرنا شروع کیا تو اسلامی جمعیت طلبہ کی طرح اے ٹی آئی بھی بنگلہ دیش نامنظور کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بھٹو کے خلاف میدان میں آ گئی۔

-2 اسلامی جمعیت طلبہ کی طرح اے ٹی آئی بھی احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پیش کرنے میں آگے آگے تھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے احمدیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے ملک بھر میں1,370 میٹنگیں منعقد کیں۔ (19) اور اس کے کئی کارکن گرفتار ہوئے۔

-3 اے ٹی آئی اسلامی نظام تعلیم کی بھی حامی ہے گو اس کے خدوخال واضح کرنے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ 1976ء میں اس نے ہفتہ اسلامی تعلیمی نظام منایا۔

-4 بھٹو کے خلاف چلنے والی نام نہاد تحریک نظام مصطفیٰ میں بھی اے ٹی آئی شریک تھی۔ یہ اس دوران وجود میں آنے والے دائیں بازو کی سات تنظیموں کے اتحاد کا حصہ تھی۔

اے ٹی آئی نے سلمان رشدی کے خلاف بھی جلوس نکالے اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد بھارت کی مخالفت میں بھی۔ افغانستان میں خانہ جنگی کے دوران اے ٹی آئی

کا تعلق صبغت اللہ مجددی سے رہا۔ کشمیر میں جہاد کی غرض سے اس نے المصطفی لبریشن فائٹرز کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی۔ تاہم افغانستان ہو یا کشمیر اس نے دونوں جگہوں پر کوئی اہم رول ادا نہیں کیا۔

جس طرح سے جے یو پی ایوب خان کی حمایت کرتی تھی اسی طرح سے اے ٹی آئی نے ضیا مارشل لا کی حمایت بھی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ضیا اسلامی سزائیں بھی نافذ کر رہا تھا اور نعتیں بھی پڑھوا رہا تھا۔ مارشل لاء اور اے ٹی آئی کے درمیان موجود مفاہمت کے نتیجے میں اے ٹی آئی کے پہلے صدر حاجی محمد حنیف طیب کو 1985ء میں لیبر افرادی قوت، بیرون ملک پاکستانیوں کے امور اور ہاؤسنگ و ورکس کا مرکزی وزیر مقرر کیا گیا۔ اے ٹی آئی کے دو دیگر صدور جو قومی اسمبلی کے رکن بنے عثمان خان نوری اور حافظ محمد تقی ہیں۔

حرف آخر

جنوبی ایشیا میں طالب علم تحریک کا سیاسی ابھار کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ یہ سیاسی ابھار اس سٹیج پر پیدا ہوئے جب عوام کو ایسے مسائل درپیش تھے جو ایک جانب انہیں انتہائی اہم محسوس ہوتے تھے تو دوسری جانب انہیں یقین ہو چکا تھا کہ ان کے حل کرانے کے لئے جدوجہد اور قربانی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ تقسیم ہند سے قبل سب سے بڑا مسئلہ بدیسی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک ایک خاص دور تک متحد رہی۔ بعد میں ان وجوہات کی بناء پر جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے یہ دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ وہ لوگ جو ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے کانگریس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ دوسروں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ ہندوستانی قومیت کے علمبردار بھی جرمنی کے سوویت یونین پر حملے کے بعد نظریاتی بنیاد پر منقسم ہو گئے۔

آزادی ہند اور تقسیم ہند کے لئے چلنے والی تحریکوں کا تعلق عوام کے حقیقی مسائل سے تھا۔ ان تحریکوں نے طالب علموں میں ایک نئی روح پھونکی اور ان میں موجود حساس اور ذہین افراد کو ملکی سیاست کے دھارے میں شامل کر دیا۔ ان میں سے کئی نوجوان اپنی جان کی قربانی دے کر امر ہو گئے۔ بہت سے ایسے تھے جن کی سوچ پر ان تحریک نے انمٹ نقوش مرتب کئے اور وہ آزادی کے بعد تمام عمر اعلیٰ آدرشوں کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پر جوش کارکن جو قیام پاکستان کے بعد جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے سربکف رہے ان میں سرفہرست مظہر علی خان اور سوبھوگیان چندانی کا نام ہے۔ اول الذکر فیڈریشن کی پنجاب شاخ کے رہنما تھے اور سوبھو کراچی میں اس کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ مظہر علی خان نے صحافت کے میدان میں آخر دم تک جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے لڑائی لڑی۔ سوبھو نے یہی جنگ انقلابی سیاسی اور ٹریڈ یونین تحریک

کے حوالے سے لڑی۔

قیام پاکستان کے بعد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جو لیڈر صحافتی میدان میں آمریت اور فرقہ واریت کے رجحانات کے خلاف جنگ آزما رہے ان میں حمید نظامی کا نام قابل ذکر ہے۔1953ء میں ختم نبوت کے نام پر مذہب کو جس طرح سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس کی مخالفت میں حمید نظامی پیش پیش تھے۔ ان کے اس کردار کو منیر رپورٹ میں خاص طور پر سراہا گیا ہے۔ اسی طرح عبداللہ ملک جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں سرگرم عمل رہے تھے قیام پاکستان کے بعد عمر بھر اپنے قلم کے ذریعے جمہوریت اور سماجی انصاف کی خاطر جنگ لڑتے رہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد طالب علموں نے اہم ترین جنگیں امریکی سامراج اور اس کی جانب سے پاکستان پر حکمرانی کرنے والے آمروں کے خلاف لڑیں۔ اس دور میں سامراجی بالادستی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں طلبہ کا کردار بہت اہم ہے۔ اسی طرح سے طلبہ نے ان آمرانہ رجحانات کا بھرپور مقابلہ کیا جو سیاستدانوں میں ملک بنتے ہی پیدا ہونے لگے تھے۔ بعد میں انہوں نے فوجی حکمرانوں سے بھی پنجہ آزمائی کی۔ جمہوری جدوجہد کی داستان (جس کا ایک اہم حصہ صوبائی خودمختاری کے حصول کی لڑائی بھی ہے) طلبہ کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ انہی طالبہ میں سے کئی ایک بعد میں سیاسی میدان میں نامور ہوئے جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

خاص طور پر بلوچستان اور صوبہ سرحد میں درمیانہ طبقہ کی جتنی بھی قدآور شخصیتیں ابھری ہیں ان کا تعلق جمہوری اور قومیتی جدوجہد میں متحرک طلبہ تنظیموں سے تھا۔ بلوچستان میں عبدالحی بلوچ، عبدالمالک بلوچ، شکیل بلوچ، حبیب جالب بلوچ سبھی بی ایس او کی پیداوار ہیں۔ صوبہ سرحد میں لطیف آفریدی، افراسیاب خٹک، قاضی انور اور اسفند یار ولی بھی طالب علم تحریک کی بھٹی سے نکلنے والوں میں سے ہیں۔ وہ طالب علم تحریکیں جو بدیشی حکمرانوں اور سامراج کی مخالفت میں چلیں نیز وہ جن کا مقصد جمہوری آزادیوں، سماجی انصاف اور قومیتی برابری کا حصول تھا۔ سماج کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوئیں انہوں نے عوام میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کیا اور ان کے سیاسی شعور کو جلا بخشی۔ ان تحریکوں کے

نتیجہ میں یہ خطہ صدیوں کی پسماندگی سے نکل کر دور جدید میں داخل ہونے کے قابل ہوا۔ اس کے برعکس وہ طالب علم تحریکیں جن کی بنیاد مذہبی تنگ نظری اور منافرت پر رکھی گئی سماج کو تقسیم کرنے کا باعث بنیں۔ ان کی بناء پر معاشرے میں تعصب اور فرقہ واریت نے جنم لیا۔ بھارت میں بھی ایسے ہی ہوا اور پاکستان میں بھی۔

مذہبی حوالوں سے چلنے والی طالب علم تنظیمیں ایک ایسی منفی سرگرمی میں مبتلا ہیں جو معاشرہ کو تہس نہس تو کر سکتی ہے لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں کر سکتی۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت پر مبنی سرگرمیاں پاکستانی ریاست کی سالمین کے لئے خطرہ بن چکی ہیں۔ ان کے پھلنے پھولنے کی بڑی وجہ امریکی سامراج کی جانب سے ان کی سرپرستی تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے بعد یہ تنظیمیں امریکی امانت سے محروم ہو چکی ہیں۔ ان تنظیموں کے کارکن جنہیں ایک دور میں امریکی اہلکار کے مجاہدین کا نام دے کر ان کی ناز برداریاں کرتے تھے اب ان کی نظر میں دہشت گرد متصور ہوتے ہیں۔

مذہبی حوالوں سے چلنے والی تنظیموں کا سیاسی و ثقافتی ایجنڈہ ناقابل عمل ہے۔ جمہوریت کی مخالفت اور اس کے متبادل کے طور پر نظام خلافت یا صالحین کی حکومت کا قیام ملک کی اکثریت کے لئے پہلے بھی قابل قبول نہ تھا۔ اب تعلیم کے فروغ اور جدید میڈیا کے اثرات کے نتیجے میں یہ مزید غیر مقبول ہو گیا ہے۔ ان کی مغربی ثقافت کے خلاف لڑائی جسے یہ فحاشی کے خلاف تحریک کا نام دیتے تھے۔ آخری دموں پر ہے۔ ٹیلی ویژن اور وی سی آر توڑنے، ویڈیو کی دکانوں پر چھاپے مارنے، سینما گھروں کے پوسٹر پھاڑنے کی کاروائیاں عام آدمی کو بھی مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔ اسی طرح سے تعلیمی اداروں میں موسیقی کے پروگراموں کی مخالفت کرنے اور مخلوط تقریبوں پر پابندی لگانے کے کام کی تکمیل ہو ضیاء الحق کی سرپرستی کی وجہ سے ممکن تھی اب مشکل ہو گئی ہے۔ دائیں بازو کی طالب علم تنظیموں کا تاریخ کے پہیے کو پیچھے کھینچنے کا ایجنڈہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید ناقابل عمل بنتا چلا جائے گا اور یہ طالب علم کمیونیٹی میں قطعاً بے اثر ہو جائیں گی۔

جمہود کی قوتوں کے برعکس ان لوگوں کے لئے اب حالات زیادہ سازگار ہیں جو سماجی ارتقاء میں یقین رکھتے ہیں۔ انہی کی جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک سارے کرہ ارض پر نو آبادیاتی نظام ختم ہو گیا تھا۔ تاہم انسان کے ہاتھوں انسان کی غلامی کی باقیات ابھی موجود ہیں۔ عورتیں، اقلیتوں اور مظلوم قومیتوں سے نابرابری کا سلوک بچوں سے مشقت لینے کا عمل اور بانڈڈ لیبر اس کی چند مثالیں ہیں۔ سرمایہ داری نظام مزدور طبقے کو کچھ مراعات دینے پر مجبور ہوا ہے لیکن بندہ مزدور کے اوقات ابھی بہت تلخ ہیں۔ تیسری دنیا کے کئی ملکوں میں جاگیرداری نظام کی باقیات بھی تاحال ختم نہیں کی جا سکیں۔ کئی ملک ابھی جمہوری نظام سے نا آشنا ہیں۔

جدید آبادیاتی نظام بھی ہنوز باقی ہے اور امریکہ ایک سپر پاور کی شکل میں تمام دنیا پر بالادستی قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اقوام عالم میں بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک میں، امریکہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہو رہا ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی پالیسیوں سے بھی یہ تنگ ہیں۔ تاہم ابھی تیسری دنیا کے ممالک کے اپنے اختلافات اس اتحاد کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جو امریکی بالادستی کو چیلنج کرنے کے لئے ضروری ہے۔

یہ ہیں وہ مسائل جن سے مستقبل میں انسانی معاشرے نے نبرد آزما ہونا ہے اور جن کے حل پر انسانی سماج کی ترقی کا انحصار ہے۔ انہی کے حوالے سے آگے چل کر طالب علم تحریکیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان مسائل کا علاج مذہبی تنظیموں کے پاس نہیں ہے اور جیسا کہ ہر گزرنے والا دن ثابت کر رہا ہے۔ ان لبرل مفکرین کے پاس بھی نہیں ہے جو فری مارکیٹ اکانومی کے علمبردار ہیں۔ یہ صورتحال ان لوگوں کے لئے ایک چیلنج ہے جو انسان کی ہر طرح کی غلامی کے مخالف ہیں اور صرف ایک مخصوص طبقہ کو فائدہ پہنچانے والی جمہوریت ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر عوامی جمہوریت کے قیام کے خواہاں ہیں۔

حوالہ جات

باب 1

1- مرزا نور الہدٰی (ترتیب و تکمیل) ''مولوی تمیز الدین خان بمقابلہ وفاق پاکستان: سیاسی سوانح عمری'' (فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز' لاہور 1992) 54

2- نور الہدیٰ' 56

3- Chand, Tara, History of the Freedom Movement in India. Vol. iii, (Book Traders, Lahore, n.d.) Reprint, 352-53

4- Chand, Tara, 352-53.

5. Mukherji, Ramakrishna, in Imperialism and Revolution in South Asia, edit, Kathleen Gough and Hari P. Sharma (People's Publishing House, Lahore, 1973), 402.

6. Sufia Ahmad, Muslim Community in Bengal 1884-1912 UNI (University Press Ltd., Dhaka, 1996), 79-80.

7. Chander, Probodh, Student Movement in India (All India Students Federation Publications Department, Lahore, 1936).

8. Rai, Satya M., Punjabi Heroic Tradition, (Punjabi University, Patiala 1971).

9- ظفر حسن ایبک' ''آپ بیتی'' لاہور 1964-

10. Chander, Prabodh, op.cit.

11. Punjab Disturbances 1919-20, Indian Perspective, Vol.I, Report of Commission appointed by the Punjab Subcommittee of the Indian National Congress to look into the Jallianwalla Massacre) Reprint, New Delhi, 1976.

12- اجیت جاوید، پنجاب میں بائیں بازو کی سیاست (اردو ترجمہ-فکشن ہاؤس، لاہور،1998) 90-91-

13- Chander, op.cit.

14- چودھری فضل حق، میرا افسانہ (الفیصل، لاہور،1993) 145-46-

15- Chander

16- Chander

17- علی محمد راشدی، اھی ڈینھن اھی شینھن - سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد،1981)' جلد سوم206-209-

18- راشدی، جلد دوم405-408-

19- Prabodh Chander, Student Movement in India (All India Students Federation Publications Department, Lahore, 1938).

20- Altbach, Philip G. Student Political Activism: An International Handbook (Greenwood N.Y. 1989), 91-93

21- Chakravarty, Nikhil, "Communists and Quit India Struggle", Mainstream, August 7, 1999.

22- Alltbach, 91-93.

23- Altbach, 91-93

24- Mirza, Sarfraz Hussain, Muslim Students and Pakistan Movement 1937-47, Pakistan Study Centre, University of Punjab, Lahore (1988), v-vii

25- Mirza, op.cit.

26- Mirza, op.cit. lxxxv-vi

27- Mirza, 32-33.

28- Mirza, 32-33.

29- کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار،395-99

30- Mirza Sarfraz Hussain, The Punjab Muslim Students Federation, (Research Society of Pakistan, Lahore, 1978).

31- عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، اقبال اکادمی، لاہور292

32- عاشق حسین بٹالوی، چند یادیں چند تاثرات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور19

33- Mirza, The Punjab Muslim Students Federation, lviii-lix.

34- Ikramullah, Begum Shaista, From Purdah to Parliament. 92-96.

باب 2

تفصیلات کے لیے دیکھیں:

1- Mirza, Muslim Students and Pakistan Movement, i-xxv.

2- Zaheer, Hasan, The Separation of East Pakistan (Oxford University Press, 1994), 17.

3- Ahmad, Moudud, Bangladesh: Constitutional Quest for Autonomy 1950-71, (University Press Ltd., Dhaka, 1976), 20.

4- Salamat, Zarina, Pakistan 1947-58, A Historical Review (National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1992), 73.

5- Zaheer, Hasan, op.cit., 22.

6- Ahmad, Moudud, op.cit., 26-27.

7- Chowdhury, Hamid-ul-Haque, Memoirs (Associated Printers Ltd., Dhaka, 1989), 180.

8- Salamat, Zarina, op.cit., 74.

باب3

1- چودھری، پاکستان کی سیاسی تاریخ، جلد6، سندھ: مسئلہ خودمختاری کا آغاز (ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور،1994)222-23

2- ایضاً،225

3- اگیف، وی-ایف-سندھ تاریخ کے آئینے میں 1918تا1985(ترجمہ) (ناؤکا، دانیال، کراچی،1989) 145-6

4- زاہد چودھری223

5- زاہد چودھری291

6- اگیف،207

7- اگیف،210-11

8- عابدی، سید معصوم،''پاکستان کی سیاست میں طلبہ کا کردار- ایک تحقیقی جائزہ'' (پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے سیاسیات بعد از آنرز کی جزوی تکمیل کے طور پر پیش کیا گیا تحقیقی تھیسس، مارچ1977) غیر مطبوعہ

9- عابدی

10- عابدی

باب4

1- ڈاکٹر ایوب مرزا کا انٹرویو، عابدی، معصوم، ''پاکستان کی سیاست میں طلبہ کا کردار''
2- ایضاً

باب5

1- عابدی

2- Md Abdul Wadud Bhuiyan, Emergence of Bangladesh and the Role of Awami League (Vikas Publishing House, N. Delhi, 1982) 63

3- عابدی، تھیسس،122-23

4- Pakistan Times, Nov. 5, 1963.

5- Pakistan Times, Nov. 8, 1963.

6- Pakistan Times, Nov. 7, 1963.

7- Lawrence Ziring, The Ayub Khan Era, (Syracuse University Press 1977)

8- Altaf Gauhar, Ayub Khan: Pakistan's First Military Ruler, (Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1993), 396-97.

9 - نوائے وقت، یکم دسمبر1968

10- ایضاً

11- ایضاً

12- نوائے وقت، 9جنوری1969

13- نوائے وقت، یکم دسمبر1968

14- ایضاً

15- نوائے وقت، 9دسمبر1968

16- Bhuiyan, Emergence of Bangladesh

17- Bhuiyan, op.cit., 114.

18- Rafique Afzal, Political Parties in Pakistan, 1958-69 (National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1987)

19- Ahmad, Moudud, Bangladesh: Constitutional Quest for Autonomy 1950-71 (University Press Ltd., Dhaka, 1976), 126-27.

20- Hasan Zaheer, The Separation of East Pakistan (University Press Ltd., Dacca, 1994), 101.

21- نوائے وقت، 9,17 جنوری 1969

22- نوائے وقت، یکم دسمبر 1968

23- نوائے وقت، 19 دسمبر 1968

باب 6

1- Hasan Zaheer, 126

2- Hasan Zaheer, op.cit.

3- نوائے وقت، 21 دسمبر 1970

4- نوائے وقت، 19 دسمبر 1970

5- Imam, Jahanara, of Blood and Fire. (Academic Publsihers Dhaka, 1990).

6- Imam, 13

7- Hasan Zaheer, 167

8- سلیم منصور خالد، طلبہ تحریکیں، جلد اول (البدر پبلی کیشنز، لاہور) 25-324

9- ایضاً، 343

10- اجمل کمال (مرتب)، کراچی کی کہانی، جلد اول (آج کی کتابیں، کراچی، 1995) دیکھیے، ڈاکٹر فیروز احمد کا مضمون ''افریقہ پاکستان کے ساحلوں پر''، 187-

11- مصنف کا ڈاکٹر عبدالحی بلوچ سے انٹرویو۔

12- Harrison, Selig S., In Afghanistan's Shadow, (Carnegie Endowment for International Peace, NY and Washington) 83-84.

13- نوائے وقت 5 فروری 1970

14- نوائے وقت 25 مارچ 1970

15- نوائے وقت 5 جنوری 1970

16- نوائے وقت دیکھیے، 20-14 جنوری 1970 کے شمارے

17- نوائے وقت 7اپریل1970

18- نوائے وقت 5مارچ1970

19- نوائے وقت 31جولائی1970

باب 7

1- Dawn, Karachi, 13 May, 1972

2- Harrison, Selig S. In Afghanistan's Shadow, 86

3- Harrison, 84

4- عبدالولی خان، سپریم کورٹ آف پاکستان میں تحریری بیان، (شاہین برقی پریس، پشاور،(1975)' 72-73

5- نوائے وقت، 30 اپریل 1973

6- نوائے وقت، 29 اپریل 1973

7- Dawn, Karachi, 9 April, 1974

8- سلیم منصور خالد، طلبہ تحریکیں جلد دوم' 192

9- سلیم منصور خالد، جلد دوم، 173

10- نوائے وقت یکم جون 1977

11- نوائے وقت 17 اپریل 1977

باب8

1- سلیم منصور خالد، طلبہ تحریکیں جلد دوم282-83

2- ایضاً،382

3- ایضاً،382

4- Herald, Karachi, Oct. 1988.

5- Dawn, Karachi, 16 March 1986

6- روزنامہ جسارت، 9فروری1987

7- Herald, Karachi, Oct. 1988

8- روزنامہ جسارت، 7جنوری1987

9- نوائے وقت، 12مارچ1986

10- روزنامہ خبریں، 12اپریل1996

11- Rehman Sobhan, Bangladesh: Problems of Governance, 273-75.

12- Dawn Karachi, 5 July 1992

13- روزنامہ پاکستان، 2فروری1993

باب9

1- مرتب سید متقین الرحمان و سلیم منصور خالد، جب وہ ناظم اعلیٰ تھے، حصہ اول (ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور1999)20

2- ایضاً

3- ایضاً،43-44

4- ایضاً‘97

5- ایضاً،167

6- ایضاً،176

7- سید ابوالاعلی مودودی، دورِنو کا چیلنج اور نوجوان ، (ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، 1998)10

8- ایضاً،11-12

9- ایضاً،14

10- سید متقین الرحمان و سلیم منصور خالد، جب وہ ناظم اعلیٰ تھے (ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور1989)106

11- ایضاً،108

12- نوائے وقت، 3نومبر1998

13- ایضاً

14- جنگ23اکتوبر1994

15- جنگ10جولائی1994

16– Afzal, Rafique, Political Parties in Pakistan, v.2, 79-80.

17- نیرّ صدیقی کا مضمون ”طلبہ کے مقدس جذبوں کی امین : انجمن طلباء اسلام“،

نوائے وقت 31 اکتوبر 1998

18- Ahmad, Mujeeb, Jamiyyat Ulama-i-Pakistan 1948-79 (National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad 1993), 220-22.

19- Ahmad, Mujeeb, op.cit., 220-22.

اشاریہ